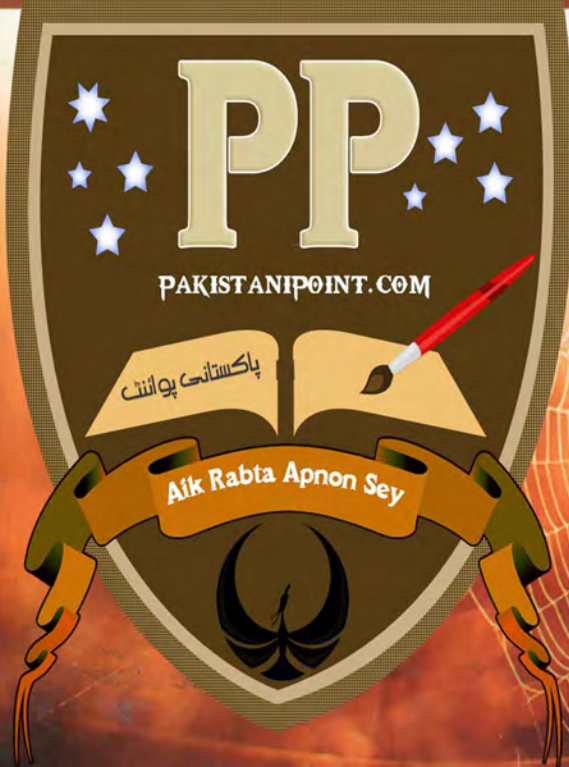


تارِ عنکبوت

مصباح نو شین



تاری عنکبوت

مصباح نوشین

علم و عرفان پبلشرز

40- محمد مارکیٹ، اردو بازار لاہور

فون: 042-37352332-37232336

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب	تاریخ نکبت
مصنفہ	مصباح نوشین
ناشر	علم و عرفان پبلشرز
مطبع	زاہدہ نوید پرنٹرز لاہور
کمپوزنگ	دلدار حسین
قیمت	400/- روپے
اشاعت اول	اگست 2016ء

..... ملنے کے پتے

علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40- اردو بازار، لاہور

اشرف بک ایجنسی	کتاب گھر
اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی	اقبال روڈ، کمیٹی چوک، راولپنڈی
خزینہ علم و ادب	ویکم بک پورٹ
الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور	اردو بازار، کراچی
بیکن بکس	رشید نیوز ایجنسی
گلگشت کالونی، ملتان	اخبار مارکیٹ، اردو بازار، کراچی
کشمیر بک ڈپو	فرید پبلشرز
تلہ گنگ روڈ، چکوال	اردو بازار، کراچی

ادارہ کا مقصد ایسی کتب کی اشاعت کرنا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہوں۔ اس ادارے کے تحت جو کتب شائع ہوں گی اس کا مقصد کسی کی دل آزاری یا کسی کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ اشاعتی دنیا میں ایک نئی جدت پیدا کرنا ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متفق ہوں۔ اللہ کے فضل و کرم، انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کمپوزنگ مطاعت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری احتیاط کی گئی ہے۔ بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی یا صفحات درست نہ ہوں تو از راہ کرم مطلع فرمادیں۔ انشاء اللہ اگلے ایڈیشن میں ازالہ کیا جائیگا۔ (ناشر)

انتساب!

اس مہربان ذات کے نام
جو سب پر مہربان ہے!

کہنی سننی

الحمد للہ کامیابی کی طرف بڑھتا ہوا ایک اور قدم میری نئی کتاب ”میرے بے خبر میرے بے نشان“ ادارہ علم و عرفان پبلشرز کی محنت و جانفشانی کا منہ بولتا ثبوت آپ سب محبت کرنے والوں کے ہاتھوں میں ہے۔
اس کتاب کی خاص بات یہ ہے کہ اس کا طرز تحریر میرے گزشتہ اسلوب سے ہٹ کر ہے۔ جو میری تحریر کا خاصا ہے۔

تاریکوبوت ایک خواہشات کے حال میں جکڑی عورت کی کہانی ہے جس نے دنیا کی رنگینی کی خاطر اپنی جنت اپنے ہاتھوں خراب کر دی اور اسی تفریح اور لہنی مذاق میں بے خرسا فعل کیسے ایک عورت کی زندگی تباہ و برباد کر سکتا ہے اس ناول میں بہت اچھے سے واضح بیان کیا گیا ہے ”میرے بے خبر میرے بے نشان“ حشمت زیدی کی کہانی ایک ایسے رائٹر کی کہانی جس کی شخصیت کا کھلا تضاد کسی معصوم کی زندگی تباہ کر گیا۔ جو اتنی تحریروں میں اچھائی محبت و اخلاص کا سبق دینے کے ساتھ اپنی ذات سے محبت و عشق کا جھانسا بھی دیا کرتا اور کیا کمال دیا کرتا کہ ایک عالم اس کی محبت میں گرفتار اپنی رگیں کاٹنے پر مجبور ہو گیا۔

حشمت زیدی میرے مختصر ادبی سفر کا ایسا کردار جو میری پہچان بن گیا پاک ٹی ہاؤس کا مجھ پہ طاری وہ سحر جو حشمت زیدی کو تخلیق کرنے کا سبب بنا۔

مجھے خوشی ہے کہ میں حشمت زیدی جیسا کردار تخلیق کر پائی اللہ کے فضل و کرم سے دوستوں کی دعاؤں سے میں کامیابی کی جانب اپنے قدم بڑھا رہی ہوں۔

ادارہ علم و عرفان کا بھی شکریہ جو محنت و خلوص سے میری کتابیں شائع کر کے مجھے معتبر کرتا ہے..... ان صفحات کے ذریعے میں ان تمام دوست احباب کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی جن کی بے لوث محبت اور خلوص کی وجہ سے میں نہ صرف زندہ ہوں بلکہ محنت و لگن سے اپنی منزل کی طرف گامزن بھی ہوں۔
آپ سب کی تحسین آراء کی منتظر۔

مصباح نوشین

Alisummer747@gmail.com

تاریخِ عکبوت

وہ بوسیدہ زدہ لباس میں ملبوس گندگی کے ڈھیر سے اپنے بیٹ کے دوزخ کو بھانے کے لیے کچھ تلاش کر رہی تھی..... اس کے ہاتھ کبھی خوبصورت رہے ہوں گے مگر اب صرف استخوانی (وہ ہاتھ جس پر گوشت نہ ہو اور دیکھنے میں ہڈیوں کا ڈھانچہ دکھتا ہو) ہاتھ ہی دکھتے تھے جن کی اوپری جلی ہوئی جلد بے حد باریک اور کالی تھی جیسے جلی ہوئی ہو اور وہ دیکھنے پر بے حد کریمہ اور کوڑھ زدہ نظر آتے تھے۔ گرد سے اٹے بالوں کو کبھی مصابین اور مہمپو نصیب ہوا تھا نہ ہی کنگھی..... وہ کچھ بستی کی طرف بنا گندگی کا ایک بڑا سا پہاڑ تھا میونسپل کمیٹی والے سارے شہر کا کوڑا کرکٹ وہاں پھینکا کرتے تھے۔ اور وہ فاقوں مرتی یہاں گندگی کے ڈھیر کو کھنگال کر اپنے لیے کھانا ڈھونڈا کرتی تھی۔ کبھی کبھار کچھ اچھا کھانا بھی مل جایا کرتا تھا جیسے بچی کچھ روٹی کے ٹکڑے تھوڑے خراب ٹماٹر، سبزی اور باقی ٹنن باکس سے نکال کر پھینکے گئے سینڈ وچز..... یا کچھ بھی؟ بے دردی سے رزق کی بے عزتی کرنے والوں کو کبھی بھی معلوم نہیں ہوسکا تھا کہ ان کے پھینکے گئے باقی کھانوں کو کوئی من و سلوئی کی مانند کھا کر خوش ہوتا ہے۔ کسی نے سوچا تھا نہ ہی کبھی دیکھا تھا وہ دیکھ سکتے بھی نہیں تھے کیونکہ اس کی عزت نفس باقی سارے جذبات و احساسات کے مرجانے کے باوجود بھی زندہ تھی..... وہ افشین حیدر تھی جو قسمت کے پیڑھے کھاتی گندگی کے ڈھیر سے جینے کا جواز ڈھونڈا کرتی تھی..... یہ وہ افشین حیدر تھی جو رات کا سالن صبح ناشتے میں نہیں کھایا کرتی تھی اسے وہ سالن باسی لگتا تھا اور اب..... گلی کے بچوں نے اسے دیکھتے ہی چیخا چلانا شروع کر دیا تھا کئی ایک تو ہاتھوں میں پتھر اٹھا کے اس کے پیچھے مارنے کو لپکے تھے وہ بے دم ہوتی سانسوں کو سنبھالتی ہاتھوں میں تھامی جلی ہوئی روٹی اور تھیلی میں ڈالا سالن لے کر بمشکل تمام بھاگ رہی تھی کتنے دنوں کے بعد اچھا کھانا نصیب ہونے والا تھا اور یہ گلی کے آوارہ بچے..... اس نے کوفت و کدھر سے سوچا..... اور کیا کبھی اس نے سوچا تھا کہ اس کروفر وطنطنے نے اسے کس حال میں پہنچایا تھا..... وہ بھاگ رہی تھی آج پھر گلی کے بچوں کی اس پر نظر پڑ گئی تھی بھاگتے بھاگتے اس کے پیروں میں کوئی نوکیلا پتھر لگا تھا بھل بھل بہتا خون اور درد کا اتھاہ احساس اسے رکنے پر مجبور کر گیا تھیلی والا سالن اور روٹی ہاتھ سے چھوٹ کر مٹی میں جا گری اس نے ڈبڈمائی آنکھوں سے مٹی میں ملے سالن اور روٹی کی باقیات کو دیکھا کھانا نہ کھا سکنے کا دکھ بہر حال پیر میں چھپے پتھر کے درد سے زیادہ تھا وہ تین دن کی بھوکی تھی اور باوجود کوشش کے بھی بستی کے ایک ایک گھر کا دروازہ کھٹکھٹا کے

بھیک مانگنے کے باوجود بھی اسے کسی نے بھیک نہیں دی تھی اور اب..... بھوک کا احساس اور اس کی شدت درد پر غالب آ گئی اس نے مٹی میں بھنھوڑی روٹی اٹھائی اور تھیلی میں بچا تھوڑا بہت شوربہ اٹھا کر پہلاناوالہ توڑ کر منہ میں رکھا اور آنکھیں موند لیں پیٹ کا دوزخ بجھنے لگا۔

اس کے اندر بہت آہستہ آہستہ سکون اترنے لگا۔

”سکون“ اس نے پٹ سے آنکھیں کھول کر سوچا کیا اس کی زندگی میں کبھی سکون رہا تھا پہلی بار پانی کا قطرہ اس کی آنکھ سے آنسو بن کر گر ا تھا اس نے یاد کرنے کی کوشش کی..... کہانی کہاں سے شروع ہوئی ہے اس نے ذہن پر زور ڈال کر سوچا تھا!

☆.....☆.....☆

”افقی“ غمار آلود گھمبیر لہجہ اس کے آس پاس مہکا اس نے غور سے اکڑی گردن مزید اکڑا کر بڑے کروفر سے دیکھا ظاہر ہے وہ شمع تھی اور پروانے اس پر مرتے تھے اور وہ پروانوں کو جلا کر مارنے کی از حد رسیا اور۔ اور۔ اور رضا حسن تو اس کے پیچھے دیوانہ تھا اتنا دیوانہ کہ اسے پا کر ہی دم لیا تھا شادی کے پانچ سال گزرنے کے بعد بھی وہ اس کے لیے اتنی ہی وارننگ رکھتا تھا جتنی شادی کے اولین دنوں میں..... مغرور تو وہ پہلے ہی تھی رضا حسن کی جنوبی محبت کے بعد تو بالکل ہی ہواؤں میں بسیرا کیے رکھتی زمینی مخلوق اسے اچانک پاؤں کے نیچے آ جانے والے بے ضرر کیڑے کوڑوں کے برابر محسوس ہوتیں۔

افقی میری جان پلیز میری طرف دیکھو! ہمیشہ کی طرح رضا حسن کے انداز میں بے پناہ مباحث تھی میں نہیں دیکھ رہی آپ کی طرف..... اب آپ کا محبت نامہ شروع ہو جائے گا اور اس وقت بول ہی نہیں پائے کچھ“ وہ ہنوز رخ موڑے بیٹھی رہی البتہ شکوؤں کی پٹاری کا منہ کھول دیا اب کم از کم اگلا ایک آدھ گھنٹہ اس پٹاری سے شکوے برآمد ہوتے رہنے تھے اتنین حیدر کی شکوؤں کی پٹاری مقام حیرت ہمیشہ ہی لبالب بھری ہوا کرتی تھی۔

”افقی میں مانتا ہوں امی جان کچھ زیادہ ہی تلخ ہو گئیں تمہارے ساتھ مگر تم خود سوچو وہ بڑی ہیں ہم سے ان کا تجربہ زیادہ ہے اور پھر وہ کچھ غلط بھی نہیں کہہ رہی تھیں تم گھر کی حالت خود دیکھو تم گھر پر توجہ بالکل بھی نہیں دے رہی ہو۔“

”تو آپ کا کہنے کا مطلب ہے میں صرف خود پر توجہ دیتی ہوں سارا دن۔“ گھر اور بچوں کی کبھی ذمہ داری پوری نہیں کی.....“ اچانک رخ اس کی طرف موڑتے وہ غصے سے پھرتے بات کو بڑھاوا دینے کی پوری تیاری میں تھی اس کی فطرت میں اپنی غلطی کا اعتراف کرنا کہیں نہیں تھا۔

افقی..... میں نے یہ کب کہا؟ رضا حسن بے دم ہوا۔

تو پھر کہنے کا مطلب تو وہی تھا نا..... کوئی قیامت آ گئی اگر ایک دن میں گھر صاف کر کے وقت یہ بچوں کو صاف ستر نہیں کر سکی تو..... اور پھر مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ کی والدہ ماجدہ تشریف لا رہی ہیں پہلے جب جب وہ ہمارے ہاں آتی ہیں سچ بتائیے کیا میں ان کے آگے پیچھے نہیں پھرتی انہیں اچھا کھانا نہیں کھلاتی..... جو وہ آج مجھے اتنی باتیں سنا کے چلی گئیں۔“ رضا حسن کا سر جھک گیا۔

وہ صرف مجھے ذلیل کرنے کے بہانے تلاش کرتی ہیں کیونکہ انہوں نے مجھے کبھی قبول ہی نہیں کیا؟
سوں سوں کرتے اپنی سرخ ہوتی ناک کو پونچھتے وہ ترخی تھی۔

اور مجھے ایسا لگتا ہے جیسے آپ نے بھی مجھے ذلیل کروانے کے لیے ہی مجھ سے شادی کی ہے۔

اس نے رضا حسن پر سر اسرار لگایا رضا حسن کی جنونی محبت تڑپ کر رہ گئی۔

میں نے تم سے محبت کی تھی اسی لیے تمہیں سارا خاندان چھوڑ کے بھی اپنایا تھا، وہ رویا نسا ہوا۔

تو نہ کرتے ناں..... کسی نے آپ کے پاؤں تو نہیں پکڑے تھے یا میں خود آئی تھی چل کے..... اس کا لہجہ مزید تیز اور تلخ ہوا جو اکثر ہی ہوتا تھا سچی بات تو یہ تھی کہ انہیں حیدر کو گھر اور بچوں کی ذات میں دلچسپی لینے کا کوئی شوق نہیں تھا وہ گھر کے معمول کے کام مارے باندھے پنپایا کرتی تھی بچے ابھی چھوٹے تھے مگر اتنے بھی نہیں بڑا بیٹا چار سال کا تھا اور چھوٹا ڈھائی سال کا..... کھانا موڈ ہوتا تو پکالیتی ورنہ سارا دن بیڈ پر لیٹی موبائل فون پر لگی رہتی رضا حسن نے اسے کبھی کچھ نہیں کہا تھا کیونکہ اپنی بے پناہ محبت میں رہتے انہیں کی ذات کی خامیاں شاید نظر ہی نہیں آیا کرتی تھیں اس نے کھانا بنا دیا تو ٹھیک ورنہ وہ ہوٹل سے لے آیا کرتا انہیں تو ویسے بھی بہت شوقین تھی مرغی کھانوں کی اور وہ انہیں کی خوشی میں خوش تھا مگر رضا حسن اس کی محبت میں اندھا تھا ساری دنیا نہیں طاہرہ بیگم ماں تھیں رضا حسن کی اس کی خوشی اور سکون کے لیے انہیں کے لیے راضی تو ہو گئی تھی مگر وہ انہیں کے بھوڑ پین سے سخت نالاں رہا کرتی تھیں آج بھی وہ بازار سے لوٹیں تو اچانک ہی واپسی پر ان کے گھر چکر لگانے کا سوچ بیٹھیں..... انہیں کیا خبر تھی کہ گھنٹہ بھر تو بہو بیگم دروازہ ہی نہیں کھولیں گی وہ دل کی مرینہ تھیں اتنی سڑھیاں چڑھ کر اوپر ان کے فلیٹ تک آئی تھیں بے دم ہوتی سانسوں سمیت وہ بمشکل دروازے کو پکڑے کھڑی تھیں۔ بار بار تیل بجانے کے بعد انہیں نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا تھا۔

طاہرہ بیگم اسے لاش لاش کرتے چہرے کے ساتھ دیکھ کے چونکیں خوبصورت تو وہ تھی مگر اب تو دن بدن بے حد حسین ہونے جا رہی تھی..... ابھی وہ جی بھر کے متاثر بھی نہ ہو پائی تھی کہ

”آئیے۔“ اس نے بے زاری آواز میں اندر آنے کی پیش کش بالکل ایسے ہی انداز میں گویا ہوئی کہ آنا ہے تو آؤ ورنہ میں دروازہ بند کر کے رہی ہوں..... وہ ہانپتی کھڑی تھیں فوراً اندر ہو لیں مگر اندر کا منظر دیکھ کر ان کا پارہ چڑھنے میں ایک منٹ کی تاخیر ہوئی تھی بس.....!

”آج کہیں گئی ہوئی تھیں کیا؟“ لاؤنج کے وسط میں کھڑے ہو کے پورے گھر کا طائرانہ جائزہ لیتے ان کی آواز دلچہ خود بخود ہی سرد ہو گیا تھا اپنی اپنی دھن میں تھی سوان کے موڈ کا اندازہ نہیں کر پائی ورنہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا ہی لیتی..... سو فی الفور نفی میں سر ہلا گئی۔

”اور طبیعت تمہاری خراب نہیں لگ رہی؟ اس کے نفی میں سر ہلانے پر انہوں نے کس کر جیسے اپنا غصہ دبانے کی کوشش کی تھی انہوں نے اسے سر سے پیر تک گھورا۔

تو پھر گھراتا گندا کیوں ہو رہا ہے ایسا لگتا ہے ہفتہ بھر سے جھاڑ پونچھ کی گئی ہے نہ ہی جھاڑو پونچا..... کیا کرتی

رہتی ہو سارا دن گھر میں؟“ ان کے سر دھلیکے لہجہ میں کیے استفسار نے بغیر کسی وقت کے افقی کے تن من میں بھانپھڑ کاٹے تھے وہ پوری جان سے جلی تھی۔

”اصل میں آج ذرا سر میں درد تھا تو صفائی نہیں کر سکی۔“ اس نے بہانہ گھڑتے بمشکل تمام لہجے کو ہموار رکھا۔

”اچھا“ ان کے لہجے میں استہزاء افقی کو اپنی واضح چھب دکھلا گیا، ”ٹی وی کا اونچا والیوم تو پوری بلڈنگ والے سن

سکتے ہیں۔

امی جان..... آپ کھڑی کیوں ہیں پلیز بیٹھے نا..... افقی نے بات بدلنے کی کوشش کی طاہرہ بیگم نے اسے یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں کہ کیا کوئی ڈھنگ کی جگہ صاف ہے جہاں بیٹھوں ویسے بھی وہ تو بے حد صفائی پسند خاتون تھیں افقی نے ان کے نظروں کے مفہوم کو سمجھتے ہی آگے بڑھ کے صوفے پر پڑا گیلا تولیہ اور میلی بنیان اٹھائی..... رضا کو ویسے بھی عادت تھی پھیلاوا ڈالنے کی..... آگے دونوں بچے بھی پورے باپ پر پڑے تھے۔ کشن درست کرتے اس نے طاہرہ بیگم کے بیٹھنے کی جگہ بنائی اور اندر جا کے فوراً ٹی وی بند کیا..... پھر کچن میں جا کے ان کے لیے کولڈ ڈرنک نکال کر لائی تو احساس ہوا کہ کچن کی حالت بھی کم و بیش لاؤنج جیسی ہی تھی سلیب پر گر اسالین اور خشک آٹے کے ذرات حد درجہ بدنما نظر آ رہے تھے۔ افقی نے دانستہ نگاہ چرا کے طاہرہ بیگم کی طرف رخ کیا..... جو ناگواری سے صوفے پر یوں ایسا دھکیلی گویا صوفے میں نوکیلی کیلیں رہوں اور ان کے وجود کو چھ رہی ہوں۔

”دوپہر میں کیا بناری ہو؟“ انہوں نے خالی گلاس میز پر رکھتے افقی کی جانب دیکھا۔

”رات کا سالن رکھا ہے۔ رضا شام کو سبزی گوشت لے آئیں گے تو تازہ سالن بنالوں گی..... آپ کو جو بھی

کھانا ہے بنا دیں میں منگوا لیتی ہوں؟ افقی نے سعادت مندی کا مظاہرہ کیا جو طاہرہ بیگم کے دل پہ ہرگز بھی نہیں پڑا۔

”میں دہی کھالوں گی رات کا سالن..... میرے لیے اہتمام کرنے کی کوئی ضرورت نہیں یوں کرو اب

میرے اور اپنے لیے چائے بنا دو اور تم خود ساتھ کوئی پین کمر لے لو..... پھر اس کے بعد یہ پھیلاوا اسمیٹو..... بلکہ مل کے

کرتے ہیں مجھ سے تو یہاں بیٹھا ہی نہیں جا رہا۔“ انہوں نے ناگواری سے ناک سیکڑتے جیسے افقی کو جتلیا یا اسے بے پناہ

ہنک کا احساس ہوا دل تو چاہا دو چار کھری کھری سنا دے بڑی کو۔ مگر ایک تو وہ اس کے گھر آئی مہمان تھیں دوسرے رضا حسن

کی پیاری والدہ..... سودل کے جذبات دل میں دبائے وہ آہستگی سے سر اثبات میں ہلا گئی۔ پھر ناچار اسے وہ سب بھی کرنا

پڑا اس نے خاموشی سے سارا کام کیا چھوٹے بیٹے کو نہلا کر صاف ستھرا کیا دوپہر کے لیے روٹی بنائی سالن گرم کر کے تقریباً

پینچنے والے انداز میں طاہرہ بیگم کے سامنے رکھا جو بے وقت کی مصیبت بن کے اس کے سر پہ سوار ہو گئیں تھیں اس کی کمر تختہ

اور مزاج کا پارہ آسمان کو چھو رہا تھا جس وقت رضا کی واپسی ہوئی تھی اور طاہرہ بیگم کے سامنے سعادت مندی کا مظاہرہ

کرنے والی آفتین حیدر کا سارا ضبط رضا حسن کو دیکھتے ہی پانی کے بلبلے کی مانند ہوا میں تحلیل ہوا تھا وہ تو جیسے پھٹ پڑی تھی

آفس میں کام کے برڈن اور کراچی شہر کی ٹریفک سے نبرد آزما ہونے کے بعد گھر آتے آتے رضا کی آنکھیں ویسے ہی بند

ہونے لگتی تھیں ان کی بلڈنگ کی لفٹ کافی دنوں سے خراب تھی سو سڑھیاں چڑھ کر تھرڈ فلور پر آنا جوئے شیر لانے کے

مترادف تھا رضا گھر میں داخل ہونے کی منتظر افقی بغیر اس کی تھکن کی پرواہ کیے شروع ہو چکی تھی۔ اور رضا حسن وہ تو سدا کا نرم دل اور افقی پر جان چھڑکنے والا تھا فوراً ہی اپنی تھکاوٹ کی پرواہ کیے بغیر اس کی دل جوئی میں لگ گیا..... جواب بیٹھی سوں سوں کر کے رو رہی تھی..... کھانا تو طاہرہ بیگم خود بنا کے گئی تھی اور صفائی ستھرائی بھی وہ اتنی کروا گئی تھیں کہ اگلے تین دن افقی ہاتھ پیر ہلائے بغیر بھی مزے کر سکتی تھی مگر اس کلفت و خجالت کا خاتمہ کیسے کرتی جو طاہرہ بیگم کے آنے پر اسے اٹھانا پڑی تھی اور بدر کی ناراضی..... اس سے آگے سوچنا ہی اتنین حیدر کے لیے محال تھا۔

☆.....☆.....☆

”بدر“ افقی کا دل چاہا رو رو کے شہراپنے آنسوؤں سے بہا دے مگر اُسے پرواہ کہاں تھی!

”بدر پلیر۔ میری مجبوری کو سمجھیں کہانا ایمر جنسی ہو گئی تھی ورنہ میری کیا مجال کہ میں آپ کی فون کال ڈسکلنٹ کرتی.....“ وہ پچھلے آدھے گھنٹے سے اسے منارہی تھی اور وہ تھا کہ مان کے ہی نہیں دے دیا تھا۔

”بدر آپ مجھے رلا رہے ہیں۔“ پہلی بار بدر کا دل کچھ نرم پڑا۔

”اور تم جو مجھے اذیت دیتی ہو اس کا کیا؟ ہمیشہ والا شکوہ دہرایا گیا مگر افقی نے شکر کیا کہ اس نے چپ کاروزہ تو توڑا۔“

آپ کو کیا لگتا ہے اپنے دل سے کرتی ہوں وہ سب..... کیا کروں مجبوری ہے میری۔ بھابھی جاب کرتی ہیں اور اپنے بچے میرے پاس چھوڑ کے جاتی ہیں پھر سارا دن گھر کا کام کاج بچوں کی ذمہ داری اور پھر روز کوئی نہ کوئی مہمان بھی آیا رہتا ہے۔ کل بھی بھابی کی امی آگئی تھیں بڑی بی نے سارا دن ناک میں دم کیے رکھا اور میرا یقین کیجئے ایک لمحے کی بھی فرصت نہیں ملی ورنہ ضرور آپ کو بتا دیتی۔

”افقی“ اس کی تفصیل کے جواب میں بدر کا خواب آگئیں لہجہ مکافقی کی سماعتیں تک مہک گئیں۔

”تم جانتی ہو تم سے بات کیے بغیر میرا سارا دن خراب گزرتا ہے۔ مگر تم نہ میری محبت کی پروا کرتی ہو نہ ہی میری اور انتظار کی سولی پر لٹکا کے مجھے تڑپا کے مزے لیتی ہو۔ خوش ہوتی ہو میری بے بسی کا تماشا دیکھ کے..... وہ شکوہ کنناں ہوا۔

”بدر“ افقی تو تڑپ ہی گئی اس کی قدرے بلند آواز میں بولنے پر ڈھائی سالہ اسود کسمسا یا افقی نے فوراً ہی اس کی پیٹھ پر تھپکی دے کے اسے دوبارہ سلا یا مبادا وہ کچی نیند سے اٹھ جائے اور بدر کا موڈ زیادہ خراب ہو.....!

”تو اور کیا سمجھوں..... تمہیں میری فکر نہیں جو تم پر دیوانہ وار شمار ہے بلکہ اپنے ظالم بھائی اور سفاک بھابھی کی ہے جو دن بھر تم سے گھر کے کام کاج کے علاوہ بچے تک پلوار ہے ہیں۔ آیا بی بی ہوئی ہو تم ان کے بچوں کی۔

یہ بچے میرے بھی کچھ لگتے ہیں بدر..... اور پھر ماں باپ کی وفات کے بعد بھیا اور بھابھی نے مجھے اگر سہارا دے رکھا ہے تو میرا بھی فرض ہے کہ ان کے کچھ کام آسکوں اور بچے تو خدا کی رحمت ہوتے ہیں.....! افقی نے بدر کی تڑپ اور محبت پر دل ہی دل میں ناز کرتے بظاہر نرم دلی اور حساسیت سے کہا تھا۔

سہارا دے رکھا ہے سے تمہاری مراد کیا ہے افقی۔ کیا تم اپنے بھائی کی سوتیلی بہن ہو۔؟ بدر نے اچانک قدرے

ترشی سے پوچھا تھا۔

میں نے ایسا تو نہیں کہا؟ افقی گڑبڑاتے بولی۔

تو پھر ایک کی ذمہ داری کو سہارا دینا ہرگز نہیں کہتے بلکہ تمہیں تحفظ دینا اور اپنے گھر کا کرنا ان پر فرض ہے نہ کہ احسان۔ اور اسی لیے تم نے اپنی بھابھی کو سر پر چڑھا لیا ہے اپنی بے تکلی منطق انہیں سنا سنا کے.....! فارگا ڈسک افقی۔ خود کو دوسروں کے سامنے فارگ انڈمٹ پیش کرو کہ آؤ اور مجھ سے فائدہ اٹھا کے میرے جذبات کو روند کر آگے بڑھ جاؤ..... دکھ ہوتا ہے مجھے تمہاری نرم دلی تمہیں کہیں کسی بڑے نقصان سے دوچار نہ کر دے افقی خود کو آئینے میں دیکھتی دلبر بائی ہے مسکرائی۔ کیا کوئی ایسا جانتا تھا جو انہیں حیدر کو نقصان پہنچاتا آپکا ساتھ اور محبت مجھے کبھی ٹوٹنے نہیں دیں گی بدر..... یہ میرا یقین ہے!“ مکارانہ مسکراہٹ چہرے پر سجائے بظاہر وہ بہت یقین سے کہہ رہی تھی دوسری جانب بدر تو ٹٹا رہی ہو گیا۔ اور میں تمہارا یہ یقین کبھی نہیں ٹوٹنے دوں گا یہ میرا وعدہ ہے افقی! بدر کے لہجے میں سچے جذبات کا الاؤ دہکنے لگا۔

مجھے آپ کے یقین پر یقین ہے بدر..... بس آپ مجھے سے ناراض مت ہوا کریں آپکی ناراضی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی میری جان پر بن آتی ہے۔

”تمہارے معاملے میں خود پر کنٹرول نہیں کر پاتا افقی۔ دل چاہتا ہے کہ تمہارے بھیا بھابھی کے گھر کو آگ لگا دوں اور تمہیں چر کر کسی ایسی جگہ لے جاؤں جہاں خود غرض اور بے حس لوگوں کا گزر ہی نہ ہو۔“

”اتنی محبت کرتے ہیں کیا مجھ سے؟ افقی نے اس کے خاموش ہوتے ہی پوچھا تھا۔ تمہاری سوچ کی حد جہاں پر ختم ہوتی ہے وہاں سے میری محبت کا آغاز ہوتا ہے! سچی محبت نے بدر کے لہجے کو گھمبیر اور دل آویز بنا دیا تھا افقی نے پرسکون انداز میں آنکھیں موند لیں۔

”تو پھر بے فکر رہیے آپکی محبت مجھے کبھی ہارنے نہیں دے گی ایک طاقت کی طرح زندگی کی خاردار راہوں کو طے کرنے میں مدد کرتی رہے گی۔ افقی کا جواب بدر کے یقین سے بھی گہرا تھا بدر نے افقی کی محبت پر مغرور ہوتے رب کا شکر ادا کیا تھا۔



رضا کے آنے سے پہلے افقی نے بچوں کو نہلا کر تیار کیا..... عبداللہ کو ہوم ورک کروایا وہ چار سال کا تھا اور ابھی چند ماہ پہلے ہی اسے انہوں نے کنڈریونیورسٹی میں داخل کروایا تھا تا کہ کچھ میزور اور ابتدائی معلومات ایڈمیشن ٹیسٹ کے لیے سیکھ سکے..... رضا کی بہت بڑی خواہش تھی کہ وہ اپنے بچوں کو شہر کے سب سے مہنگے اور اچھے سکول میں داخل کروائے اور وہ محنت بھی خوب کر رہا تھا اسودا ابھی چھوٹا تھا رضا جاتے ہوئے عبداللہ کو سکول چھوڑ دیا کرتا تھا واپس وہ اسکول وین سے آجایا کرتا تھا کبھی کبھار اسے افقی جا کے لے آتی کنڈریونیورسٹی ان کی بلڈنگ سے دس منٹ کے فاصلے پر ہی تھی۔ ویسے بھی اس کے موڈ مختصر ہوتا وہ ان ماؤں میں سے نہیں تھی جو اپنی اولاد کے لیے اپنا سکون و آرام تنہا دیتی ہیں افقی کے لیے سب سے پہلے اپنی ذات تھی اس کے بعد وہ کچھ اور دیکھنے کی قائل تھی۔ آج بدر کو شہر سے کہیں باہر جانا تھا سو افقی سے اس کی فون پر بات نہیں

ہو پائی تھی فارغ افنی کو کچھ تو کرنا ہی تھا سو خوب دل جمعی سے گھر صاف کر کے اچھا سا کھانا بنا لیا۔ بدر سے اس کی ملاقات اپنی دوست سعدیہ کے گھر پر ہوئی تھی وہ ان کے ہمسائے میں کسی کے گھر مہمان آیا تھا۔ اونچی لمبی مناسب سراپے تیکھے نقوش والی آفتین حیدر نے اسے پہلی ہی نظر میں گھائل کر دیا تھا۔ اس کی رنگت بے حد سفید تھی اور سیاہ گہرے گلے والے امیر اینڈرسون میں اس کا سفید رنگ دھبہ رہا تھا۔ کوئی بھی ذی ہوش گولڈن براؤن بالوں والی اس باربی ڈول جیسی لڑکی کو دیکھ کے اپنے ہوش کھو سکتا تھا مقابل تو پھر بدر حیات تھا جو بنا ہی جس پر مر مٹنے کے لیے تھا وہ بے اختیار آفتین کے پاس سے گزرادو چار ادھر اُدھر کی باتیں کہیں چند ایک پوچھیں اور جھٹ اپنا وز ٹینگ کارڈ بڑھا دیا۔ آفتین کو ہر وہ مرد پسند تھا جو اس کی خوبصورتی و سراپے سے متاثر ہو کے اس کی طرف بڑھے سو اس نے انکار کرنے کی ضرورت سمجھی نہ ہی کارڈ تھا منے میں تامل کا مظاہرہ..... باوجود اس کے کہ رضا حسن اس پر جان چھڑکتا تھا افنی نے اپنے حسن کے کسی بھی قدردان کو نظر انداز کرنے کی غلطی کبھی نہیں کی تھی۔ اس کی بہت سے مردوں سے خفیہ دوستیاں تھیں البتہ تعلقات نہیں تھے کہ وہ تعلقات قائم کرنے سے گھبراتی تھی..... ہاں ان مردوں سے اپنی مرضی کے مطلب نکالتی وہ نئے نمبر کے ساتھ سم تبدیل کرتے ہوئے انہیں خیر باد کہہ دیا کرتی آپ سوچ رہے ہوں گے وہ بار بار نمبر تبدیل کرنے پر رضا سے کیا کہتی ہوگی.....

رانگ نمبر بہت زیادہ آرہے ہیں اور آپ کو تو معلوم ہے ان فون نمبرز سے کال ریسیو نہیں کیا کرتی پلیز مجھے نئی سم لادیں۔ میں تو بھر پائی! اور رضا حسن ان مردوں میں شمار ہوتا تھا جو بیوی کی محبت میں اتنے اندھے ہوتے ہیں کہ اپنے سامنے بہت کچھ غلط ہوتا انہیں نظر نہیں آتا آئے بھی کیسے بہت خوبصورتی اور کمال مہارت سے ان کے اعتراض کرنے کی وجہ آفتین حیدر جیسی بیویاں داش اینڈ کلین کر دیا کرتی ہیں ویسے بھی آفتین حیدر جیسی خوبصورت اللہ کا انعام بیوی پر وہ شک کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا جو اسے اس قدر محبت، توجہ اور خدمت کرتی تھی اور والہانہ اظہار بھی رضا کو وہ ناراض کرتی نہیں تھی اور خود ناراض ہو کے لاڈ پیار محبت میں اپنا مطالبہ منوانا رضا سے اس کا بائیں ہاتھ کا کھیل تھا بلکہ ہر مرد سے مطلب نکالنا اسے بخوبی آتا تھا..... بدر آفتین حیدر کا نیا شکار تھا یا آفتین حیدر کی..... اس کا فیصلہ کرنا مشکل تھا مگر ایک بات تھی دونوں ہی اس میدان کے اور اس کے کھیل کے بڑے منجھے ہوئے اور پرانے کھلاڑی تھے افنی کو جو کہانی بدر نے سنائی تھی اس میں ایک فی صد بھی جھوٹ نہیں تھا وہ لاہور میں ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں اعلیٰ عہدے پر کام کر رہا تھا چار بہن بھائیوں میں سب سے آخری نمبر تھا اور اکیلا تھا..... بدر جھوٹ نہیں بولتا تھا کھل کے کھیلنا پسند کرتا تھا جبکہ افنی کی سنائی کہانی میں سچ کے علاوہ باقی سب کچھ تھا کہانی کو کس وقت کیا موڑ دینا ہے۔ یہ اس جیسی منجھی ہوئی کہانی کا رکو بخوبی علم تھا۔

☆.....☆.....☆

کال بیل کی آواز پر افنی نے مسکراتے ہوئے دروازہ کھولا سامنے حسب انتظار اور حسب توقع رضا حسن کھڑا تھا۔ دن بھر تھکا پڑمردہ رضا حسن خوشبوئیں بکھیرتی چاندنی وجود والی آفتینخیر رکودیکھنے ہی بشاش ہو گیا۔

گڈ ایوننگ ڈیر وائف! آگے بڑھ کے اسے گلے لگاتے اس کا انداز والہانہ تھا دونوں کا شادی کے بعد کا معمول رہا تھا صبح جاتے اور شام کو آتے ہی ایک دوسرے کے گلے لگ کر بو سے دینا..... دونوں میں سے کوئی بھی اس

عادت کو نہیں بھولتا تھا ہاں جب افقی لڑی ہوتی تب وہ پہل نہیں کیا کرتی نہ ہی رضا کی حوصلہ افزائی..... اس کی ذرا سی ناراضی پر رضا اس کے پیچھے بھاگتا۔ مناتا افقی کو بے حد اچھا لگتا وہ اکثر جان جان کے ناراض ہوتی وہ ناراض ہوتے تھک جاتی مگر رضا مناتے کبھی نہیں تھکا۔

”کیوں مجھ غریب پر بجلیاں گراتی ہو دائف! میں تو پہلے ہی تمہارے رعب حسن سے جل بھن چکا“ وہ اسے آتش گلابی رنگ کے پریڈ سوٹ میں کھلا کھلا دیکھتے ٹارہوتے بولا..... افقی ایک ادا سے اٹھلائی۔

بجلیاں گرانے کو تو بہت سے راہوں میں نظر الفت کے منتظر بڑے ہیں پر میں کیا کروں۔ کہ یہ دل (دل پر انگلی رکھ کے) آپ کے علاوہ کسی کو درخود اعتنا جاننا پسند ہی نہیں کرتا! اس ادا پر کون مرنے جائے یا خدا!..... رضائاتی کی ناٹ ڈھیلی کرتے صوفے پر گر..... افقی کا جاندار قہقہہ پورے لاؤنج میں بکھر گیا۔

کیا خیال ہے آج کھانا باہر نہ کھایا جائے.....“ رضا نے اچانک ہی پروگرام ترتیب دے ڈالا: بالکل بھی نہیں“ افقی کا قطعی لہجہ کچن سے باہر سنائی دیا۔

”ارے وہ کیوں بھی“ رضا کو افقی کے انکار پر حیرانی ہوئی وہ تو ایسے موقعوں کی تاک میں رہا کرتی تھی اس نے آج گھر پر روسٹ اور چکن پلاؤ بنایا ہے اور اتنی محنت کرنے کے بعد میں ہر گز بھی اپنی محنت ضائع نہیں کر سکتی..... باہر کھانا پھر کبھی کھلا دیجیے گا۔ پانی کا گلاس بھر کر اس کی طرف بڑھاتے اس کا لہجہ قطعی اور سخت تھا رضا کو اس کے انکار کی وجہ سمجھ میں آگئی۔

ٹھیک ہے پھر جلدی سے کھانا لگا لو۔ میں فریش ہو جاتا ہوں پھر آسکریم کھانے باہر چلیں گے۔ کچن کی طرف جاتے افقی فوراً پلٹی۔

”کیا مطلب..... آج آپ ہمیں ہر حال میں باہر کیوں لے جانا چاہتے ہیں؟“

اور آج تم کیوں ہر حال میں انکار کر کے میرا دل توڑنا چاہتی ہو؟“ وہ کمرے کی طرف جاتے جاتے پلٹا..... نگاہوں میں شوخی بھر کے اسے دیکھا افقی نے پاؤں پٹنے اور کچن میں غائب ہو گئی فریج میں بوتل رکھ کے پلٹی تو اپنے پیچھے کھڑے رضا کو دیکھ کے بالکل بھی نہیں چونکی اچھے سے جانتی تھی وہ وجہ جاننے کو پیچھے ضرور آئے گا۔

”بولو..... ڈیروائف۔! اس نے ابرو اچکائے آنکھ ماری۔ اس عامیانہ مظاہرے پر افقی کی ہنسی چھوٹ گئی۔

اتنا خرچ کرنے کی کیا ضرورت ہے رضا..... وہ پلٹ کر اس کے قریب آئی اور اس کے شرٹ کے بٹن کھولنے لگی..... ایکسکسوزمی اتنی اچھی لان کی سیل لگی ہوئی ہے..... میں سوچ رہی تھی وہاں سے کچھ شاپنگ کر آتی اس ایک اینڈ..... شرٹ کے بٹن بند کرتی جھکی نگاہیں لڑتے لب بات منوانے کا اپنا الگ انداز..... جہاں ضرورت نہ بھی ہو وہاں بھی ایسی ادائیں مقابل کو گھائل کرنے کو یہ انداز کافی تھے۔ رضا دھیمے سے مسکرایا۔

”اتنی سی بات“ اب وہ کھل کے مسکرایا افقی نے چونک کے سر اٹھایا۔

”تیار ہو جاؤ..... ابھی چلتے ہیں۔ اس کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔

”اوہو..... تھینک یو سوچ رضا۔ آپ کتنے اچھے ہیں۔“ افقی کو اندازہ تک نہیں تھا کہ وہ اتنی آسانی سے مان جائے گا مہینہ کا آخر چل رہا تھا اور ان کے گھر کا خرچ بے حد کھلا تھا بھلے رضا کی سہیلی بہت اچھی تھی مگر زیادہ کمائی پر خرچے بھی زیادہ ہوا کرتے ہیں پندرہ سے بیس ہزار کی تو صرف افقی کی ہی شاپنگ ہو جاتی اور اگر وہ جاتی اور بچوں کے لیے یا رضا کے لیے کچھ نہ لیتی تو یہ اور بھی زیادتی ہوتی اور افقی چاہے جتنی بھی خود غرض تھی اتنی بہر حال نہیں تھی۔

”مگر رضا..... بہت خرچ آجائے گا اور مہینے کا آخر.....“ افقی کو جیسے ہی اندازہ ہوا کہ ابھی کیا فرق پڑتا ہے یا..... تمہاری خوشی سے بڑھ کر تو نہیں کچھ..... اور نائم کرلوں گا ویسے بھی نیکسٹ منٹھ سے آفس میں کام کا لوڈ بہت بڑھ جائے گا میں تم لوگوں کو کہیں باہر لے جائیں پاؤں گا نہ ہی زیادہ وقت دے پاؤں گا۔ اسی لیے آج تم سب کو باہر لے کر جانا چاہتا تھا تاکہ پھر تم مجھ سے گلہ نہ کرو..... وہ اس کی چھوٹی سی ناک دباتے تفصیل بتاتے بولا..... افقی کی جگہ کوئی اور ہوتی تو یقیناً اس قدر محبت پر آبدیدہ ہو جاتی مگر افقی کندھے اچکا کر رہ گئی تھی۔



اگلے مہینے میں کراچی آ رہا ہوں۔ صرف تم سے ملنے بولو ملو گی کہ نہیں؟“ بدر کا انداز دونوک اور قدرے نروٹھا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک مرتبہ وہ پہلے بھی اپنا کام چھوڑ کر اس سے ملنے کے لیے کراچی آیا تھا مگر افقی اس سے نہیں ملی تھی اس کا اسود بیمار تھا مگر اس نے بدر کو کہانی سنارکھی تھی اس میں صرف اتنا سابدلاؤ کیا کہ اسود اس کا بھتیجا اس کے ساتھ زیادہ اٹیچ ہے اور چونکہ وہ ہاسپٹل میں ایڈمٹ ہے سو وہ اسے مل نہیں سکتی بدر اس بات پر جو بگڑا وہ ایک الگ کہانی تھی مگر اس بار وہ اور کوئی بہانہ بہر حال نہیں سننا چاہتا تھا۔

”جواب دو..... ملو گی یا نہیں ملو گی؟“ وہی خفگی بھرالہجہ افقی دھیمے سے مسکرائی۔ آپ کیا مجھے اتنا بے مروت سمجھتے ہیں کہ آپ کی محبت کا ناجائز فائدہ اٹھاؤں گی ہر بار..... بچھلی بار بھی ملنا میرے لیے ناممکن نہیں تھا اگر اسود کا مسئلہ نہ ہو جاتا تو؟“ افقی نے پچھلی غلطی کا ازالہ کرنے کی خواہش میں صفائی دی بدر اور بھی چڑ گیا۔

”دیکھو..... مجھے اس بات سے جتنی چڑ ہے تم اتنا ہی اس پر عمل پیرا رہتی ہو..... مگر ایک بات کا یقین مجھے اب ہونے لگا ہے کہ تمہاری زندگی کی ترجیحات میں میں سب سے آخری عزیز ہوں.....!“ افقی کا دل دھک سے رہ گیا اتنی کڑی سچائی سن کے! آپ کے میرے جیسے حالات نہیں ناں اسی لیے ایسا کہتے ہیں آسانی سے..... ایک بھائی بھابھی کی محتاج یتیم لڑکی جس کے پاس اتنی تعلیم بھی نہیں کہ کوئی عزت کی ڈھنگ کی نوکری کر کے اپنا بوجھ اٹھا سکے سوائے مجبور ہونے کے کرے بھی کیا..... میرے پاس سرچھپانے کو چھت نہیں ہے نہ ہی کوئی اور سہارا جس کے برتے پر میں اپنے حالات بدلنے کی کوشش کروں! سہارے تمہارے ارد گرد میں مگر تم توجہ دو تب ہی کچھ ہو گا ناں؟“ بدر کا انداز پہلے سے نرم مگر ہنوز نروٹھا سا تھا یہ ان کے درمیان ہمیشہ ہونے والی لا حاصل“ بحث تھی۔

بدر..... ہر کام کا ایک وقت متعین ہوتا ہے اور میری اپنے بھائی سے بھابھی سے ایسی بے تکلفی نہیں ہے کہ میں ان سے اپنے منہ سے وہ سب کہوں..... جو آپ کہلوانا چاہتے ہیں! وہ ہلکا سا جھنجھلائی تو پھر ٹھیک ہے سزئی رہو بس اس

برزخ میں اور پالتی رہواپنے بھائی کے بچے..... لگا دواپنی جوانی کو گرہن میری بلا سے.....“ وہ چیخا۔ افقی نے سر جھکا اور بدر کی بات پر عود کر آنے والے غصے کو اپنے اندر ہی دبایا۔

”بدر پلیز..... آپ تو میری طاقت ہیں آپ یوں طعنہ زنی کریں گے تو میں ٹوٹ کے بکھر جاؤں گی۔“ وہ رونے لگی تھی اس کی سسکیاں اریٹیں پر ابھرتے ہی دوسری جانب بدر کو اپنے تلخ لہجے کا احساس دلا گئی تھیں۔

افقی..... میری جان..... آخر تم سمجھتی کیوں نہیں ہوتی تمہاری حالت مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ جان۔ کب تک تم یوں اپنی خواہشات کا رونا روتی رہو گی۔ افقی نے بدر کا موڈ ترنت بدلتے ہوئے جھوٹ موٹ آنسو صاف کئے اور نادیدہ سسکی کا گلا کھونٹا۔

”میری کچھ مجبوریاں میں بدر۔“ افقی نے لہجے کو مزید دھیمہ کیا۔

”کیسی مجبوریاں..... تم یک دفعہ مجھے اپنے بھائی سے ملو اور تو سہی میں ہماری شادی کی بات کروں گا۔ ہم اچھی اور آسودہ زندگی گزاریں گے افقی..... بدر نے جذباتیت کا اعلیٰ مظاہرہ کرتے اپنے دل کی بات اگلی۔ افقی دھیسے سے مسکائی جتنے مردوں سے اس کی دوستی رہی تھی سبھی کی اولین و آخری خواہش اتنی حیدر کا ساتھ پانا تھی مگر وہ چیز ہی ایسی تھی..... میری اس سے بڑی خوش قسمتی اور کیا ہو گی بدر..... اگر مجھے آپ کا ساتھ مل جائے گا تو؟ مگر پلیز..... کچھ وقت دیں..... بھائی تک بات پہنچانے کے لیے..... ظاہر ہے میں یہ بات ان سے خود تو کہہ نہیں سکتی اور فی الحال کوئی ایسا ہے نہیں جو میرے لیے اسٹینڈ لے۔ اور بھابھی کو کیا پڑی ہے مفت کی نوکرائی سے ہاتھ دھونے کی سو وہ تو کریں گی نہیں..... افقی کا لہجہ آپوں آپ ہی تلخ ہو گیا۔ تو پھر کون کرے گا ان سے بات.....“ بدر کے انداز میں محسوس کی جانے والی بے چینی تھی۔

اللہ بڑا سبب الاسباب ہے۔ وہ کوئی نہ کوئی راہ ضرور نکال ہی دے گا۔ افقی نے بھرپور انداز میں تسلی دی۔ اس کی ذات اور کرامات پر تو کوئی شک نہیں ہے لیکن..... اب میں گھر بسانا چاہتا ہوں افقی..... چند ماہ پہلے تک میں بالکل بھی سنجیدہ نہیں تھا مگر اب میں اور انتظار نہیں کر سکتا۔ بدر نے بے چارگی سے کہتے افقی کے اندر چھپ کے بیٹھی مکار اور بد چلن عورت کو مسکرانے پر مجبور کیا تھا۔

☆.....☆.....☆

افقی نے اس روز جو شاپنگ رضا کے ساتھ جا کے کی تھی، ہمیشہ کی طرح بے حد شاندار اور مہنگی تھی اپنی چادر سے بڑھ کر پاؤں پھیلا نا اس کی فطرت سے زیادہ اس کی مجبوری تھی بقول اسکے جتنی خوبصورت وہ خود تھی اتنا ہی قیمتی لباس ڈیزرو کرتی تھی کم قیمت لباس اس کے وجود کو ہلکا ظاہر کرے یا اسے کسی طور پر گوارا نہیں تھا بہر حال۔

افقی نے آج شام کو پہننے کے لیے گلابی اور کاسنی رنگ کا سوکس وائل کا بے حد خوبصورت پرنٹ والا لباس نکالا۔ باقاعدگی سے یوگا آسن کرنے کی وجہ سے دو بچوں کے بعد بھی اس کا جسم ایک انچ نہیں بڑھا تھا۔ وہ شادی سے پہلے کی طرح فٹ اور اسارٹ تھی اس کی آواز کی طرح بدن میں بھی کافی لوچ تھی ملائی کی مانند نرم و نازک اور سفید جلد رکھتی تھی نفاست سے کیا ہوا میک اپ گولڈن براؤن ہال..... وہ کسی فلمی ایکٹریس کی مانند حسین دکھتی تھی فرق صرف اتنا تھا کہ فلمی ایکٹریسز

بے بڑے اسٹاکسٹ کے ہاتھوں کے جادو کی محتاج تھیں جبکہ وہ قدرتی طور پر بنائی ہی ایسی تھی اور وہ بلا نتیجہ ایسی عورتوں جیسی تھی جو کچھ کیے بغیر بھی بے حد خوبصورت لگتی ہیں ہمیشہ اور ایسا صرف سو میں سے 2 فی صد خواتین ہی دنیا میں پائی جاتی ہیں۔ کثیر تو خیر ہر ذی روح کو چاہیے اور حسن تو فانی چیز ہے چند سال مزید ٹکانے کے لیے محنت تو کرنا ہی پڑتی ہے کسی کو کم کسی کو زیادہ۔ افقی کا شمار دونوں قسم کی خواتین میں نہیں ہوتا تھا اسے کچھ کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہ ہوتے ہوئے بھی وہ بے تماشاً کاشتیں رہتی تھی۔ عام لفظوں میں پاگل کہنا زیادہ مناسب لگتا ہے۔ اور وہ خود کو فٹ اور خوبصورت نظر آتے رہنے کے بارے میں جتنی جنونی تھی اس سے بڑھ کر حسین اور کم عمر نظر آتی تھی..... وہ بلاشبہ ایک پرفیکٹ لڑکی تھی۔ رضا کو آنے میں کچھ وقت تھا سو اس نے بچوں کی تیاری کرانی شروع کی ساتھ ہی کھانا گرم کرنے لگی۔ راستہ سلا درضا شوق سے کھاتا تھا سو وہ روز ہی بنایا کرتی ابھی بھی بنا ہوا تھا روٹی پکا کر ڈھانپ لی کہ تیار ہونے کے بعد کچن میں جانے پر بہت سی قابضیں دامن گیر ہونے کا خدشہ تھا۔ ساڑھے پانچ بجے گھر کی بیل بجی وہ دوڑ کر باہر کو لپکی جلدی سے دروازہ کھولا سامنے حسب توقع رضا کھڑا تھا پڑمرہ قدرے نڈھال..... اُف یہ کراچی کا ٹریفک اور ایک عام مڈل کلاس بندے کی لائف.....

اسلام علیکم! بہت فرلش موڈ میں خوشبوؤں سے مہکتے وجود کے ساتھ اس نے آگے بڑھ کر رضا کے ہاتھ سے بیگ قلم لیا۔ رضا نے لپک کر بچوں کو اٹھا لیا کس قدر خوبصورت مکمل منظر تھا ہنسی ہنسی خوشگوار زندگی گزارتے دو حسین میاں بیوی کے حسین بچے۔

آج تو قیامت ڈھا رہی ہو.....“ رضا نے نظر بھر کر دیکھا اور مخمور لہجے میں کہہ گیا وہ شگفتگی سے مسکرائی یوں کہ گلابی لپ اسٹک سے سجے ہوئے سفید آبدار موتیوں کی لڑی کو واضح کر گئے۔

قیامت قیامت نہیں ڈھائے گی تو اور کیا کرے گی، اس نے بھی ایک ادا سے کہا تھا۔
 ”ہاں..... ہم تو کب کے برباد ہو چکے یہ قیامت تو ہمیں لوٹ چکی ہم تو گھائل ہو گئے.....“ رضا نے مصنوعی ٹھنڈی آہیں بھرتے کہا افقی کی مسکراہٹ میں اضافہ ہو گیا۔ جلدی سے کھانا کھالیں..... ڈائلاگز بعد میں بول لیجیے گا ہمیں پہلے باہر لے کر جائیں سیر و تفریح کے لیے..... کتنے دن ہو گئے ہم اس گھر سے نکلے ہی نہیں۔

اور کوئی حکم میری سرکار.....؟ وہ فداوٹار ہوتا اس پر جھکا۔ افقی نے اسے پرے دھکیلا پہلے اس کی تو تعمیل کریں..... بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ پھر واقعی میں اس نے جلدی سے کھانا کھایا اور انہیں باہر گھمانے کو لے گیا..... ڈھیر ساری سیر و تفریح کے بعد واپسی پر اچانک ہی رضا حسن نے امی کے گھر جانے کی فرمائش کر دی۔ افقی کا سر ال جانے کے خیال سے ہی منہ بن گیا۔ مگر بولی کچھ نہیں۔

کتنے دن ہو گئے امی سے ملے ہوئے۔ چلو ان سے ملتے ہوئے چلے جائیں پھر نجانے کب فرصت ملے۔
 رضا۔ بہت دیر ہو جائے گی آپکو بچ آفس بھی تو جانا ہو گا ناں.....؟ افقی نے اپنا لہجہ نارل رکھا مبادا رضا جان نہ لے کہ وہ نہیں جانا چاہتی۔

بس تھوڑی دیر بیٹھیں گے پھر جلدی اٹھ جائیں گے..... رضا نے بایک کارخ امی کے گھر کی جانب موڑتے

جلدی سے کہا افقی کو خاموش ہونا ہی پڑا حالانکہ اسے بالکل بھی پسند نہیں تھا اپنی سسرال جانا۔ اسے وہ ہنس اور بے عزتی ابھی تک نہیں بھولی تھی جو اس گھر سے نکالنے وقت اس کی ساس نے اس کی تھی۔ بہر حال وہ ان عورتوں میں سے تھی جو اپنا الو سیدھا رکھنے کے لیے کچھ بھی کر سکتی تھیں اور اپنی مرضی و منشاء سے جینے کو وہ تھوڑا بہت رضا کی خاطر جبر بھی کرے تو کیا مضائقہ تھا بھلا۔ جس وقت ان کی بانیک گیراج میں آ کے رکی اس وقت عامر ہاتھ میں انڈے بریڈ کا شاہر پکڑے اوپر جا رہا تھا وہ یقیناً ناشتے کا سامان لینے آیا تھا نیچے..... گھر کا چھوٹا موٹا کام اسی کے ذمے تھا اکثر ہی کرتا رہتا تھا۔ افقی نے اسے ایک نظر دیکھا اس کی آنکھیں سلگنے لگی تھیں وہ اپنی ہی دھن میں ریکی مونٹن کا کوئی اسپینش گانا گنگنا تا جا رہا تھا ریکی مونٹن اس کا فیورٹ سنگر تھا اور اسی کی خاطر اس نے خصوصی طور پر اسپینش سیکھی تھی۔

چاچو..... عبداللہ اسے پہچانتے ہی چیخا تھا وہ جلدی سے مڑا۔

ارے میرا شیر..... وہ وہیں سے پلٹا اور آ کے عبداللہ کو اٹھا کے گلے لگایا اسے بھیا بھا بھی کوا چانک دیکھ کر ہی بہت خوشی ہوئی تھی پھر وہ رضا سے تلخ گھیر ہوا پھر افقی کو دیکھ کر ٹھکا۔ وہ شعلہ جوالہ بنی مسکراتی ہوئی اس کے سامنے تھی۔ کیسی ہیں بھابھی۔ نظروں اور لہجے پر قابو پاتے اس نے بمشکل تمام کہا تھا۔ بھابھی کہنے پر اس نے بڑی مشکل سے خود کو آمادہ کیا تھا وہ پہلے تو وہ افقی کہتا تھا بے تکلفی سے اور ان میں بے تکلفی تھی بھی بہت..... یہ ایک الگ قصہ تھا۔ میں ٹھیک ہوں۔ تم کیسے ہو عامر؟ اس کی نظروں میں اپنے لیے ستائش دیکھتی وہ نرمی سے مسکراتی ایک ادا کے ساتھ آگے بڑھی۔

میں بھی ٹھیک ہوں۔ عامر کے قدم سن پڑنے لگے۔ افقی کا حسن جادواں اسے بے خود کرنے لگا اور بھائی..... آپ کوا چانک کیسے یاد آگئی ہماری اتنے عرصے کے بعد؟ عامر نے ناچاہتے ہوئے بھی شکوہ کیا اسے تو اجازت نہ تھی بھائی کے گھر جانے کی ورنہ روز ہی جاتا یا وہیں پڑا رہتا۔

”تو تم کو سارو آتے ہو۔ کتنے سال ہو گئے مجھے علیحدہ گھر لیے غالباً دو سال۔ اور تم ایک دفعہ بھی نہیں آئے میرا گھر دیکھے.....“ رضا نے بھی شکوہ کیا۔ تو وہ بے دلی سے ہنس دیا کیا کہتا کہ اس کے گھر جانے پر خود ماں نے اپنی قسم دے کے مجبور کر رکھا ہے۔

آؤں گا بھائی۔ ضرور آؤں گا مگر اکیلا نہیں آپ کی طرح کپل کی صورت..... وہ افقی کو نظر بھر کر دیکھنے نرمی سے مسکرانے بولا۔ افقی بھی مسکرائی دفعتاً بولی۔

کب کر رہے ہو شادی۔ امی جان تو اپنی پسند کی بہولائیں گی تمہارے لیے ہے ناں جب بھائی نے اپنی مرضی کی..... تو میں اپنی پسند سے شادی کیوں نہ کروں بھلا..... عامر کو سنا یا نہ لگا تبھی جتلے بغیر رہ نہ سکا تھا۔

افقی چلتی چلتی رک گئی رضا چلتا رہا اس نے اسود کو اٹھا رکھا تھا..... اسے رکنا دیکھ کر عامر بھی رک گیا۔

تو پھر رضا حسن کی پسند جیسی ڈھونڈ لانا۔ ہے کوئی ایسی تمہاری نظر میں..... جو اقسیم حیدر کے مقابلے پر لائی جاسکے.....“ رضا بھی انہیں رکنا دیکھ کر رک گیا۔

”آپ جیسا تو کوئی نہیں بھابھی۔ آپ جیسی ڈھونڈنے لگتا تو شاید کنوارا ہی رہ جاؤں عمر بھر.....“ اس کے اقرار پر رضا اور افتی کا قبضہ بے ساختہ تھا..... مگر عامر کے لہجے میں سچائی تھی وہ اتنا ہی متاثر تھا افتی کی خوبصورتی سے..... اتنا کہ اس کے سامنے گنگ ہو جاتا سن پڑ جاتا..... مورت بن جاتا اور وہ ایک ایسا نہیں تھا افتی کے سامنے سب ہی ایسے ہو جاتے نہ ہوتے تو افتی خود کر لیتی۔

پوستہ رہ شجر سے اُمید بہار رکھ میرے بھائی..... زیادہ دکھی مت ہو بس اپنی صلاحیتوں کا استعمال اچھے سے کرو..... رضا نے گفتگو سے کہتے ہوئے گھر کی دلیز پر قدم رکھا تینوں ہنسنے کھلھلانے گھر کے اندر داخل ہونے۔ طاہرہ بیگم نے انہیں حیرت سے کم اور غصے سے زیادہ دیکھا تھا۔ انہیں عامر پر بے طرح غصہ آنے لگانے سرے سے آنے لگا۔ اور افتی اسے تو نجانے وہ ناپسند کرتی تھیں عامر افتی کو مسکراتے ہوئے دیکھ رہا تھا بالکل بے خود اور دیوانہ سا جیسا دیکھا کرتا تھا وہ افتی کے آنے پر یونہی خوش اور بے خود ہو جاتا جیسا اس وقت تھا..... طاہرہ بیگم نے بے حد ناگواری سے اس منظر کو دیکھا۔

یہ ڈائن میرے آنگن کو آگ۔ لگا کر ہی رہے گی ایک نہ ایک دن انہوں نے کس کر سوچا تھا لیکن اس کے بعد انہوں نے جتنا بھی وقت وہ لوگ وہاں بیٹھے عامر کو وہاں پھنکنے بھی نہ دیا تھا۔ اور کچھ غلط بھی نہیں کیا تھا۔

☆.....☆.....☆

طاہرہ بیگم نے آکر ایسا سوچا تھا تو کچھ غلط بھی نہیں سوچا تھا۔

آج سے پانچ برس قبل جب رضا حسن ان کے سب سے فرمانبردار بیٹے نے اُتین حیدر سے شادی کی خواہش ظاہر کی تھی انہیں لگا بربادی نے ان کی چوکھٹ پکڑ لی ہے۔ ان کے ہاں بالکل بھی رواج نہیں تھا کہ پسند کی شادی کی جاتی۔ برسوں سے ان کے ہاں یہ رواج درسم چلی آرہی تھی کہ لڑکا اور لڑکی گھونگھٹ پلٹنے پر ہی ایک دوسرے کو دیکھ پاتے۔ ماں باپ کی پسند پر کسی کو بھی اختلاف تو دور رائے زنی کا حق تک حاصل نہیں تھا اور وقت یہ بات اکثر ثابت کر کے دکھاتا ہی رہتا کہ والدین کے کیے گئے فیصلے بچوں کے لیے کس قدر سودمند اور معاون ثابت ہوتے ہیں..... اور ہر ماں کی طرح طاہرہ بیگم کی اولین خواہش بھی یہی تھی کہ وہ اپنے چاند سے بیٹوں کے لیے چاند سی بہویں ہی ڈھونڈ کر لائیں جو شکل و صورت سلیقہ مندی اور سکھڑاپے میں یکساں مکمل ہوں..... مگر پسند ان کی اپنی ہی ہو..... ایسے ہیں جب رضا حسن نے اُتین حیدر سے شادی کی خواہش کا اظہار کیا تو انہیں تو پیٹنے لگ ہی گئے سختی سے انکار ہوا انہیں گمان تھا کہ وقتی اُبال ہے خود ہی رضا حسن ٹھنڈے پڑ جائیں گے مگر یہ محض ان کی خام خیالی ہی تھی وقت نے بہت شفاف طریقے سے یہ حقیقت ان پر آشکار کی تھی بیٹے کی خودکشی کی دھمکی اور بھوک ہڑتال نے انہیں سوائے تمللانے کے کچھ نہیں کرنے دیا تھا..... اُتین حیدر کو وہ کس دل سے بیاہ کر لائیں یہ ان کا دل ہی جانتا تھا مگر لاڈلے کی خاطر انہوں نے اس کڑوے گھونٹ کو بھی حلق سے بھی اتار لیتیں اگر کہ اُتین حیدر کی عادات و حرکات قابل اعتراض نہ ہوتی تو.....؟

ان کی بہو خوبصورت و حسین تھی اس کا اعتراف انہیں بھی تھا لیکن شاید اس بات کا احساس ان کی بہو کو سب سے زیادہ تھا..... شادی کے اولین روز..... مہکتے ہوئے گزر رہے تھے رضا حسن کو وہ دیوانہ بنے دیکھ رہی تھیں افتی بھی اس پر فدا

ہوتی بات قابلِ اطمینان اور باعثِ سکون تھی مگر طاہرہ بیگم کے لیے مزید پریشانی کے درافقی رضا کی غیر موجودگی میں سارا دن سارا وقت عامر کے ساتھ ہنسی ٹھنکھوں میں مصروف رہتی..... وہ بھی یا بھابھی کے کمرے میں پایا جاتا یا افقی اس کے کمرے میں..... بھابھی کی فرمائش پر ڈھیروں ڈھیر فرمائشی چیزیں لاکے اس کے سامنے ڈھیر کیے رکھتا..... ہنسی مذاق کیے جانے..... فلمیں دیکھی جاتیں..... بن سنور کر رہنے والی افقی سارا دن بجلیاں گرائے رکھتی..... عامر بے خود اور قد رے دیوانہ وار انداز میں افقی کو دیکھنے چھونے کی خواہش رکھتا مگر چھونے سے ڈرتا..... افقی اس سب سے بظاہر انجان اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارتی..... کبھی ہنستے ہنستے اس پر جھول جاتی..... اس کے لیے یہ سب عام تھا مگر طاہرہ بیگم جہاں دیدہ خاتون تھیں وہ افقی پر شک نہیں کرتی تھیں دیور بھابھی میں ایسا ہنسی مذاق یا بے تکلفی کا رشتہ رہتا ہی ہے لیکن جوان بیٹے کی مردانگی سے خوفزدہ تھیں ایک دن وہ لدا پھندا سا گھر لوٹا آتے ساتھ ہی افقی کو آوازیں دینے لگا۔

آتے ہی گھر کیوں سر یہ اٹھالیا ہے۔ خیر ہے؟ انہوں نے سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی اپنے تئیں عامر کو لتاڑا..... پروہ نہیں سمجھا اس سادگی میں پوچھ بیٹھا۔

افقی کہاں ہے امی.....؟ طاہرہ بیگم نے ناگواری سے اسے دیکھا بھر بگڑ کر بولیں۔

بھابھی ہے وہ تمہاری..... عمر میں نہ سہی بہر حال رشتے میں وہ تم سے بڑی ہے بھابھی کہہ کے بلایا کرو..... انہوں نے اسے ٹوکا مگر اس نے اثر نہیں لیا ایک دوبار بھابھی کہہ کے پکارا بھی مگر افقی نے روک دیا۔
یہ بھابھی جیسا اولڈ فیشن ورڈ میرے لیے کم از کم پوزمت کیا کرو تم..... میری پہچان کے میرا نام ہی کافی ہے اور وہ میرا پسندیدہ بھی ہے۔

پسند تو مجھے بھی نہیں ہے مگر امی جان کو بُرا لگتا ہے۔ سو اسی لیے نام نہیں لیتا۔ عامر نے بھی خوب اپنی مظلومیت و معصومیت دکھائی افقی دانت پیٹتے بمشکل مسکراتی۔

وہ پرانے زمانے کی پروردہ خاتون ہیں عامر..... ان کے اصول آج کے زمانے میں نہیں چل سکتے..... ہمیں تماشا تو نہیں بنانا..... وہ طنزیہ انداز میں ہنسی یوں کہ طنز سارے ماحول میں رچ بس گیا خود سوچو میں صرف عمر میں ہی نہیں دیکھنے میں بھی تم سے کتنی ”چھوٹی“ لگتی ہونا اگر ہم کہیں جائیں تو لوگ کیا تمہارا مذاق نہیں اڑائیں گے.....“ عامر نے فوراً کسی سدھائے ہوئے بندر کی طرح اثبات میں سر ہلا کے تائید کی حسن کے سامنے اختلاف رائے کرنے والوں میں سے وہ نہیں تھا وہ بس مبہوت ہونے والوں میں سے تھا مسکوری رہتا۔

”دیور بھابھی کا رشتہ بہت مقدس ہوتا ہے۔ بہو۔ اس میں عمروں کا تفاوت معنی نہیں رکھتا رشتے کی نزاکت اور احترام معنی رکھتا ہے۔“ افقی کے ہاتھوں کے توتے طاہرہ بیگم کی اچانک مداخلت سے اڑے تھے انہوں نے خوب بھگو بھگو کر ماری تھیں افقی خاموش ہو رہی بولی کچھ نہیں حالانکہ چاہتی تو کئی کراڑے جواب اس کے پاس بھی تیار تھے مگر ساس کے سامنے نہ بولنا اس کی خوبی تھی..... وہ ان کا احترام بھی کرتی اور ان سے بدتمیزی بھی نہ کرتی وہ جتنا بھی تلخ ہو جاتیں اتنی روح افزاء کے میٹھے گھونٹ مانند پی ہی جاتی۔

”سوری امی جان..... میں ہی غلط تھی عامر..... آج سے تم مجھے بھابھی ہی کہہ کے بلانا پلیز۔“ اس نے عامر کو ”بھیبھہ کی اور واپس پلٹ گئی..... طاہرہ بیگم چاہتے ہوئے بھی عامر کو کچھ جتلا نہ سکیں اتنی اچھی تو ہے بے چاری۔ آپ کیوں لہو انگوٹھ میں خار کھائے رہتی ہیں۔“ اس کے جانے کے بعد عامر کہے بغیر رہ نہیں سکا طاہرہ بیگم نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

ابھی تم اتنے بڑھے نہیں ہوئے عامر..... کہ ماں سے باز پرس کر سکو.....“

مگر امی..... عامر نے کچھ کہنا چاہا مگر انہوں نے بے حد سختی سے ٹوک دیا۔

اپنے کمرے میں جاؤ عامر۔ اور وقت بے وقت افقی کے کمرے میں جانے سے پرہیز برتو۔ وہ اُپالی اور کلنڈری ہے مگر تم تو سمجھدار ہو وہ تمہارے بھائی کی بیوی ہے اس کی عزت۔

”امی..... عامر حیرت سے اپنی جگہ جم گیا: آپ مجھے اتنا غلط سمجھتی ہیں؟“ وہ پاؤں پٹختے مڑا ”غلط نہیں سمجھتی مگر کچھ غلط ہو جانے سے ڈرتی ہوں“ اس کے جانے کے بعد وہ خود کلا می کرتے ہوئے بڑبڑائیں تھیں۔

شادی کو چھ ماہ سے زائد کا عرصہ گزر گیا افقی دوسرے جی سے تھی خوب صحت مند ہو رہی تھی خوراک بھی اچھی تھی اور خیال بھی اچھا رکھا جا رہا تھا..... سوا اچھی صحت تو ہونی ہی تھی۔ ان دنوں تو خیر طاہرہ بیگم بھی اس کا خوب خیال رکھ رہی تھیں۔ ویسے بھی روایتی ساس بہو والی عداوت اور کدورت تو ایک دن بھی انہوں نے اس کے ساتھ نہ پالی تھی بس انہیں افقی کی کچھ عادتوں سے اختلاف ضرور تھا۔ اسی بات پر اسے اکثر کڑوا سیلا سنائے دیتیں مگر افقی بُرا مانے بغیر سن لیتی۔ مگر اپنی روش پر قائم ضرور رہتی۔ کبھی کبھار طاہرہ بیگم کا جی چاہتا وہ پلٹ کر انہیں جواب ضرور دیئے پھر وہ دل کھول کے اسے سناسکیں مگر یہ خواہش آہستہ آہستہ ان کی حسرت بن گئی تھی۔ پھر ایک دن انہیں یہ موقع مل ہی گیا۔ افقی کے آخری ایام گزر رہے تھے بے حد بھاری جسامت ہو گئی تھی اٹھ کر ہلنے جلنے سے بھی عاجز تھی مگر حسن کی حفاظت وہ اس حال میں بھی دل جمعی کے ساتھ کر رہی تھی۔ وہ کچن میں کھانا بنا رہی تھیں اور افقی لاؤنج میں سامنے والی دیوار پر لگے بڑے سے آئینے کے سامنے کھڑی پٹیج کریم لگا رہی تھی۔ اس نے آگے پیچھے سے گہرے گلے والی ڈھیلی ڈھالی قمیص پہن رکھی تھی۔ طاہرہ بیگم نے کچن کی کھڑکی سے اسے باہر جاتے عامر کو پکارتے دیکھا اور سنا تھا۔

”عامر..... پلیز یہ تھوڑی کریم میری پچھلی گردن پر لگا دو گے۔ میرا ہاتھ نہیں جا رہا۔ عامر کسی معمول کی طرح بغیر پس و پیش کیے اس کے ہاتھ سے کریم کی ڈبیا تھا مگر اس کی گردن کے پچھلے حصے پر لگانے لگا۔

اتنی تو گوری ہو بھابھی۔ پھر فضول میں یہ کریمیں کیوں لگاتی ہو۔ تمہیں بھلا ان سب چیزوں کی کیا ضرورت۔ عامر بے لاگ انداز میں تبصرہ کرتے کریم لگا رہا تھا افقی کھکھلا کے ہنسی۔

ہر چیز کو حفاظت کی ضرورت رہتی ہے۔ اور پھر حسن تو چار دن کی جوانی کے ساتھ ڈھلنے والی شے ہے اسے قابو کر کے قائم رکھنا بہت مشکل کام ہے۔ اس نے آئینے میں نظر آتے اس کے وجہہ عکس پر نگاہیں جماتے کہا تھا عامر اسے دیکھ کے مسکرایا۔ ”وزن پر تو تمہارا کنٹرول ہے نہیں موٹی۔ حسن پر کیا خاک کنٹرول کرو گی۔“ وہ اس کے کندھے پر دھپ مارتے

اسے بتانے کو بولا۔ افقی تو نہیں البتہ طاہرہ بیگم ضرور تپ گئیں۔ تیر کی سی تیزی کے ساتھ عامر تک آئیں اور پوری قوت سے تھپڑ اس کی گال پر جڑا۔ عامر نے گال پر ہاتھ رکھا۔ بے شرم۔ بے حیا۔ کہا تھا ناں۔ اسے یاد نہیں پر تو اس سے اپنا رشتہ اور مقام یاد رکھ کے فاصلے پر رہ۔ عامر ہنوز گال پر ہاتھ رکھے بے یقینی سے ماں کو دیکھ رہا تھا۔

اسے حیا نہیں کیونکہ وہ حیاء والے خاندان سے آئی ہی نہیں مگر تو بھی اپنے خاندان کی لاج گھول کے پی گیا کیا۔ کیا منہ دکھائے گا بھائی کو۔ زمانے کو اگر کسی کو تیرے ان کرتوتوں کی بھٹک بھی پڑ گئی تو۔ وہ اس کے سینے پر دو ہنر مارتے بولی تھیں تبھی افقی تڑپ کے ان تک آئی تھی۔

”امی جان۔ آپ زیادتی کر رہی ہیں۔ عامر میرے لیے بھائیوں جیسا ہے آپ الزام لگا رہی ہیں مجھ پر۔ افقی احساس تو ہیں سلگنے لگی۔

”تم چپ کر۔ یہ مجھے تمہاری کوئی صفائی نہیں سننی۔“ وہ حسبِ عادت ترغیض جواباً افقی بھی ترخ اٹھی۔ کیوں نہیں سننی۔ بس یوں آپکو خود پر کچھ نہیں اچھالنے دوں گی۔ آخر کیا دیکھا آپ نے اس ایک ڈیڑھ سال میں میرے اور عامر کے درمیان۔ دیور بھابی میں بے تکلفی کہاں نہیں ہوتی اور آپ کس قدر گندگی اچھال رہی ہیں مجھ پر۔ کتنی گندی سوچ ہے آپ کی۔“ افقی پہلی بار اونچی آواز میں چلائی تھی۔

اپنی حد میں رہو بہو۔ مجھے چیخنے چلائی والی لڑکیاں بالکل بھی پسند نہیں۔ اور تم میرے صبر کو مزید مت آزماؤ۔ اگر مجھے دنیا کا ڈرنہ ہوتا تو ضرور تمہاری آنکھیں کھولتی۔ وہ جواباً قدرے نیچی آواز میں غرائی مگر افقی اور بھی پھر گئی۔

”آپ نے اتنی بڑی بات کہہ دی اور اب کہہ رہی ہیں کہ میں آپ کے صبر کو نہ آزماؤں۔ آپ نے مجھے میری ہی نظروں میں گرا دیا ہے بلائیں عامر کو۔ اور پوچھیں اس سے کہ میں نے کب اس سے بے حیائی کی ہے۔ کب میں اپنے مقام سے نیچے گری ہوں۔ کیا دیکھا آپ نے میرے اور اس کے درمیان قابلِ اعتراض۔“ غصے سے چہرہ صاف کرتی وہ تیز تیز بولتے ہانپ رہی تھی۔

”تو پھر ابھی جو ڈرامہ رچا رہی تھی وہ کیا تھا۔ کونسی بھابی ہوگی جو یوں اس طرح دیور سے کندھوں کا مساج کرواتی ہوگی۔ طاہرہ بیگم نے عامر کی طرف سے غصے سے دیکھتے افقی کو جتلا یا تھا۔

تو اس میں غلط کیا ہے۔ افقی نے لہجے میں حیرت سموتی۔ آپ کے سامنے ہی تو کہا میں نے اس سے۔ اپنے کمرے میں بلا کے تو نہیں کہا اور یہ کونسی ایسی قابلِ اعتراض بات ہے آپ نے بہت گھٹیا چال چلی مجھے رضا کی نظروں میں گرانے کے لیے امی جان۔ وہ روتے ہوئے کہتے کمرے کی طرف بڑھی اور یہی شکوہ طاہرہ بیگم نے عامر کی نگاہوں میں بھی دیکھا تھا۔ اگلے آدھے گھنٹے میں رضا گھر پر موجود تھا خوب لڑائی ہوئی غضب کی مکالمہ بازی ساس بہو کے درمیان ہوتی رہی۔ طاہرہ بیگم کی حسرت اب پچھتاوے میں بدل گئی جب انہیں افقی کے زبان کے جوہر کھلتے دکھائی اور سنائی دیئے بے اختیار اس وقت کو کونسا جس وقت ایسی کوئی خواہش کی تھی۔ عامر اور رضا سر پکڑ کر بیٹھتے تھے۔ رضا بیوی کی محبت سے واقف تھا وہ اس پر محاورہ نا نہیں حقیقتاً جان جھڑکتی تھی عامر الگ دم بخود تھا ماں نے بہو سے عداوت نکالنے کے لیے اس کے کردار کو بھی

ماں نہ بنایا تھا ایسے میں وہ خواب بھول گیا تھا کہ جتنی بے تکلفی ان کے رشتے میں دھکتی تھی کوئی بھی ہوتا یہی سمجھتا ماں نے پھر ہی نوکا تھا بڑھا و اتوافتی کی منہ زور فطرت نے دیا تھا۔

مجھے اب اس گھر میں ایک پل بھی مزید نہیں رہنا۔ رورو کرانے آنکھیں سجالیں تھیں بی بی خطرناک حد تک گر گیا تھا۔ رضا کو اس کی جان کے لالے پڑ گئے اس نے دوپہر سے کچھ کھایا تھا نہ ہی پانی کا گھونٹ حلق سے اتارا تھا۔

”ٹھیک ہے مت رہنا۔ پہلے تم یہ جوس پی لو۔ تمہاری طبیعت کے لیے اچھا ہے۔“ رضا کسی زور سے بچے کی مانند سے پچکارا مگر افقی نے گلاس ہاتھ سے پرے دھکیلا۔

اب میں اس وقت تک کچھ نہیں کھاؤں گی جب تک اس گھر سے نکلوں گی نہیں۔ مجھے کیا خبر تھی وہ مجھے آپ سے شادی کرنے کی اتنی بڑی سزا دیں گی۔ میرے کردار کی دھجیاں بکھیری ہیں انہوں نے رضا۔ میں خود سے نظریں ملانے کے قابل بھی نہیں رہی کجا دنیا والوں اور عامر کا سامنا کرنا۔ مجھے پلیز میرے میکے واپس چھوڑ آئیں۔ پلیز رضا۔ روتے روتے وہ ان کے سامنے ہاتھ جوڑ بیٹھی رضا کا سر جھک گیا بے حد ملول سے وہ یہ سب سوچنے پر مجبور ہو گئے ماں کو ایسی کیا پڑی تھی جو اتنی بڑی بات کہہ گئیں ڈیڑھ سال ہو گیا شادی کو انہیں تو ایک دن نہ محسوس ہوا کہ افقی نے ان کے علاوہ کسی اور کو بھی توجہ دی ہے عامر کے ساتھ تو اس کا رویہ بہت الگ سا رہتا تھا انہوں نے تو اکثر ایسا ہی دیکھا تھا بالکل ویسا افقی نے دکھایا تھا ایسے میں ماں جو جو بیس گھنٹے گھر میں رہ رہی ہے۔ اس کی طرف دھیان دینے کا اس نے سوچا ہی نہیں۔ افقی۔ پاگل مت بنو اور یہ جوس پیو اب اس وقت کیوں ان لوگوں کو مشکل اور پریشانی میں ڈال رہی ہو۔ رضا سر تھا مے بیٹھا رہا افقی نے ایک بھی بات دھیان سے نہ سنی تھی۔

وہ میرے ماں باپ ہیں رضا۔ جو مجھ سے پیار سے زیادہ اعتبار کرتے ہیں۔ افقی نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر ادا کیا رضا کو جتلاتی نگاہوں سے دیکھا۔

”افقی پلیز۔ گھر کی بات گھر میں ہی رہے تو بہتر ہے تم خواہ مخواہ میں۔“

”گھر کی بات۔ واہ رضا جس گھر میں رہنے والی بات کیا تمہاری ماں نے کی ہے اور کیا ایسی باتیں گھر میں دہائی جاسکتی ہیں؟ وہ سراپا سوال بنی ہمت سے زیادہ طاقت صرف کرنے کی وجہ سے ہانپ رہی تھی۔

”افقی پلیز۔ میری خاطر۔“ رضا مننایا۔

”آپ کی خاطر ہی آج تک ہر کڑوی کسلی کو پیا ہے یہاں تک کہ اب بات کردار پر پہنچ گئی۔ اب نہیں۔ کسی صورت نہیں قطعاً نہیں۔“ نفی میں زور زور سے ہلتا سر مختلف الفاظ میں ایک ہی مطلب واضح کر رہا تھا۔

”اتنی نفرت اور کینہ دہا تھا ان کے اندر۔ کاش مجھے رتی بھر اندازہ ہو جاتا کم سے کم آج اتنی کلفت تو نہ اٹھانا پڑتی۔“ سوس سوس کر کے ناک صاف کرتی وہ رضا کو مسلسل شرمندہ کر رہی تھی۔

”رضا۔ بہو کو اس کے میکے چھوڑ آؤ۔ طاہرہ بیگم دروازہ میں کھڑی خشکیں نظروں سے ان دونوں کو دیکھتی بہت بعیدگی سے کہہ رہی تھیں۔

”امی جان“ رضا حسن سرا سیمگی کے مارے اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ باہر نکل گئیں۔

”وہ تمہیں کتنی دیر سے کہہ رہی ہے کہ اسے اس کے میکے چھوڑ کے آؤ۔ اسے چھوڑ ہی آؤ رضا۔ یہاں رہی تو ضد میں نجانے اپنا کیا نقصان کر بیٹھے۔ وہ اپنے اندر کی پریشانی چھپائے بظاہر لا پرواہی برت رہی تھیں سچ تو یہ تھا کہ وہ خود بھی دم بخود تھیں اندازہ نہ تھا کہ بھوتانا بڑا ڈرامہ رچا کے خود کو مظلوم ظاہر کرنے کی ہر ممکن کوشش بلکہ سرتوڑ کوشش کرے گی۔ بہر حال وہ اس کی طبیعت کے پیش نظر اب پریشان تھیں اتنا اس بات کی اجازت نہ دیتی تھی کہ خود جا کے اسے کچھ کھلاسیں یا کھانے کو کہہ ہی دیں مگر وہ غلطی پر بھی تو نہیں تھیں اگر وہ انہیں آج نہ روکتیں تو جانے کو کسی قیامت آ جاتی۔ اور قیامت تو قیامت ہی ہوتی ہے جھوٹی یا بڑی نہیں۔

”امی جان۔ آپ نے اچھا نہیں کیا۔“ رضا حسن نے پہلی بار زبان کھولی۔

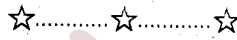
”مجھے کوئی شرمندگی نہیں۔ بہر حال میں نے جو بھی کیا ہے اپنے بچوں کی دائمی خوشیوں کے لیے ہی کیا۔ یہ کہہ کر وہ رکی نہیں باہر چلی گئیں۔ رضا حسن بالوں میں انگلیاں پھنسائے لب بستہ خاموش کھڑا رہا۔ پھر کچھ دیر بعد وہ افقی کی دگرگوں حالت کے پیش نظر اسے میکے چھوڑ آیا۔ وجہ یہی بتائی کہ اکیلی وہاں گھبرا رہی ہے اسی لیے چند دن یہاں رہنے کے بعد واپس چلی جائے گی۔ مگر افقی نے اسے اپنی ماں کا بھرم رکھنے نہیں دیا چیخ چیخ کر اس کی ماں کا کیا دھرا سب کچھ کہا گیا روپیٹ کے گھر والوں کو سنایا اور انہیں اتنا سنایا کہ جب چار روز کے بعد رضا حسن افقی کو لینے کے گئے تو سر صاحب نے خود داماد کے ساتھ جرح کی رضا حسن کو بہت کچھ کہا گیا۔ انہوں نے سنا بھی اور تحمل و برداشت کا مظاہرہ بھی کیا بالکل ایسا ہی جیسا چار روز قبل ماں کے سامنے کیا تھا۔ افقی اس ٹھنڈی مٹی کے انسان کو دانت پیس کر دیکھتی رہ گئی۔ پر اس کے ساتھ واپس نہیں گئی رضا کی امید اور آس بھری نظروں کو دیکھنے اور سمجھنے کے باوجود بھی۔ ویسے بھی بات تو اب سر کے ہاتھوں میں پہنچ گئی تھی کہ کنارے لگ کے ہی ختم ہونا تھی۔ رضا حسن خالی ہاتھ و خالی دل واپس پلٹ گیا۔

عامر الگ ماں سے ناراض تھا ان کے دیکھتے ہی منہ پھیر لیتا۔ بھوک ہڑتال جاری تھی مگر طاہرہ بیگم نے زیادہ توجہ نہیں دی بس اتنا ہی کہا۔

”میرا شمار غلطیوں پر پردہ ڈالنے والی ماؤں میں نہیں ہوتا عامر۔ گریبان میں جھانک کے دیکھو۔ سچ جھوٹ اور زیادتی سب نظر میں آجائے گا کچھ غلطیاں عمر بھر کا پچھتاوا بن جاتی ہیں اور پچھتاوے ہمیشہ خسارے بھرتے ہیں زندگی میں۔ کیا تمہیں زندگی میں خسارے شمار کرنے ہیں۔ عامر کا سر جھک گیا آنکھیں بھر آئیں ماں نے سوال نہیں کیا تھا جوتا بھگو کے مارا تھا۔ وہ بلک بلک کے رویا۔ ساری رات رویا ماں نے آگے بڑھ کے گلے سے نہیں لگایا بس کندھے پر تسلی کے لیے ہو لے سے تھکی دی دلا سہ بھی ملا اور غلطی کرنے کے باوجود ماں کے ساتھ کی شہ بھی نہ ملی۔ طاہرہ بیگم کو عامر کی شرمندگی بے حد اچھی لگی وہ بے حد ہلکی پھلکی ہو گئیں قیامت کو قیامت نہیں بنے دیا تھا پہلے مرحلے پر ہی روک دیا تھا اس کے بعد رضا کو الگ گھر لے کر رہنے پر راضی کرنے والی بھی وہ خود ہی تھیں عبداللہ کی پیدائش کے سوا مہینہ بعد افقی نے اپنے اور رضا کے علیحدہ گھر میں ہی گئی تھی مگر اکیلی بچہ سنبھال نہیں سکی دوبارہ پھر واپس آ گئی طاہرہ بیگم نے پرانی باتیں بھلا کر بھوار پوتے کی

جی جان سے خدمتیں کیں لاڈ اٹھائے۔ افقی نے بھی اپنا الویدھا کرنے کے لیے اپنا رویہ نرم اور چمک دار بنا لیا ویسے بھی اس کا شمار موقع سے فائدہ اٹھانے والوں میں ہوتا تھا جو دل میں بعض وعائد تو پالتے ہیں مگر انا کا پرچار نہیں کرتے۔ بس اپنا الویدھا رکھتے ہیں۔

عامراب کی بار افقی سے کھینچا کھینچا رہا۔ شاید اپنی غلطی کا احساس دل میں ہی ہو گیا تھا۔ مگر اس کی یہ احتیاط افقی کو اپنی ہتک محسوس ہوئی وہ جان بوجھ کے اسے زچ کرتی عبداللہ کی ضروریات کی لسٹ اسے بنا کر تھما دیتی ناچار اسے لانا پڑتی۔ مگر ماں کا خوف ہمیشہ دامن گیر رہتا افقی کے دل میں چنگاری آگ پکڑنے لگتی وہ کیوں تھا اپنی ماں کا اتنا فرمانبردار۔ اس کے لیے افقی کی جہش ابرو کی اہمیت کیوں نہیں تھی۔ جیسے پہلے ہوا کرتی تھی۔ اسے اب بھی ایسا ہی کرنا تھا مگر وہ موقع کی تلاش میں تھی۔



اور پھر اسے موقع نہیں مواقع ملے اور ایک بار نہیں کئی بار.....!

افقی نے ان مواقع سے خوب خوب فائدہ اٹھائے اور بار بار اٹھائے۔ عامر کا التفات پھر سے افقی کی طرف ہو گیا گھر میں ویسے ہی فساد دوبارہ سر اٹھانے لگے طاہرہ بیگم کی ہر دکھتی رگ کو افقی نے پکڑا اور پکڑ کر مسلا۔ ان کے دونوں بیٹے افقی کے دیوانے تھے اور طاہرہ بیگم انہیں اس کا دیوانہ ہوتے دیکھ رہی تھیں مگر وہ برداشت نہیں کر پار ہی تھیں۔ عبداللہ ڈیڑھ سال کا ہو گیا جب افقی دوبارہ اُمید سے ہوئی۔ انہی دنوں عامر افقی کے سامنے آ کے ٹھہر گیا۔ وہ ڈھائی سال سے آنکھ چمکی کا کھیل کھیلتے تھک گیا تھا۔

ماں کی لحن طعن اور ملامتی نظریں اس کو اپنے دامن کو داغدار ہو جانے کا بخوبی احساس دلاتیں مگر وہ مجبور تھا اپنے دل کے ہاتھوں اور افقی کی زندگی اور مجبور یوں کی خاطر۔ وہ اپنے بھائی سے متنفر تھا جس نے افقی جیسی امیر اور حساس لڑکی کی زندگی اجیرن کر رکھی جو اتنی خوبصورت بیوی کو چھوڑ کر باہر کی عورتوں میں دلچسپی لیتا تھا جو افقی سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا تھا۔ حالانکہ ایک ہی گھر میں رہتے تھے سب۔ ایک ہی ٹیبل پر کھانا بھی کھایا جاتا مگر۔ عامر کو نظر نہیں آتا اس کی آنکھیں تھیں مگر چشم بصیرت افقی کی عطا کی ہوئی تھی۔ اسے وہی نظر آتا جو افقی دکھاتی رضا حسن کا التفات، محبت اور والہانہ پن واضح ہونے کے باوجود بھی عامر دیکھ نہیں پاتا۔

افقی عبداللہ کو تیار کر کے سڑھیاں اُتر رہی تھی۔ خود بھی خوشبوؤں میں بسی تروتازہ سی مہکتا ہوا گلاب بنی ہوئی تھی۔ عامر چند لمحے مہبوت ہو کے کھڑا رہا۔

”تم رضا سے طلاق لے لو افقی۔ میں تمہیں اپنانے کو تیار ہوں؟ وہ اس کے سامنے ٹھہرا تھا مگر افقی پورے قد سے گری۔ کھیل ہی کھیل میں بات یہاں تک جا پہنچی تھی۔

”یہ کیا بکواس کر رہے ہو تم؟“ افقی کا غصہ عود کر آیا۔

”یہ بکواس نہیں ہے افقی۔ میں سچ کہہ رہا ہوں رضا کو تم نظر آتی ہو نہ تمہاری خدمت اور وفائیں تو پھر کیا ضرورت

ہے تمہیں کہ تم اپنی زندگی تباہ کرو۔ دیکھو میں تمہارا قدردان ہوں میں تمہیں بہت خوش رکھوں گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔ افقی کا دماغ بالکل سے اڑ گیا۔ وہ اسے کیا جواب دے کیسے سمجھائے مذاق ہی میں مذاق میں عامر اس پنج پر بھک گیا کہ اس کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔ بات بگڑ رہی تھی عامر کی جذباتیت اس کے آشیانے کو جلا سکتی تھی۔ افقی نے آنے والے وقت کا حساب کتاب لمحوں میں کیا اور پھر اسے سمجھایا۔

”پاگل پن کی باتیں مت کرو عامر۔ تمہاری ہمدردی ایک طرف مگر زمانہ تو میرے پر ہی تھو تھو کرے گا ناں۔ وہ سنبھل کر پیچھے ہٹی عامر دو قدم آگے بڑھ آیا۔ اس کی چال متوازن اور مضبوط تھی یوں جیسے وہ فیصلہ کر کے آیا ہو۔ افقی کو پہلی بار اس کی جرات سے خوف محسوس ہوا۔

”کیوں کرے گا زمانہ تھو۔ آپ کی اپنی زندگی ہے آپ اسے جیسے مرضی گزاریں یہ آپ کا قانونی و شرعی حق ہے۔“
”رضا جیسا بھی ہے میرا شوہر اور میرے بچوں کا باپ ہے عامر۔ میں ایسا نہیں کر سکتی پلیز۔ اس نے ڈرامے میں رنگ بھرا۔

”مگر افقی۔ تمہاری زندگی کا کیا ہوگا جو تم اتنی اذیت سے گزار رہی ہو۔ عامر بضد تھا۔ عورت کی زندگی اسی وقت ختم ہو جاتی ہے عامر۔ جس وقت وہ ماں بن جاتی ہے اب میں صرف ایک ماں ہوں اور مجھے اپنے بچوں سے ان کا باپ نہیں چھیننا اور پھر تم جانتے ہو دنیا والے کیا کہیں گے کہ ایک بھائی کو چھوڑ کر میں نے دوسرے کو پھانس لیا اور پلیز عامر۔ میں سب کچھ سن سکتی ہوں مگر اپنے کردار کے حوالے سے ایک لفظ نہیں اس نے ہاتھ اٹھا کر عامر کو ٹوکا اس کا لہجہ قطعی اور خشک تھا تمہیں اپنی نہ سہی مگر مجھے تمہاری ضرورت پر واہ ہے افقی۔ میں تمہیں اس برزخ میں نہیں چھوڑ سکتا۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے ہم باہر شفٹ ہو جائیں یہ محلہ شہر کیا یہ ملک ہی چھوڑ دیں گے تم بس ایک دفعہ حامی تو بھرو۔ وہ لجاجت سے کہتا اس کے قدموں میں بیٹھ گیا۔“
”عامر۔ رضا حسن میرا شوہر ہے جس سے میں بے پناہ محبت کرتی ہوں اتنی کہ اس پر اپنی جان واردوں۔ تم نہیں سمجھو گے کیونکہ تم نے ابھی کسی سے محبت جو نہیں کی۔“ اس نے اکیدم ہنستے مسکراتے لہجے میں اپنی ٹون بدلتے کہا تھا رضا حسن نے افقی کے کہے الفاظ آخری سڑھیوں پر کھڑے ہو کے سنے اور مسکرا دیے۔ انہیں اپنے انتخاب محبت یہ فخر محسوس ہوا۔
دل گداز ہو کے دھڑکا ایسی محبت کرنے والی بیوی نصیب والوں کو ملتی ہے۔

”السلام علیکم ایوری باڈی!“ عامر کے جواب میں کچھ کہنے سے پہلے ہی رضا حسن آگے بڑھ آئے عامر نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ کچھ بولا نہیں ورنہ ان دونوں بھائیوں کے تعلقات خوا خواہ میں خراب ہوتے۔
”وعلیکم اسلام! ابھی آپ کا یہ ذکر ہو رہا تھا۔“ آگے بڑھ کے عبداللہ کو رضا حسن کی گود میں بٹھاتے افقی نے ٹھکتے ہوئے لہجے کہا تھا۔

”اس کا مطلب ہے دل کو دل سے راہ ہوتی ہے میں ابھی سوچ رہا تھا کہ کہیں میں لیٹ تو نہیں ہو رہا کیونکہ اگر میں لیٹ ہو گیا تو بیگم صاحبہ کا موڈ خراب ہونے میں لمحے کی تاخیر بھی نہیں ہوگی کیوں عامر۔ بشاش لہجے میں کہتے ہوئے انہوں نے عامر کو بھی زبردستی گفتگو میں شامل کیا اور عامر اتنا بے وقوف تو تھا نہیں کہ دل کی بربادی عیاں ہونے دیتا خاموشی

سے بھائی کی ہاں میں ہاں ملاتے پلٹ گیا۔ لیکن اس روز کے بعد افقی نے دوبارہ سے رضاحسن کو الگ گھر لینے کے لیے زچ کر دیا اور رضاحسن اتنا زچ ہوئے کہ اسود کی پیدائش سے پہلے ہی اپنے الگ گھر میں شفٹ ہو گئے افقی نے عامر جیسے بے ثوف مرد سے جان چھوٹنے پر جیسے خدا کا شکر ادا کیا تھا۔

☆.....☆.....☆

”میں تاریخ کو میں صبح یہاں سے نکلوں گا افقی۔ اور اسی شام پلیز تم مجھ سے ملنے کی کوشش کرنا۔“ بدر کے لہجے میں واضح تڑپ اور جدائی کی باس تھی۔ ”میں یورپی کوشش کروں گی بدر مگر آپ بھی جانتے ہیں کہ شام کو میرا گھر سے نکلنا کتنا مشکل ہوتا ہے بھیا بھیا بھی گھر واپس آچکے ہوتے ہیں پھر رات کے کھانے کی تیاری الگ کرنی پڑتی ہے۔ بہت مشکل ہوگی۔“ افقی نے لہجہ کو حتی الوسع رقت آمیز بنانے کی سعی کی گویا اسے بھی ملنے کی ہڑک ہے مگر مجبوری دامن گیر ہے۔

”تو تم نہیں ملوگی؟ بدر کا لہجہ ٹھہر گیا خشک اور کھر درا“

”میرے بس میں ہو تو اڑ کے آپ کے پاس آ جاؤں اور بس آپ کو سامنے بٹھا کر کھتی رہوں بالکل کسی داسی کی طرح۔“ بدر اس کی بے تابی پر محظوظ ہوا۔

”میں اس دفعہ تمہارے گھر والوں سے ملنا چاہتا ہوں ہمارے رشتے کی بات کے لیے۔“

”ابھی نہیں پلیز۔ افقی بولی۔

”کیوں۔“ بدر کی ابرو تن گئی۔

”ابھی حالات ہمارے حق میں موافق نہیں ہیں بدر۔ بھیا خاصے پریشان ہیں ان دنوں۔ بھیا اور بھیا بھی کے درمیان کشیدگی چل رہی ہے ایسے میں بھیا کوئی فیصلہ نہیں کر پائیں گے بہتر یہی ہے کہ تھوڑا صبر کر لیا جائے اور مناسب وقت کا انتظار کیا جائے۔ افقی نے اسے سمجھایا۔

”پچھلے چھ ماہ سے وہ مناسب وقت نہیں آرہا تمہاری زندگی میں افقی اور ادھر میں تڑپ رہا ہوں تمہاری ایک جھلک پانے کو۔ کمال ہے یا تم بھی حد کرتی ہو بے اعتنائی کی۔“ وہ حسب عادت جلد ہی ناراض ہوا۔ افقی نے اس گھامڑ کو دل ہی دل میں ایک عدد موٹی گالی سے نوازا اور بظاہر نرمی سے مسکرائی دفعتاً بولی آپکو صرف اپنی محبت اور بے تابی نظر آتی ہے بدر۔ میری تڑپ مجبوری اور بے کسی نہیں۔ میں اس زندان میں کتنی مشکل اور تکلیف دہ زندگی جی رہی ہوں صرف میں ہی جانتی ہوں۔ میری نمازیں لمبی اور سجدے طویل ہونے لگے ہیں ایک ہی دعا کی قبولیت مانگتے کہ جلد از جلد مجھے آپکا ساتھ مل جائے۔ اور آپ ہو کے ہر وقت مجھ پر مشکوک رہتے ہیں۔ بے حد افسردہ اور زوٹھا لہجہ اپنائے افقی نے بدر کو شرمندہ کیا تھا اسے اپنے الفاظ کی سنگینی کا فوری ادراک ہوا۔

”سوری جان۔ میرا مقصد تمہیں ہرٹ کرنا نہیں مگر تم خود سوچو دو سال سے ہمارا ریلیشن تب شروع ہوا ہوا ہے اور تم ان دو سالوں میں ایک دفعہ بھی اپنے بھیا بھیا بھی سے ہمارے رشتے کے لیے بات نہیں کر سکی ہو۔ وہ الجھا ہوا بولا یوں جیسے وہی طور پر انتشار کا شکار ہو۔

”دو سال سے ہم فقط اچھے دوست“ تھے بدر۔ پر پوز تو آپ نے مجھے چھ ماہ پہلے کہا ہے۔

افتی نے زروٹھے پن سے کہتے اس کی تصحیح کی تو بدرنا چاہتے ہوئے بھی مسکرا دیا۔

”چلو پر پوز چھ ماہ پہلے کیا تھا مگر محبت تو دو سال سے کرتا ہوں اس کا تو تمہیں پتا تھا پھر تم میری مزاج شناس ہو

تمہیں معلوم نہیں تھا کیا کہ میں تمہیں ہی اپنا شریک سفر چنوں گا۔؟“ وہ زریب مسکراتا شوخی سے کہتا بظاہر سنجیدہ تھا۔

”جی نہیں۔ مجھے غیب کا علم نہیں ہوتا۔ افتی کی ناک چڑھ گئی زروٹھے پن سے کہتے بدر کو اپنی ناراضی کا بخوبی

احساس بھی دلایا۔

”ناراض ہو گئی ہو۔“ وہ متبسم لہجے میں استفسار کر رہا تھا۔

”تو کیا ناراض ہونے کا“ ”حق“ ”صرف آپکو ہی ہے؟“ وہ جواباً سوال کر رہی تھی۔

”میں نے ایسا تو نہیں کہا۔ میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ تمہیں غصہ بالکل بھی نہیں کرنا چاہیے غصہ حسن کو کھا جاتا ہے

برباد کر دیتا ہے۔“ وہ مائل بہ شرارت تھا۔

”اچھا بس بس۔ اب زیادہ چکنی چیزیں باتیں نہ کریں۔ دل جلا کر زبردستی مسکرانے پر مجبور کرنا تو کوئی آپ سے

سیکھے۔“ افتی اپنی تعریف سن کے ٹھنڈی پڑتے ہوئے بظاہر ناراضی سے بولی۔

”یار۔ بس تمہیں پتا تو ہے کہ میں شارٹ ٹمپرز بندہ ہوں مگر بخدا میرا مقصد تمہیں ہرٹ کرنا نہیں ہوتا بس غصے

میں الٹا سیدھا بول جاتا ہوں تم دل پر مت لیا کرو پلیز۔“ اب کی بار وہ واقعی میں سنجیدہ تھا۔

”بدر۔ مجھے آپکا شک تکلیف دیتا ہے۔ میرا دل دکھتا ہے آپ کی بدگمانی پر۔ کیا میرا دل نہیں چاہتا کہ میرا خود کا

اپنا ایک گھر ہو جہاں مجھے سکون اور محبت کے ساتھ ساتھ آپ کا پیارا اور ساتھ ملے۔ ہمارا ساتھ ہماری خوشیاں دانگی ہوں اور

پائیدار ہوں۔ مجھے اس برزخ سے نجات مل جائے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ جہاں میری قدر ہو میری وفاؤں اور خدمتوں کا

اعتراف کیا جائے تاکہ مجھے اور میری ذات کو فخر گراں لیا جائے۔“ وہ جذباتی ہو کے رونے لگی تھی اداکاری میں تو خیر اسے

ملکہ حاصل تھا بدر کا دل بیچ گیا شرمندہ الگ ہوا۔

”پلیز افتی مت رو۔ میرا مقصد تمہارا دل دکھانا نہیں تھا میں بس اپنی تنہائی سے تنگ آ گیا ہوں یار۔ اکیلے رہتے

رہتے اب تھک گیا ہوں بارہ سال ہو گئے مجھے تمہارا رہتے ہوئے۔ بارہ سال کی تنہائی مجھے عمر قید لگتی ہے اب جب سے تمہارا

ساتھ ملا ہے میں تمہیں اپنی زندگی میں شامل کر کے اپنی زندگی ”جینا“ چاہتا ہوں اپنی تنہائی کو الوداع کہنا چاہتا ہو ہمیشہ کے

لیے..... ہاں بس میں تھوڑا جذباتی ہو جاتا ہوں اور پھر اپنی جذباتیت میں تمہیں بھی دکھی کر دیتا ہوں۔ پلیز میری محبت کی

خاطر ہی مجھے معاف کر دیا کرو تم۔“ وہ سچے دل سے معافی مانگ رہا تھا سچائی، کھرا پن اس کی خصوصیات تھیں۔

”آپ بالکل بھی شرمندہ مت ہوں بدر۔ آپکی شرمندگی مجھے تکلیف دے رہی ہے۔ میں آپ کی محبت سمجھتی بھی

ہوں اور اس کی قدر بھی کرتی ہوں بلکہ مجھے خود پر فخر محسوس ہوتا ہے کہ میں آپکی پسند ہوں اور آپ تو ہو ہی کامل اور یکتا دولہ

دو جاہت کے ساتھ ساتھ اتنا خوبصورت دل بھی رکھتے ہیں آپ کی خواہش تو ہر دوسری لڑکی کو ہوگی۔“ افتی نے کچھ اتنے

لو بصورت انداز میں اپنے دل کی بات بدر تک پہنچائی کہ وہ چند لمحے پہلی کی کلفت و بنجیدگی برطرف کیے دل سے افقی کی محبت پر فخر محسوس کرتے ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔ وہ خود صاف نیت کا کھرا بندہ تھا اسی لیے دوسروں کی نیت کو بھی ویسا ہی سمجھتا تھا۔

”اچھا بس میں نے تمہارے لیے کچھ شاپنگ کی ہے مگر میں مطمئن نہیں ہوا۔ اصل میں تمہیں پتہ تو ہے کہ مجھے لوا تین کی شاپنگ کرنے کا کوئی تجربہ نہیں ہے سو پلیز تم مجھے بتا دو کہ تمہیں کیا پسند ہے میں تمہارے لیے وہی خرید کر لے آؤں گا۔“ وہ بات بدلتے افقی کے پسندیدہ موضوع پر آ گیا۔

”بدر پلیز..... مجھے کچھ بھی نہیں چاہیے آپ کو ایک جھلک دیکھ لوں تو میرے لیے وہی مفت اقلیم کی دولت سے کم نہیں ہوگا۔“ دل میں پھونٹے لڈوؤں کو چھپائے بغیر اس نے عاجزی و محبت کا مظاہرہ کیا تھا بدر دلکشی سے سن کے مسکرایا۔

اور میں ہرگز بھی نہیں چاہوں گا کہ میں تمہیں خالی ہاتھ ملنے آؤں۔“ بدر نے افقی کو جواب کیا۔

”تو آپ خالی ہاتھ کہاں ہوں گے۔ اپنا ڈھیر سارا ٹائم اور محبت ہوگی ناں آپکے ہاتھوں میں میرے لیے.....“

اس نے اب کی بار بدر کو جواب کرتے ہوئے کہا۔

”باتوں میں میں تم سے نہیں جیت سکتا۔“ وہ گہری سانس لیتے جیسے ہار مانتے ہوئے بولا۔ افقی دل سے مسکرائی اپنی اسی خوبی پر تو اسے تکبر کی حد تک ناز تھا۔



بچوں کو سسلانے کے بعد وہ رضا کے پاس آئی تھی جو اپنے فوکل گلاسز لگائے نگالیں لیپ ٹاپ کی اسکرین پر جمائے بیٹھا بہت مصروف نظر آ رہا تھا۔

افقی نے نائٹ ڈریس پہن کر بالوں میں خوب ڈھیر سارا تیزیز برش پھیرا اور نائٹ کریم کا مساج چہرے پر کرنے کے بعد بیڈروم کی لائٹس آف کر دیں۔ رضائے لمحہ کے لمحہ نظریں اٹھا کر اسے دیکھا وہ جان گیا تھا کہ افقی کا موڈ اب آرام کرنے کا ہے اور وہ رضا کو بھی کام کسی طور نہیں کرنے دے گی۔

”پلیز یار ایک منٹ۔ رضا کے جب اچانک افقی نے آ کے فوکل گلاسز اتارے تو وہ بے ساختہ کہے بغیر رہ نہیں پایا تھا۔

”بالکل بھی نہیں۔ آدھ سکیئنڈ بھی نہیں سارا دن آفس میں کام ہی کرتے ہیں جناب گھر آ کے بھی اسی کام میں مصروف رہیں گے تو پھر ہم تو چلے ہی جائیں یہاں سے۔ نہ آپکو ہماری پرواہ ہے نہ ہی اپنی صحت کی۔“ وہ ناراضی سے منہ پھلائے کہہ رہی تھی اور رضا حسن شرارت اور مسکراہٹ کو باہم لیوں میں پیوست کیے اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنی محبوبہ بیوی کے محبوبانہ انداز میں بہت پیار آ رہا تھا اسے افقی کا یہی فکر مندانہ انداز بہت پسند تھا اس کا یہ انداز اس کی ساری کلفت و تھکاوٹ دور کر دیا کرتا تھا۔

”تم لوگوں کے لیے ہی تو اتنی محنت کر رہا ہوں یار۔“ آنکھیں ملتے رضائے آہستگی سے دل ہی دل میں اپنے بے حد تھکے ہونے کا اعتراف کرتے کہا۔ وہ واقعی میں بہت تھک چکا تھا بس زبردستی خود کو بٹاش کرنے کی کوشش میں کام

میں جتا ہوا تھا۔

”ہمیں ایسی سہولتیں اور آرام دہ زندگی ہرگز نہیں چاہیے رضا۔ جو آپ اپنی نیند اور آرام تنج کر ہمیں پہنچائیں ہم تھوڑے میں بخوشی گزارہ کر سکتے ہیں مگر آپکو انسان کی بجائے مشین بنا کر خود کو مصروفیات کے حوالے نہیں کر سکتے۔“ رضا اس کی پریشانی دیکھ کر بے حد ہلکا پھلکا ہو گیا۔

”میرا دل چاہتا ہے کہ میں تم لوگوں کی ہر خواہش پوری کروں دنیا بھر کی ہر آسائش تم سب کے قدموں میں لاکے ڈھیر کر دوں۔ تم شہزادیوں جیسی آن بان رکھنے والی میری بیوی ہی نہیں محبوبہ بھی ہو اور اتنے چھوٹا گھر میں رہنا تم ہرگز بھی ڈیزر نہیں کرتیں۔ افقی پہلے بھی جانتی تھی رضا حسن کی اپنی فیملی کے لیے پالی جانے والی خواہشات اور ان کی تفصیل۔ اس وقت تو اسے نیند آرہی تھی اور وہ اس قصے کو ختم کر کے سونا چاہتی تھی۔ تبھی بات کو سمیٹتے ہوئے بولی تھی۔

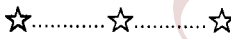
”میرا جو نصیب تھا اور جو میری اوقات تھی اس کے حساب سے میرے رب نے مجھے نواز دیا ہے اور میں اس کی رضا میں ہر آن خوش رہتی ہوں۔ اب پلیز اٹھ جائیے بہت نیند آرہی ہے صبح جلدی اٹھنا ہوتا ہے اور نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے پھر سارا دن میں کسمندی کا شکار رہتی ہوں۔“ رضا کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے اس نے بات ختم کی!

مگر رضا شاید بات ختم کرنے کے مود میں نہیں تھا۔

”تم دنیا کی سب سے اچھی بیوی ہو۔“ رضا نے والہانہ انداز میں اٹھ کے اس پر جھکتے اعتراف کیا تو وہ بے ساختہ ہنس دی۔ ایک پرفیکٹ بیوی۔ صورت سیرت میں کامل اور بھرپور وہ مزید شوخ ہوا تو افقی کو بدریا د آگیا وہ بھی تو یہی کہتا رہتا تھا۔

”ہم ایک پرفیکٹ کنبیل ہوں گے افقی..... دنیا والے ہمیں دیکھ دیکھ کے رشک کیا کریں گے جب ہم ایک ساتھ چلا کریں گے تو لوگ ہمیں کھڑے ہو کے دیکھا کریں گے“ افقی نے سر جھٹک کر خود کو کپڑو کیا۔

”کیا وہ اتنے پیارے دل کو توڑ سکتی ہے۔ افقی نے اپنے اندر گونجتے سنائے سے سوال کیا۔“



کچھ دن اس کی یہی کیفیت رہی اس پر عجیب سی یاسیت اور ملال طاری رہا۔ بدرا ب بھی ویسے ہی سارا سارا دن آفس ٹائمنگ کی پرواہ کیے بغیر اسے کالز کرتا مگر وہ ٹھیک طرح سے اس سے بھی بات نہ کر پاتی تھی ایک عجب سا احساس اس کے ارد گرد گھیراؤ ڈالنے لگا تھا۔ وہ اپنی کیفیات خود بھی سمجھ پارہی تھی۔ رضا نے اس کی گھر بچوں اور خود میں عدم دلچسپی دیکھی تو استفسار کیا بے اسے جیسے تیسے کر کے مطمئن کر ہی لیا تھا۔ مگر یہ ایک وقتی فیئر تھا بہت دنوں کی سوچ بچار کے بعد وہ ایک فیصلے پر آ کے مطمئن ہو گئی تھی اور پھر پہلے جیسی افقی بن گئی تھی وہ ایک اچھی کہانی کا تھی۔ کہانی کو کس وقت کونسا اور کیا موڑ دینا ہے اس کے زرخیز ذہن میں سارا لائحہ عمل واضح اور مکمل تھا۔ وہ فطرتاً خود غرض اور خود پسند تھی سوا احساسات بہت کم وقت کے لیے اس پر حاوی رہ پاتے تھے رضا حسن اسے پہلے جیسی افقی بنا دیکھ کے مطمئن ہو گیا۔ بدرا لگ خوش تھا وہ آجکل کراچی آنے کی تیاری میں مصروف تھا۔ وہ افقی سے ملنے آرہا تھا۔ جو اس کی زندگی کی پہلی خواہش تھی۔ ایک ایسی لڑکی جس کے ساتھ اس

لے زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ زندگی جینا چاہتا تھا خوش رہنا چاہتا تھا خوشیوں کے ہنڈولے میں افقی کے ساتھ جھولنا چاہتا تھا۔ وہ ایک کامیاب ازدواجی زندگی بسر کرے گا وہ ایک اچھا اور ذمہ دار حساس شوہر ثابت ہوگا وہ اپنے والدین جیسی زندگی نہیں گزارے گا اس نے سوچ لیا تھا۔ وہ اپنے والدین کی طرح کبھی بھی اونچی آواز میں جھگڑا نہیں کریں گے۔ بچوں کے سامنے تو بالکل بھی نہیں۔ وہ بالکل بھی گھر کو آفس کی ذمہ داریوں میں مگن ہو کے بھولے گا نہیں۔ وہ کام کو صرف آفس میں کرے گا۔ گھر پر سارا وقت افقی اور بچوں کے لیے رکھے گا۔ وہ خود ایک بروکن فیملی کا حصہ تھا اور اپنی ذات کے اندر دیرہ ال کے بیٹھی ساری محرومیوں کو اپنے بچوں کی تمام حسرتیں پوری کر کے ختم کرے گا۔ مستقبل کی ساری خواہشیں سارے ثواب اس نے پلکوں کی مانند اپنی آنکھوں میں سجالیے تھے وہ خواب کراچی آ کے اسے افقی کی مانگ میں سجانے تھے۔ صرف وہی اس بھری دنیا میں مخلص اور خالص لڑکی تھی جو ان خوابوں کو سینت کر رکھ سکتی تھی۔ جو ان خوابوں کی قدر کر سکتی تھی جو اسے ایسی ہی زندگی فراہم کر سکتی تھی جیسی زندگی وہ خود اپنے بچپن میں اپنے والدین کو گزارتا دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا افقی اس کے خوابوں سے واقف ہے اس کے دل سے بھی اور اس کی محرومیوں سے بھی۔ وہ اسے نا اُمید نہیں کر سکتی تھی بدر کے خیال میں وہ اسے مایوس کرنے کا سوچ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ بہت اچھی تھی دنیا کی سب سے پیاری لڑکی جو خود غرض بھائی بھائی کے در پر پڑی ان کی نوکری کر رہی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے مخلص ساتھی و ہمدرد تھے دونوں ہی اپنی اپنی زندگی سے دکھی تھے خوشیوں سے محروم تھے اور وہ دونوں ایک دوسرے کو خوش رکھ سکتے تھے یہ بدر کا ذاتی خیال تھا جو روز بروز پختہ یقین میں بدل رہا تھا۔ وہ افقی سے محبت کرتا تھا۔ اور محبت کی تمام حدیں پار کر چکا تھا۔

☆.....☆.....☆

اس نے پارکنگ میں گاڑی پارک کرتے ہی افقی کو کال ملائی تھی۔ لبرٹی میں حسب معمول بہت زیادہ رش تھا وہ یہاں افقی کے لیے شاپنگ کرنے آیا تھا۔ ساری دنیا خوش تھی کیونکہ وہ خود خوش تھا۔ اس کا دل چاہتا وہ ایک ایک بندے کو پکڑ پکڑ کرتا ہے کہ افقی نے اس سے شادی کے لیے ہاں کر دی ہے۔ اسے پروپوز کرنے کے لیے کراچی بلارہی ہے۔ اس نے سیل فون کان سے ہٹا کے دیکھا بیل جا رہی تھی مگر افقی کال نہیں پک کر رہی تھی۔ وہ یونہی فون کان سے لگائے ایک بوتیک میں داخل ہو گیا تھا سارے شوخ رنگ جیسے اس بوتیک میں تو س قزاح کی مانند جمع ہو گئے تھے۔ بدر کو لگا ہر رنگ مسکرا مسکرا کر اسے اپنی جانب راغب کر رہا ہے کہ دیکھو میں کتنا شوخ ہوں میں افقی کے تن پر دوسرے رنگوں کے مقابلے میں زیادہ

میں گلابی مسکرا دیا۔

سارے رنگ مسکرا دیئے۔ بدر نے وہ تمام شوخ رنگ پیک کر والیے تھے۔ اور سیل فون کان سے ہٹا کے جیب میں رکھ لیا حالانکہ وہ افقی کو فون کر کے اس کی پسندنا پسند پوچھنا چاہتا تھا وہ اس کے لیے وہ سب خریدنا چاہتا تھا جو اسے پسند تو تھا مگر اس سب چیزوں کے لیے افقی کو پیسے نہیں ملتے تھے۔ کپڑے۔ میچنگ جیولری جوتے پرفیومز اس نے اپنے کریڈٹ کارڈ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اعلیٰ برانڈ کی ساری چیزیں خریدی تھیں آپ نے خواہواہ اتنا محکف کیا بدر۔ میں وہ ساری چیزیں آپ کی خوشی کی خاطر اگر آپ سے لے بھی لوں تو استعمال نہیں کر پاؤں گی۔ میں گھر میں کیا بتاؤں گی کہ مجھے کس نے

یہ سب چیزیں گفت کی ہیں۔“ افقی نے بدر کے اندازے کے مطابق ویسے ہی کہا تھا جیسا اس نے سوچا تھا بدر اپنے ٹھیک اندازے پر مسکرایا افقی کے معاملے میں اس کے سارے اندازے ساری سوچیں ہمیشہ درست ہوا کرتی تھیں۔

”آپ ہنس کیوں رہے ہیں؟“ وہ شاکی ہوئی وہ اور بھی مسکرایا۔

میں وہ ساری چیزیں تم پہن کر میرے پاس مجھ سے ملنے آیا کرو گی“ بدر نے تصور میں اسے اپنے من پسند روپ میں سجا سنورا دیکھ کر کہا تھا۔

”مگر میں کیسے مل پاؤں گی روز آپ سے۔ میرے لیے روز گھر سے نکلنا بہت مشکل ہو گا بدر۔“

”تو سعدیہ کس روز تمہارے کام آئے گی۔ ایسے وقت میں تو دوست ہی کام آیا کرتے ہیں۔“ بدر نے لا پرواہی سے کہتے افقی کو نئی راہ سمجھائی تھی۔ بدر کے مشورے پر افقی دل کھول کے ہنستی تھی بروقت اس نے بہت اچھا مشورہ دیا تھا۔

”آپ کے اوپر میرے درمیان جو رشتہ ہے اس کی خبر میں نے کبھی ہوا کو بھی نہیں لگنے دی۔ پھر سعدیہ تو۔ بھابھی کو بھی جانتی ہے میں روز اس سے بھی ملنے کے لیے نہیں آتی اور اگر بھابھی نے سعدیہ سے پوچھ لیا تو وہ صاف کہہ دے گی کہ میں اس سے ملنے کے لیے نہیں آئی“ افقی مکمل کردار میں ڈوبی ہوئی تھی دل و دماغ کی منتشر سوچوں کو کبھی بھی اس نے لہجے سے عیاں نہیں ہونے دیا تھا۔

”تو تم سعدیہ کو اپنے راز میں شریک کر لوں۔ ان فیکٹ کل کو جب میں اپنا رشتہ لے کر تمہارے گھر آؤں گا تو سعدیہ کے توسط سے ہی ناں۔ سعدیہ مجھے اپنے جاننے والوں کے توسط سے تمہارے گھر والوں سے ملوائے گی تبھی تو وہ لوگ مانیں گے ورنہ تو تم خود ہی کہتی ہو کہ تمہارے بھیا کبھی بھی تمہاری پسند سے تمہیں نہیں بیاہیں گے۔“ افقی نے اس کی پوری بات سن کے اپنے گھومتے دماغ کو بے شکل کنٹرول کیا وہ اگر ذہین یا چالاک تھی تو بدر بھی کم نہیں تھا وہ دنیا اور دنیا داری کا شعور رکھتا تھا افقی کو یہ بات کم از کم بھولنی نہیں چاہیے تھی۔

”واہ جی۔ کیا کہنے آپ کی ذہانت کے۔ میں تو معترف ہو گئی کیا فول پروف پلاننگ کی ہے آپ نے.....“

دانت کچکپاتے بظاہر اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو بدر دلکشی سے مسکراتے ایک کان سے سیل فون دوسری جانب منتقل کرتے ہوئے بولا تھا۔

”ہاں تو ٹھیک ہے ناں۔ کھی اگر سیدھی انگلیوں سے نہ نکلے تو مجبوراً انگلیاں ٹیڑھی تو کرنی ہی پڑتی ہیں ناں۔“

اس کے انداز میں لا پرواہی تھی۔

”ہاں یہ بات بھی ہے۔“ افقی نے تائید کی۔

”تو پھر ڈن ہوا ناں کہ سعدیہ کے گھر آنے کا بہانہ کر کے تم مجھ سے روز ملو گی۔ ٹھیک ہے ناں۔“ وہ بہت آس سے پوچھ رہا تھا۔

”کوشش تو پوری کروں گی۔ افقی نے اپنے زرخیز ذہن میں بہانے تراشتے بے توجہی سے کہا تھا وہ کوئی ایسا بہانہ

سوچ رہی تھی جو رضا حسن کو مطمئن کر سکے۔

☆.....☆.....☆

”خیریت تو ہے ناں تم نے مجھے اتنی ایمر جنسی میں کیوں بلایا۔“ اتنی شدید گرمی میں ہانپتی کا ہنپتی سعدیہ اس کے فلیٹ تک پہنچتے ہی پھٹ پڑی تھی۔ افقی اسے دیکھ کے مسکرائی۔

”بٹھو تو سہی۔“ اس نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”میری تو مت ماری گئی اتنی سڑھیاں چڑھ چڑھ کے آخر تمہارے فلیٹ کی لفٹ کب ٹھیک ہوگی۔“ ماتھے پر آیا پسینہ صاف کرتے ہوئے اس نے ناگواری سے پوچھا تھا وہ خود ڈیفنس میں رہتی تھی سو وہاں ایسی صورتحال کم ہی پیش آرہا کرتی اور اگر آتی بھی تو چند گھنٹوں میں ہی اس کو حل کر دیا جاتا تھا۔

”پتہ نہیں یار۔ میں تو خود اس صورتحال سے بہت تنگ ہوں عبداللہ کو اسکول لینے جانے کے لیے کم از کم مجھے ڈیڑھ سوسڑھیاں چڑھنا اترنا پڑتی ہیں۔“

”پھر رضا بھائی بے چارے تو صبح کے گئے جب تھکے ہارے گھر آتے ہوں گے تو دماغ کا تو وہی بن جاتا ہوگا ظاہر ہے کراچی کی بے ہنگم ٹریفک سے نبرد آزما ہونے کے بعد ڈیڑھ سوسڑھیاں چڑھ کے آنا خاصے جگر کا کام ہے۔“ سعدیہ نے اس کے ہاتھ سے ٹھنڈی ٹھار کوک کا گلاس پکڑ کر سپ لیتے افسوس سے کہا تو افقی کھلکھلا کے ہنسی تھی سعدیہ نے اس کی ہنسی کو تعجب سے دیکھا۔

”وہ تو عادی ہیں یار..... بلکہ وہ تو جب تک گھر پہنچتے ہیں بس اتنے فریش ہو جاتے ہیں کہ چہرے پر تھکن کا شائبہ ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا۔“

”اچھا۔ سعدیہ متاثر ہوئی اس کا مطلب ہے خاصے ہارڈ ورکنگ ہیں رضا بھائی افقی نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلاتے تائید کی تھی حالانکہ اگر وہ جان پاتی تو اسے احساس ہوتا کہ رضا شاید محنت کا عادی نہیں تھکتا وہ بھی ہے ہاں اس کی تھکن اپنے بیوی بچوں کو دیکھ کر ختم ہو جاتی ہے وہ انہیں سرور دیکھ کے فریش ہو جاتا ہے۔ مگر سمجھنے کے لیے من کی آنکھ چاہیے ہوتی ہے جو کہ افقی کے پاس فی الحال موجود نہیں تھی۔

”خیر تم بتاؤ۔ اتنی ایمر جنسی میں مجھے کس لیے بلایا ہے؟“ کوک کا ٹھنڈا ٹھار سپ اپنے اندر اتارتے اس نے پوچھا تو افقی انگلیاں مرڑوٹے الفاظ ترتیب دینے لگی۔

”مجھے جو بات تم سے کہنی ہے سعدی۔ پلیز بر امت ماننا اور نہ ہی مجھے غلط سمجھنا۔“

”ایسی بھی کیا بات ہے جو تم اتنی تمہید باندھ رہی ہو؟“ سعدیہ کو حیرت ہوئی کیونکہ وہ لگی لپٹی رکھے بغیر بات کرنے والی تھی۔

”بدرمجھ سے ملنے کے لیے آرہا ہے۔ اور مجھے تمہاری مدد چاہیے۔“ سعدیہ اس کی بے ربط سی بات پر استفہامیہ نگاہوں سے اسے پس دیکھ کر رہ گئی۔

”یہ بدر کون ہے افقی۔ اس کی آنکھوں میں بھی واضح سوال تھا۔

”بدر میرا دوست ہے لاہور میں رہتا ہے اور۔“ افقی ایک مرتبہ پھر گڑبڑائی کتنا مشکل تھا اس کا تعارف کروانا۔
بلکہ ایسا کوئی بھی تعلق جو معاشرے کی نظر میں آپکو معتبوب ٹھہرا دے مشکل ہی ہوا کرتا ہے۔

”کھل کے کہو امتین حیدر۔ یہ بدر صاحب کون ہیں اور تمہارا ان کے ساتھ کیا تعلق ہے۔“ سعدیہ نے اسے
جانچتی نگاہوں سے دیکھتے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا تھا وہ اس کی بچپن کی دوست تھی سواس کی تمام عادات سے واقفیت
رکھتی تھی۔

”پچھلے سے پچھلے سال جب میں تمہارے گھر آئی تھی تب زبیدہ آنٹی (سعدیہ کی ہمسائی) کے گھر سے نکلتے
ہوئے ہماری مختصر ملاقات ہوئی تھی تب اس نے مجھے اپنا نمبر دیا تھا۔ ہمارا رابطہ ہو گیا اور پھر دوستی گہری دوستی۔ اور اب وہ مجھ
سے ملنے کے لیے یہاں آ رہا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ جتنے دن یہاں رہے ہیں اس سے روز ملوں۔“
”تو.....“ سعدیہ نے اسے رکتے دیکھ کر پوچھا۔

”سعدیہ پلیز۔ آخری بار پلیز میری مدد کر دو۔ اس کے بعد میں یہ قصہ ہی ختم کر دوں گی۔“ وہ لجاجت سے کہتی
اس کے پاس آ بیٹھی سعدیہ نے اسے تاسف سے دیکھا۔
”کالج والی حرکتیں ابھی تک نہیں چھوڑیں تم نے.....“

”وہ صرف میرا دوست ہے لیکن.....“ افقی ایک مرتبہ پھر گڑبڑائی کیا کہتی ایک شادی شدہ دو بچوں کی ماں کے
لیے ایسے کسی بھی تعلق کا تعارف اس کو کس قماش کی عورت ظاہر کر سکتا ہے وہ اچھی طرح سے جانچتی تھی مگر سمجھتی نہیں تھی۔
”رضا بھائی کی محبت میں کہاں کمی رہ گئی تھی افقی کہ تم نے ایسے چور دروازے ڈھونڈ لیے۔“ سعدیہ نے تاسف
سے کہتے اسے ڈانٹا مگر افقی بُرا مان گئی۔

”یا تو میری پوری بات سن لو یا پھر مجھے لعن طعن کر لو.....“ وہ ٹھیک ٹھاک ناراض ہوئی۔
”اچھا ٹھیک ہے بولو۔“ سعدیہ نے اسے بُرا ماننے دیکھ کے ہتھیار پھینکے ویسے بھی اپنے عمل کا ہر بندہ خود ہی ذمہ
دار ہوتا ہے اس کا کام سمجھانے کی کوشش کرنا تھا اگر سامنے والا نہ سمجھے تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔
”وہ بہت آگے نکل چکا ہے سعدی۔ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے لیکن تم جانتی ہو کہ وہ نہیں جانتا کہ میں میریڈ
ہوں نہ ہی میں اس کی خاطر رضا کو چھوڑ سکتی ہوں اس لیے میں نے سوچا ہے کہ اسے کسی نہ کسی طرح سے انکار کر کے خود کو
بھولنے پر مجبور کر دوں۔“

”تو تمہیں لگتا ہے کہ تم اسے خود کو بھولنے کے لیے کہو گی اور وہ بھول بھی جائے گا۔“
”تھوڑا مشکل تو ہو گا مگر میں اپنی پوری کوشش سے سارا معاملہ ہینڈل کر لوں گی اس میں مجھے تمہاری تھوڑی سی
ہیلپ چاہیے ہو گی۔“

”اور مجھے کیا کرنا ہو گا؟ اس نے بے حد سنجیدگی سے استفسار کیا۔

”وہ میں تمہیں وقت آنے پر بتاؤ گی۔ تم ابھی پلینز آٹھ روز کے لیے بیمار ہو جاؤ۔“

افقی نے اس کی ٹھوڑی چھوتے منت کے سے انداز میں کہا۔

مطلب۔ افقی اس کے پاس بیٹھی اب مطلب سمجھا رہی تھی۔

”تمہیں ڈر نہیں لگتا افقی اگر رضا بھائی یا کسی اور کو پتہ چل گیا تو۔“ ساری بات سننے کے بعد اس نے افسردگی سے

اس نا عاقبت اندیش لڑکی کو دیکھتے پوچھا تھا جو اس کی بات سن کے کھلکھلائی تھی۔

ڈر کیسا۔ میں کونسا سیریس ہوتی ہوں یار۔ بس ٹائم پاس۔“ اس نے لا پرواہی سے کہتے کندھے اچکائے۔

”کبھی کبھار ٹائم پاسنگ زندگی کا روگ بن جاتے ہیں افقی یہ آگ کا کھیل ہے جسے تم بلا خطر کھیل رہی ہو یہ آگ

تمہارے آشیانے کو بھی جلا سکتی ہے۔“

”خدا کا نام لو یار۔ کیوں ڈر رہی ہوں مجھے..... کچھ نہیں ہو گا میرے گھر کو۔ رضا مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں

ماری زندگی بہت اچھی گزر رہی ہے۔“ افقی نے کانوں کو ہاتھ لگا کے ڈرتے ہوئے اسے ڈانٹا تھا سعدیہ افسردگی سے سر ہلا

کے رہ گئی۔

”کب آ رہا ہے بدر۔“ سعدیہ نے اسکی بات کو نظر انداز کرتے اگلا سوال پوچھا۔

پرسوں شام کی فلائٹ ہے تم پلینز پریشان مت ہو۔ ایک آخری بار اس کے بعد میں بدر کا قصہ ہی ختم کر دوں گی۔

ظاہر ہے میرے بھیا بھیا بھی نہیں مانیں گے میری برادری سے باہر شادی پر اور وہ زبردستی میرا رشتہ کہیں بھی طے کر سکتے

ہیں۔“ افقی نے شرارت سے کہتے ہوئے کندھے اچکائے انگلیاں مروڑتے سعدیہ کو آنکھ ماری سعدیہ اس کی بات سن کے

ناچا پتے ہوئے بھی مسکرا دی اگر وہ لکھتی تو یقیناً ”ایک نامور مصنفہ ہوتی اداکار ہوتی تو خوب نام کماتی مگر وہ حقیقت میں رنگ

بھرا پسند کرتی تھی فقط فینسی میں نہیں جیتی تھی۔

☆.....☆.....☆

”کیسے ہو عامر!“ افقی نے ایک عرصے کے بعد عامر کو کال کی تھی عامر حیران ہوا کیونکہ افقی کسی وجہ کے اسے کال

نہیں کیا کرتی تھی۔

”ٹھیک ہوں۔ آپ کسی ہو۔؟“ اس واقعے کے بعد سے عامر ذرا محتاط ہو گیا تھا لہجے میں ایک فطری جھجک آپ

نی آپ در آئی تھی۔

”میں تھوڑا سا پریشان تھی“ اور تو کوئی ہے نہیں ایسا جو میری پراہم سمجھ سکے اس لیے سوچا کہ تمہیں کہہ دوں۔ تم

ایٹ لیٹ مجھے سمجھتے ہو۔ افقی نے بڑی آس و امید سے لہجے میں حسرت سی پیدا کرتے ہوئے کہا تھا عامر کھل اٹھا بالکل

ویسے جیسے پہلے کھول اٹھتا تھا وہ آج بھی افقی کا مطیع تھا افقی باخبر تھی اور اکثر اس بات کا ناجائز فائدہ اٹھایا کرتی تھی۔

”کیوں نہیں آپ حکم کریں افقی..... آخر میں کس دن آپ کے کام آؤں گا۔“ وہ فوراً بچھا افقی اس کی سعادت

مندی دیکھ کر مسکرائی۔

”بہت شکریہ عامر۔ تم سچ میں بہت اچھے ہو میں تمہاری دل سے قدر کرتی ہوں۔“

”خیر یہ بات تو آپ نہ ہی کریں اگر میری قدر ہوتی تو ویسا سلوک نہ کرتیں میرے ساتھ اور میری محبت کے ساتھ۔“ اتنے عرصے سے دبا شکوہ آج عامر کی زبان سے بالآخر پھسل ہی گیا تھا۔

”قدر کرتی ہوں تمہاری۔ اسی لیے تو تمہارا بھلا سوچتی ہوں ہمیشہ۔ تمہیں ابھی تک اس بات کی سمجھ نہیں آ پائی۔ آخر کب سمجھو گے اب تم ایک کامیاب پولیس آفیسر بن چکے ہو۔“ اس نے اسے ہولے ڈانٹا۔

”کیا پولیس لائن میں کام کر نیوالوں کا دل نہیں ہوتا فقی۔! عامر کا لہجہ ٹھہر کر گھمبیر ہو گیا مگر فقی کے لیے یہ صورتحال نئی ہرگز نہ تھی۔

”نہیں..... ان کے لیے دل سے زیادہ ان کا پیٹ اہم ہوتا ہے۔“ وہ شرارت سے کہتے آخر میں ہلکا سا مسکرائی تو

عامر بھی ہنس دیا۔

”ویسے تم نے پوچھا ہی نہیں کہ میں نے کال کس لیے کی تھی؟“ فقی نے اسے ٹریک سے ہٹتے دیکھ کر شکوہ کیا۔

”اوہ۔ آئم سوری کیا کروں آپ کے علاوہ کسی اور طرف دھیان جاتا ہی نہیں میرا۔“ وہ جیسے شرمندہ ہوا اور فقی توجہ بھر کر محفوظ ہوئی اس کے اندر براجمان خود پسند عورت کو مردوں کی اپنے لیے رکھی جانے والی حسرت اور بے بس بہت لطف دیا کرتی تھی۔

”مجھے کچھ پیسے چاہیے تھے۔ زیادہ نہیں بس دس ہزار رضا کی سیلری آتے ہی تمہیں لوٹا دوں گی۔ اصل میں پچھلے دنوں عبداللہ کی بیماری کی وجہ سے سارا بجٹ ڈسٹرب ہو گیا ورنہ میں تمہیں کبھی نہ کہتی۔“ لاجت سے کہتے فقی کا لہجہ آپوں آپ ہی شرمندہ ہو گیا۔

”کیسی باتیں کرتی ہیں فقی۔ میں کما کس لیے رہا ہوں اگر اپنوں کے ہی کام نہ آسکا تو پھر فائدہ۔ میں شام کو دے جاؤں گا آپ نیچے والے پارک میں آجائیے گا۔“

”اور پلیز رضا کو پتا نہ چلے۔ ورنہ وہ بہت ناراض ہوں گے۔“

”ڈونٹ وری۔ کسی کو کچھ پتہ نہیں چلے گا یہ بتائیں اور تو کچھ نہیں چاہیے آپکو۔؟“

وہ مؤدب سا پوچھ رہا تھا۔

”نہیں بس آتے وقت ڈومی نوز کا لارج سائز پیزا اور فریش جوسز لیتے آنا ہاں میرے موبائل کے دو کارڈز بھی۔ بس اور کچھ نہیں۔“ فقی نے احساس تشکر کا واضح والہانہ اظہار کرتے فون رکھ دیا تھا۔ عامر اس کے لیے ایک بلینک چیک کی حیثیت رکھتا تھا وہ جب چاہتی تھی من پسند رقم لکھ کر اسے کیش کروا لیا کرتی تھی۔ اور عامر ایسا پاگل کہ کبھی حساب کتاب رکھتا ہی نہ تھا۔

☆.....☆.....☆

نائٹ کریم کا مساج کرتے اس نے آئینے میں نظر آتے رضا حسن کے عکس پر طائرانہ نگاہ ڈالی اور کریم کا ڈھکن

بند کر کے رضا کے پاس آ بیٹھی رضا حسب معمول اپنے لپ ٹاپ پر مصروف تھا نگاہ اٹھا کے اس کے چاندی جیسے روپ کو دیکھا اور مسکرا دیا الفتی اسے بہت سنجیدگی سے دیکھ رہی تھی رضا حسن سمجھ گیا کہ اسے کوئی خاص بات کرنی ہے اس نے اپنا لپ ٹاپ شٹ ڈاؤن کیا اور مسکرا کر اپنی نصف بہتر کو دیکھا اور مسکرایا۔

”جی جناب۔ کہیے کچھ پریشان نظر آرہی ہیں“ وہ آنکھوں میں محبت کے دیپ روشن کیے مائل بہ شرارت اس کی طرف متوجہ ہوا الفتی نے سوچے سمجھے پلان کے مطابق ادکاری میں حقیقت کارنگ بھرنے کو انگلیاں چٹخائیں۔

”شام کو سعدی کی کال آئی تھی۔“ پریشانی الفتی کے لہجے سے بھی ترشح تھی۔ ”آجکل بہت بیمار ہے پچھلے چند دنوں سے میرا اس سے رابطہ نہیں ہو پایا اسی لیے مجھے پتہ نہیں چل سکا لیور پراہلم کر رہا ہے اور وہ آجکل بیزریٹ پر ہے۔“ الفتی نے آدمی ادھوری بات کرتے توقف کیا۔

”اوہ۔ ویری سیڈ اب کیسی ہے وہ؟ رضا حسن کو حقیقتاً دکھ ہوا۔

”فی الحال تو بیزریٹ پر ہے اور ستم بلائے ستم کہ ادھر ہے بھی بالکل اکیلی۔ اس کی ماما آجکل جرمنی گئی ہوئی ہیں اپنی بڑی بیٹی کے پاس اور واپسی کے لیے انہیں فلائٹ نہیں مل رہی۔ رضا۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو میں روز اس کے پاس چل جایا کروں۔ زیادہ نہیں بس چار پانچ گھنٹوں کے لیے۔“ وہ اٹھ کے رضا کے بالکل پاس آ بیٹھی اس کے گھٹنوں پر نرمی سے ہاتھ رکھتے اس نے متفکرانہ انداز سے اسے دیکھا۔

”مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے الفتی میں تو میچ کرلوں گا مگر بچوں کا کیا کروگی عبداللہ سکول جاتا ہے اسود ابھی بہت چھوٹا ہے اور دونوں بچے تو مل کے اودھم مچا دیتے ہیں ایسے میں تو سعدیہ اور ڈسٹرب ہوگی۔“

”میں ایسا کروں گی گیارہ بچے گھر کا کام ختم کر کے عبداللہ کو امی کے گھر چھوڑ دیا کروں گی اور اسود کو ساتھ لے جاؤں گی اور اسود ڈھائی سال کا ہے ابھی اتنا بھی نہیں چھوٹا کہ تنگ کرتا پھرے مجھے۔ رضا۔ سعدیہ میری بیسٹ فرینڈ ہے اور اسے اس وقت میری ضرورت بھی ہے۔“ الفتی نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہتے آس و امید سے رضا حسن کو دیکھا۔

”چلو ٹھیک ہے جناب۔ جیسے آپ کی مرضی ہم کون ہوتے ہیں آپ کی کسی بھی بات سے اختلاف کرنے والے۔“ رضا حسن نے ہتھیار پھینکنے والے انداز میں اس کی طرف مسکرا کر دیکھا وہ کتنے خوش قسمت تھے کہ اتنا درد مند دل رکھنے والی لڑکی ان کی شریک حیات تھی۔ الفتی خوشی کے مارے ان سے لپٹی تھی ابھی انہوں نے خود پر رشک کرتے سوچا تھا۔

☆.....☆.....☆

دوسرے روز اس نے صبح ہی گھر کا کام نہایت پھرتی سے پنپایا اور اسود کو تیار کر کے جلدی جلدی لاک لگا کر رضا کو فیکٹ کرتے گھر سے نکل آئی۔ بدر کو آج تین بجے کی فلائٹ سے کراچی آنا تھا اور وہ اس کے آنے سے پہلے ایک چکر پارلر کا لگانے کے ساتھ اپنے لیے کچھ شاپنگ بھی کرنا چاہتی تھی۔ راستے میں ٹیکسی لینے کے ساتھ ہی اس نے رضا کو اپنا سعدیہ کے گھر جانے کا بتایا اور سعدیہ کو جلدی تیار ہو کے اس کا انتظار کرنے کا فیکٹ سینڈ کرتے اسود کو امی کے گھر پر اس کی ضرورت کی تمام مطلوبہ اشیاء کا بیگ تھماتے چھوڑا کہانی وہی دہرائی جو رضا حسن کے سامنے دہرائی تھی وہ بہت شاطر لڑکی تھی

سوا سے اپنے بولے جھوٹ اور کی گئی غلط بیانیاں ہمیشہ یاد رہا کرتی تھیں۔ سوا اس کے منصوبے میں کوئی کمی یا کجی نہ رہے اس نے اسی کو بھی وہی کہا جو رضا کو بتایا تھا۔ تاکہ خدا نخواستہ اگر رضا کا رابطہ امی جان سے ہو بھی تو وہ اسے وہی بتائیں جو رضا جانتا ہو۔ طارق روڈ اور زمزمہ کی بوتیکس چھان کر اس نے اپنے لیے دو بہترین جوڑے خریدے۔ سینڈلز اسکے پاس پہلے ہی بے شمار تھیں۔ اتنا سب کچھ کس لیے خرید رہی ہو۔ تمہارا ردیو لے کے آتو رہا ہے اتنا کچھ.....“ سعدیہ نے حیرت سے اسے اپنے لیے خریداری کرتے دیکھ کر پوچھا تھا۔

”تو کیا اس کے تحفے کے انتظار میں ہی رہوں کیا۔ اور کیا پتا وہ کیا لائے اور میں کیا ندیدوں کی طرح وہ سب چیزیں فوراً استعمال کر لوں گی کیا.....“ افتی نے قدرے زوٹھے سے سعدیہ کو ڈپٹا۔

”ہاں۔ ہاں تمہاری ظالم بھابھی تو تمہیں سب پہننے نہیں دیں گی۔ سوال و جواب کریں گی کہ کس نے کروائی یہ اتنی مہنگی شاپنگ۔“ بات کے اختتام پر خود ہی قہقہہ لگائے ہنس پڑی تھی۔

اب ظاہری بات ہے سعدی۔ رضا کو بھی حیرت تو ہو گی کہ میں نے اتنا سب کچھ کہاں سے لے لیا جبکہ ابھی تو انہوں نے خود ہی مجھے پچھلے دنوں چار جوڑے دلوائے تھے وہ بھی اپنی پسند کے۔ اور نہ ہی تم اتنی دیا لو کہ تمہارا نام برملا لے سکوں۔“ آخر میں اس نے ”تم“ پر زور دیتے سعدی کو پھینکا تھا۔ وہ دونوں اس وقت ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھی تھیں بچوں کا کیا کر دو گی۔ انہیں کس کے پاس چھوڑ دو گی؟ سعدیہ نے برگرا کا پس تو ذکرِ منہ میں رکھتے اچانک یاد آ جانے پر پوچھا تھا۔

”عبداللہ کو امی جان اسکول سے لے لیا کریں گی اور اسود کو تم اپنے پاس رکھو گی۔“ افتی نے مزے سے بتایا مگر سعدیہ کو تو جیسے اچھوڑ گیا۔

”دماغ ٹھیک ہے تمہارا۔ بچے پالنے کا مجھے کوئی تجربہ نہیں کم از کم۔ پھر اسود تو مجھے پہچانتا بھی نہیں ایک لمحہ بھی نہیں نکلے گا میرے پاس۔“ سعدیہ نے افتی کی خوشی نہی دور کی۔

”یار۔ وہ بہت ناکس بچہ ہے بالکل بھی تنگ نہیں کرتا رہ جانے کا تمہارے پاس۔ افتی نے بے زاری سے اس کی طرف دیکھا اسے اچھا نہیں لگا کہ تھا سعدیہ کا آنا کالی کرنا۔

”افتی ڈیر۔ اسود مجھے بہت عزیز ہے مگر خود سوچو میں اسے اپنے پاس رکھ لینے سے انکاری نہیں ہوں۔ مگر تم خود سوچو وہ مجھ سے بالکل بھی ہلا ہوا نہیں۔ ڈھائی سال کا بچہ بڑا ہی کتنا ہوتا ہے۔“ سعدیہ نے افتی کے ہاتھ پر اپنا نرم ہاتھ رکھتے اسے نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی۔

”تو پھر کیا کروں یار۔ اسود تو بڑا مسئلہ کر رہا ہے اسے ساتھ نہیں لے جاسکتی۔ بہت باتیں کرنے لگا ہے پھر مجھے وہ ماما پکارے گا تو بدر کے سامنے میرا پول کھلنے میں لمحہ بھی نہیں لگے اور میں اس کہانی کو خوب صورت موڑ دے کر ختم کرنا چاہتی ہوں۔!“ وہ حقیقتاً پریشان ہوا غمی تھی۔

”اچھا ٹھیک ہے تم پریشان مت ہو۔ میں اپنی پوری کوشش کروں گی۔ تم یہ بتاؤ تمہارا ردیو کب تک آجائے گا کیا تم خود اسے ایر پورٹ لینے جاؤ گی۔؟“ برگر ختم کرنے ہی کو کہ کا بڑا ڈسپوزیبل پیپر گلاس اٹھا کر اس نے منہ سے لگاتے کہا

تھا میر ساری کی کرہڈ برف پیپی کے ساتھ اس کے منہ میں گئی تھی اسٹراوہ استعمال نہیں کرتی تھی۔ افقی نے برا ساختہ بنا کے اس کی ال میزڈ حرکت کو دیکھا۔

”شام کو چھ بجے پہنچ جائے گا اور میں کیسے جاسکتی ہوں اسے ریو کرنے۔ رضا پانچ بجے گھر آ جاتے ہیں بار.....“ افقی نے اس طرح دل گرنگی سے کہا گویا اسے بدر کو پک نہ کرنے کا بہت افسوس ہو چیسے۔“ اور ایسا کچھ غلط بھی نہیں تھا۔

☆.....☆.....☆

”تمہارے شہر کی فضا میں سانس لے رہا ہوں اٹھیں حیدر.....! وہ رضا کو کافی بنا کے دے رہی تھی جیسی اسے بدر کا فیکٹ موصول ہوا افقی مسیح پڑھ کے مسکرائی۔

”تھی تو فضا میری سانسیں معطر کر گئی ہے“ مسکراتے ہوئے اس نے جواب لکھا اور بدر نے مسکراتے ہوئے ہی اس جواب کو پڑھا تھا وہ کھل کے مسکرایا اور جی بھر کے مسکرایا۔ محبت کا جواب وہ محبت سے ہی لینے کا قابل تھا اور اس معاملے میں افقی نے اسے ہرگز بھی مایوس نہیں کیا تھا۔ وہ اپنی محبت کو اپنے سامنے دیکھنے کے لیے بے تاب تھا ابھی کل ملنے میں ایک رات باقی تھی اور وہ ایک رات بدر پر بہت بھاری تھی! ہمارے ملنے میں ابھی پندرہ گھنٹے کا طویل وقت ہے افقی اور یہ وقت مجھ پر پندرہ صدیوں کی طرح بھاری ہے جو گزرنے میں ہی نہیں آ رہا ہے“ اگلا مسیح پڑھ کے افقی مسکرا نہیں سکی بدر کی والہانہ بے تابی کو عیاں کرتا یہ مسیح افقی کو سن کر گیا تھا لمحہ بھر کو ہی سہی اس نے خود کو لا جواب اور بے بس محسوس کیا تھا۔

”کب صبح ہوگی اور کب میں تمہیں دیکھ پاؤں گا میں اپنی زندگی کی ہر صبح اٹھنے کے بعد سب سے پہلے تمہارا چہرہ دیکھنا چاہتا ہوں۔“ اگلا مسیح واضح انداز میں افقی کی جان فنا کر گیا بدر اپنے جذبات کی ترجمانی کرنے میں ذرا بھی نہیں جھجکتا تھا افقی نے مختصر لکھ بھیجا۔

”صبر“

”صبر کا پھل بہت پیٹھا ہوتا ہے میں جانتا ہوں مگر صبر بہت طویل اور صبر آزما بھی تو ہوتا اور کبھی کبھی جان لیوا بھی۔“ باتیں بنانے میں تو اسے ملکہ حاصل تھا بنے بنائے جوابات اس کے ذہن کی پٹاری میں ہمہ وقت موجود رہا کرتے تھے۔

”اُف۔ افقی بے ساختہ ہنسی بس کر دیں کیوں مجھے زلزلے پر تلے ہوئے ہیں“

مسیح سینڈ کر کے اس نے کافی کا تیار کپ رضا کو جا کے پکڑا یا جو حسب معمول اپنے لیپ ٹاپ پر مصروف تھا افقی کو کبھی اچھا نہیں لگا تھا گھر آنے کے بعد اس کا آفس کے کام کرنا مگر آج اسے بے حد اچھا لگا تھا وہ رضا کی موجودگی میں بدر سے فون پہ بات نہیں کر سکتی تھی مگر مسیح تو کر سکتی تھی ناں۔“ وہ کچن میں واپس آئی تو بدر کا رپلائے آچکا تھا اللہ نہ کرے کہ کبھی مہری وجہ سے تمہاری آنکھوں میں آنسو آئیں۔ وہ دن میری زندگی کا تاریک دن ہوگا۔ افقی نے اس مسیح کو پڑھا اور جواب لکھا۔

”اگر کبھی میری وجہ سے آپ ہرٹ ہوئے تو؟“ اس نے سوال کیا تھا مگر بدر نے اسے محض ایک سوال ہی سمجھا تھا۔

”تو وہ دن میری زندگی کا آخری دن ہوگا۔“ اور بدر جانتا ہے کہ اس کی افقی اسے کبھی ہرٹ نہیں کر سکتی محبتوں میں میں شدتوں کا قاتل ہوں افقی۔ محبت میرے لیے صرف ایک جذبہ نہیں بلکہ پوری زندگی ہے جنون ہے۔ بدر نے نجانے ایسا کیوں لکھ کے بھیجا تھا وہ مسیح سینڈ کر کے خود بھی حیران ہوا حالانکہ اس نے تو محض ایک سوال پوچھا تھا وہ محض اس سوال کا ویسا ہی سادہ جواب کیوں نہیں دے پایا تھا۔ وہ حیران تھا۔

”آپ تھک گئے ہوں گے ابھی آرام کریں صبح پھر ملتے ہیں۔“ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ افقی کے اگلے صبح نے اسے رات گہری ہونے کا احساس دلایا تھا وہ واقعی تھکا ہوا تھا افقی سے ملنے کے لیے اسے واقعی نیند کی ضرورت تھی تاکہ صبح فریش اٹھ سکے!

☆.....☆.....☆

”آج میں واپسی پر آؤں گا سہیہ کا پیہ کرنے ساتھ ہی تمہیں بھی پک کر لوں گا ناشتے کی میز پر رضا حسن نے افقی سے کہا تو چائے کی پیالی اس کے ہاتھ سے گرتے گرتے پٹی۔

”ارے۔ آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں میں خود ہی آ جاؤں گی آپ کے آنے سے بھی پہلے؟ شکر ہے رضانا افقی کو پہلے ہی بتا دیا تھا اگر اچانک رضا وہاں اس سے ملنے کے لیے پہنچتا تو وہ کیا جواب دے پاتی وہ تو پکڑی جاتی۔

”چلو ٹھیک ہے پھر سہیہ کی میری طرف سے بھی خیریت دریافت کر لینا۔ اور شام کا تکلف مت کرنا میں آتے ہوئے بازار سے کچھ لیتا آؤں گا۔“ اٹھتے سے انہوں نے افقی کے آرام کے خیال سے کہا تھا۔

”لیکن میں بنالوں گی رضا..... بس چار پانچ گھنٹوں کے لیے ہی تو مجھے جانا ہوگا روزانہ۔ اب کیا آپ روز ہی ہوٹل سے خرید کے لائیں گے۔ رہنے دیجیے اتنا خرچ۔ پہلے ہی مہینے کی آخری تاریخیں چل رہی ہیں“ رضا کو افقی کا پرتکلف خیال اور احساس اچھا لگا۔

”کراچی کی ٹریفک پہلے ہی دن بھر کے تھکے ہارے بندے کو ادھ موا کر دیتی ہے اوپر سے کسی بھی ہوٹل کی سروس اللہ کی پناہ۔ رہنے دیجیے میں خود ہی بنالوں گی کچھ ہلکا پھلکا۔ رات کا سالن بھی ابھی پڑا ہوا ہے۔“ اس نے منٹوں میں مینو ترتیب دیا۔

مگر تمہیں رات کا سالن کھانا پسند نہیں ہے افقی.....! رضا کو اس کی فکر تھی افقی بدقت مسکرائی وہ کتنے پیارے انسان کو دھوکا دے رہی تھی کبھی کبھار اس کا ضمیر اسے بڑا اور کڑا ملامت کرتا کہ اسے خود کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا وہ لپک کر رضا کے شانے پر سر ٹکا گئی۔

”(بس آخری بار۔ بدر کے بعد میں زندگی میں کبھی رضا حسن کو چیت نہیں کروں گی)

وہ دل میں عہد کر رہی تھی جبکہ وہ رضا سے کہہ رہی تھی۔

”کوئی بات نہیں میں بیچ کر لوں گی اتنا خیال نہ رکھا کریں میرا بگڑ جاؤں گی۔“
 آنسوؤں کی نمی اس کی آنکھوں میں اور لہجے میں ایک ساتھ ابھری تھی۔
 ”تم بگڑ بھی گئیں تو میری محبت تمہیں سنوارے گی؟“ وہ اس کا تھپتھپاتے ہوئے یقین سے بولا اس کا یقین
 راجی کی فضاؤں نے سنا اور محفوظ کر لیا۔

☆.....☆.....☆

افتی کے بتائے مطلوبہ مقام پر پہنچتے ہوئے اس نے ٹائم دیکھا وہ پورا ایک گھنٹہ پہلے وہاں پہنچ گیا تھا آتے ہوئے
 اس نے خود پر ڈھیر سارا اسپرے انڈیا لٹا تھا بہترین ڈریسنگ ہیر اسٹائل اور قیمتی کلون کی خوشبو اسے وجاہت کا شاہکار بنا گئی
 تھی وہ بلاشبہ ایک ہینڈم پر سنائی رکھتا تھا پھولوں کا سرخ کپڑے وہ افتی کا محو انتظار تھا اسے افتی کا انتظار کرنا اچھا لگ رہا
 تھا وہ خوش تھا بہت خوش۔

جس جگہ وہ کھڑا تھا وہاں بہت رش تھا وہ ایک پبلک ہیلس تھی اسے ایسی جگہیں پسند نہیں تھیں مگر افتی نے ایسی جگہ
 کو چنا تو وہ اسے روک نہیں پایا وہ افتی کی خوشی میں خوش تھا افتی اسے جہاں سہولت سے مل سکے اسے قبول تھا بس وہ آکے اس
 سے مل لے۔ وہ اسے جی بھر کر دیکھ لے پلکیں جھپکے بنا سانس لیے بنا بس دیکھتا ہی رہے۔ اور اس نے ایسا ہی کیا بھی جب
 اس نے سرخ رنگ کی لمبی قمیض اور سرخ کھلے ٹراؤزر میں سلیپے سے کیے ہوئے میک اپ میں نظر آتی قیامت جیسی پر اعتماد
 لڑکی کبھی پزل ہو گئی افتی کو دیکھا اور دیکھتا ہی رہا۔ اس نے صنم بکرم کیفیت میں اسے اس طرح سے دیکھا کہ افتی اس طرح
 اور کتنی دیر گھوریں گے مجھے بدر..... یا کوئی بات بھی کریں گے۔“ افتی نے بظاہر ہلکے پھلکے لہجے میں کہتے اپنی جھنجھلاہٹ
 چھپائی بدر جی بھر کے مسکرایا۔

”میرا دل چاہتا ہے میں تمہیں یونہی دیکھتے دیکھتے اپنی عمر بتا دوں اور بلک تک نہ جھپکوں!“ بدر کا خواب آگئیں
 لہجہ غماز آلود تھا افتی دل کھول کے ہنسی۔

”میرے پاس صرف دو گھنٹے کا وقت ہے بدر۔ اور میں اسے آپکے ساتھ بھر پور انداز میں گزارنا چاہتی ہوں اور
 آپ اسے ایسے ویسٹ کرنا چاہتے ہیں اتنا قیمتی وقت۔ اس کے لہجے میں ہلکی سی ناراضگی در آئی بدر اس کے زوٹھے بن کر دیکھ کے
 مسکرایا۔

”تم ابھی سے گھبرا رہی ہو۔ میں تو شادی کے بعد تم سے کوئی بات ہی نہیں کیا کروں گا صرف تمہیں پیار سے
 دیکھتا رہوں گا۔“ وہ مزید شوخ ہوا۔

”جی نہیں..... آپ ایسا کچھ نہیں کریں گے مجھے تو ساری زندگی دیکھتے ہی رہنا ہے آپ نے کام پہ کون جایا
 کرے گا۔“ وہ بیویوں والے انداز میں اسے ڈپٹ رہی تھی اور بدر برابر مسکرایا تھا۔

”میرے ڈیڈ میرے لیے اتنا کما چکے ہیں کہ اب میری سات نسلیں آرام سے بیٹھ کے کھا سکتی ہیں۔ انہوں نے
 ساری زندگی کام ہی تو کیا ہے اور اتنا کیا کہ..... فیملی کے لیے ان کے پاس کبھی ٹائم ہی نہیں بچا۔“ بات کرتے کرتے بد

رکے لہجے میں دکھ کا الاؤ دہک گیا اسکے اندر کے دکھ اس کے لہجے سے عیاں ہونے لگے افقی نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی۔

میں ایک گھر بنانا چاہتا ہوں افقی۔ ایک ہنستا ہنسا گھر جہاں خوشیاں ہوں بہار ہو اور سب سے بڑھ کر سکون ہو۔“
بدر کے لہجے میں اضطراب اور خواہش کی جھلک تھی افقی کو اس لمحے وہ دنیا کا سب سے پیارا انسان لگا اس کے لیے فیملی کی اہمیت تھی۔

”انشاء اللہ آپ ایسا گھر بنائیں گے بدر۔ آپ کی بیوی آپ سے بہت پیار کرے گی اور آپ بہت خوش رہیں گے۔“ افقی نے اسے دل سے دعا دی۔

میں تمہارے ساتھ اپنی دنیا بسانا چاہتا ہوں افقی۔ تمہارے ساتھ اپنا گھر بنانا چاہتا ہوں اور میں وعدہ کرتا ہوں میں ڈیڑھ کی طرح صرف اور صرف پیسہ نہیں کماؤں گا بلکہ تمہیں اور بچوں کو پر اپنا نام دیا کروں گا۔“ وہ مستقبل پر نگاہیں جمائے بڑے یہ خیال انداز میں بول رہا تھا اس کے لہجے سے محبت فک رہی تھی اس کی آنکھوں میں خواب تھے اس کے چہرے انداز اور لب و لہجے میں سچائی تھی افقی کو وہ حسرتوں کا مارا شخص لگا جس کی ساری زندگی ٹوٹے خوابوں سے عبارت تھی صحیح تو یہ تھا کہ وہ خوشبو کو ترسا ہوا انسان تھا۔ جس کے لیے دولت سے زیادہ رشتے اہم تھے اور رشتوں کو ترسے ہوئے انسان ہمیشہ محبت کی قدر کیا کرتے ہیں ایسے لوگ کسی نعمت سے کم نہیں ہوتے اور نعمتوں کی قدر کرنی چاہیے!

”لیکن بدر۔ افقی کو پہلی بار اس کے جذبوں سے خوف محسوس ہوا ”اگر بھیا بھیا بھی نہ مانے تو۔“ بدر کو اس کے لہجے میں خدشات محسوس ہوئے ویسے ہی خدشات جو محبت کرنے والوں کے دلوں میں پنپتے ہیں۔

”میں انہیں منالوں گا۔ کسی بھی قیمت پر۔“ اس کے لہجے میں اس کی محبت کا عزم بول رہا تھا افقی بس اسے دیکھ کر رہ گئی۔

”مجھے بہت ڈر لگتا ہے بدر۔ اگر ہم نہ مل پائے تو۔“ موٹے موٹے شفاف موتی اس کی آنکھوں میں جگمگائے آواز بھرا سی گئی بدر نے اس کی پریشانی اپنے دل سے محسوس کی۔

”ڈونٹ وری۔ میں ہوں نا۔“ تسلی کے لیے اس نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔
”میں آپ سے بہت محبت کرتی ہوں بدر۔ آپ کے بغیر زندگی بالکل بے معنی ہے میرے لیے۔“ بدر ہو لے سے مسکرایا۔

”یہ پل میری زندگی کا خوبصورت ترین پل ہیں افقی۔ میں بہت خوش نصیب ہوں کہ مجھے تمہاری جیسی لڑکی کی محبت ملی اور میں چاہتا ہوں کہ ہمارا ساتھ دائمی ہو جائے اور میں ایسا یقیناً جلد کرنا چاہوں گا۔“ بات کے اختتام پر وہ ہلکا سا مسکرایا محبت دل کی بات کرنے کے بعد وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ دھیمی مسکان اس کے خویلوں پر وجہ چہرے پر ٹھہر گئی تھی افقی ایسی صورتحال کے لیے پہلے سے تیار تھی سو وہ بالکل بھی نہیں گھبرائی اور مسکرا دی۔

”آپ نے میرے جذبات کو ترجمانی کر دی ہے بدر۔ آپ کا ساتھ میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں ہوگا۔“

”ٹھیکس“ بدر کا سارا وجود احساسِ شکر میں ڈوب گیا۔

”میں نے تمہارے لیے کچھ شاپنگ کی ہے آؤ تمہیں دکھاتا ہوں۔“ وہ اسے لیے اپنے کمر کے کی طرف بڑھنے لگا وہ پہر کا کھانا کھانے کے لیے وہ لوگ اسی ہوٹل میں آئے تھے جس میں بدر ٹھہرا ہوا تھا۔

”یہ کیا پوری بوتیک اٹھالائے میرے لیے بدر۔“ ڈھیر ساری شاپنگ دیکھ کے افقی کی تو آنکھیں پھٹ گئیں ہندوہ میں تو صرف سینڈلز کے بیئر تھے اور وہ سب بھی اعلیٰ برانڈ کے اور ڈریسز کی تو گنتی ہی نہیں تھی۔

یہ تو کچھ بھی نہیں میرا بس چلتا تو پورا مال اٹھا کر یہاں لے آتا۔

”یہ سب تو بہت زیادہ ہے بدر۔ میں یہ سب نہیں لے سکتی“ افقی کو اتنی اچھی چیزوں سے دستبردار ہونے کا واقعی میں افسوس تھا۔ بدر کے سوالیہ انداز پر اس نے خود اسی وضاحت کی تھی ”میں گھر والوں کو کیا بتاؤں گی کہ یہ سب مجھے کس نے دیا ہے اور کیوں۔ بہت سے سوال انھیں گے اور بھابھی تو میرا جینا حرام کر دیں گی۔“ افقی کے لہجے میں واضح پریشانی تھی مگر جو وہ کہہ رہی تھی اس وجہ سے بہر حال نہیں وجہ کوئی اور تھی۔

”یہ بات میرے دماغ میں کیوں نہیں آئی۔“ بدر بھی سنجیدہ سا ہو گیا۔

”اس لیے کیونکہ آپ کا دماغ خالی ہو چکا ہے محبت نے آپ کو نکما کر دیا ہے“ افقی شرارت سے کہتے ہوئے مسکرائی تو بدر کھینانا ہو کے ہنس دیا۔

بہت خوبصورت لگ رہی ہو۔ بدر نے جاتے سے تعریف کی۔

”بڑی جلدی خیال آ گیا تعریف کرنے گا۔“ اس نے منہ بنایا تھا بدر کو اس کا ناراض ہونا اچھا لگا تھا۔

”تمہارے علاوہ کسی اور بات کی طرف دھیان ہی نہیں گیا ورنہ سب سے پہلے تمہاری تعریف ہی کرتا۔“ وہ بے بسی سے رہنے بالوں میں انگلیاں جلاتا ہنسنا افقی بھی اس کی بات سمجھ کے مسکرائی تھی۔ ان دونوں کے قہقہے کے ساتھ کاتب نکل رہی مسکرایا تھا۔

☆.....☆.....☆

ساری شاپنگ اس نے سعدیہ کے گھر اس کے پاس امانت رکھوائی تھی۔ سعدیہ اس کے چمکتے دسکتے روپ کو بس نگاہ ہر کے دیکھ کر رہ گئی تھی۔ افقی شروع دن سے ہی ایسی تھی اور وہ اسے کبھی بھی نہیں سمجھا پائی تھی۔ ابھی بھی اس نے اسے ایک نظر دیکھا اور افسوس سے سر ہلا کر رہ گئی اسے افقی کی ایسی حرکتیں ہمیشہ ہی اب نارمل لگتی تھیں۔

”مل آئیں۔“ سعدیہ نے اسے ڈھیر ساری شاپنگ بیگز سے نبرد آزما دیکھ کر پوچھا خوشی کے مارے اس کا سارا چہرہ دمک رہا تھا۔ افقی نے آنکھیں میچ کرا ثبات میں سر ہلایا سعدیہ دو قدم آگے بڑھ آئی۔

”میچ میں سعدیہ..... اتنا زبردست بندہ میں نے اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھا.....“ وہ پر جوش سے انداز میں کہتے صوفے پر سینڈل اتار کر بیٹھ گئی۔

وہ تو تمہارا چہرہ بتا ہی رہا ہے افقی..... سعدیہ سنجیدہ سے انداز میں بول رہی تھی۔

”اسود کدھر ہے.....“ افقی نے اس کے انداز کو نظر انداز کرتے اسود کا پوچھا۔

”ابھی سویا ہے تھوڑی دیر پہلے.....“ سنجیدہ انداز ہنوز قائم تھا۔

”اس نے تمہیں تنگ تو نہیں کیا ناں سعدی..... سچ مجھے وہاں بھی وہم سا رہا تھا کہ کہیں وہ تمہیں تنگ نہ کر رہا ہو۔“ افقی اس کے دونوں ہاتھ تھام کر شرمندہ سے انداز میں بولی تو سعدیہ کو اس لمحے جانے کیوں مگر افقی سے کراہت محسوس ہوئی۔ کوئی عورت اتنا بھی گر سکتی ہے اور اس حد تک بھی.....؟“

اس نے اپنی سوچوں کے بے لگام گھوڑے کو فکر و دانش کی سرزمین پر دوڑاتے سوچا تھا۔

یہ باتیں تمہیں پہلے سوچنا چاہیے تھیں۔ جس وقت تم نے اسود کو میرے پاس چھوڑ کر جانے کا فیصلہ کیا تھا اب ان باتوں کا کیا فائدہ۔ بچہ ہی ہے ناں اور بچے تو بہل ہی جایا کرتے ہیں کسی بھی بہانے سے۔ سعدیہ نے ہلکے پھلکے انداز میں اسے جتایا مگر افقی کسی اور ہی دنیا میں پہنچی ہوئی تھی وہ سعدیہ کا طنز سمجھ نہیں پائی۔ شاپنگ نہیں دکھاؤ گی مجھے جو تمہارا رومیو تمہارے لیے کر کے آیا ہے۔ وہ ہلکا سا مسکرائی۔

”ہاں کیوں نہیں۔ افقی نے جلدی سے اسے ساری شاپنگ دکھائی تھی سعدیہ نے پوری دلجمعی سے ساری چیزیں دیکھیں اور دل کھول کے تعریف کی۔

جو بھی ہے پر بندہ ہے بڑا دل والا“ سعدیہ نے ساری چیزیں دیکھنے کے بعد بے لاگ تبصرہ کیا۔

”ہاں یہ تو ہے..... ویسے بھی تم اسے ایک نظر دیکھو تو میسر آئے ہو جاؤ گی وہ اتنا ہینڈسم ہے کہ چند لمحوں کے لیے میں خود بھی سوچ میں پڑ گئی سعدی۔ میں اختین حیدر..... جو مردوں سے کبھی متاثر نہیں ہو پائی۔“ افقی کے لہجے میں احساس برتری سمٹ آیا۔

”ہاں خیر وہ دکھ ہی رہا ہے۔“ سعدیہ نے بھی اس کی تائید کی: ”اچھا خیر یہ بتاؤ کہ کیا موڈ ہے اب تمہارے رومیو کا۔ یا پھر تمہاری کوئی اسٹیرینا جی میری اسٹیرینا جی تو وہی ہے کہانی کا ڈراپ سین بھی تیار ہے ہاں رومیو کا موڈ تو مجھے پر پوز کرنے کا ہے اور شاہد وہ یہاں آیا بھی اس لیے ہی ہے“ افقی نے لاپرواہی سے اس قدر اہم بات بتائی یوں جیسے کسی اور کی بات کر رہا ہو۔

”افقی..... تمہیں ایسا نہیں لگتا کہ تم آگ سے کھیل رہی ہو۔؟“ سعدیہ کا لہجہ کسی بھی قسم کے طنز سے پاک تھا ہاں ہلکی سی حیرت کی خوشحوس کی جاسکتی تھی۔

خطروں کے کھلاڑی آگ سے نہیں ڈرا کرتے میری جان۔ افقی جیسی قیامت کے سامنے آگ کوئی معنی نہیں رکھتی۔ افقی کے چہرے کے عضلات میں احساس تقاضا خراج گیا۔

”کیا کہو گی اپنے رومیو سے..... وہ تمہارے پیار میں تو بہت آگے جا چکا ہے؟“ سعدیہ نے اسے جانچا اب جو

بھی کرنا ہے وہ تمہیں کرنا ہوگا؟ افقی نے بڑے آرام سے کہتے سعدیہ کے سر پر دھماکہ کیا۔

”کیا مطلب.....“ وہ چونکی۔

”وہ میں تمہیں بعد میں سمجھاؤں گی پہلے تم مجھے اچھی سی چائے پلاؤ میں تب تک اسود کو دیکھ لوں..... اٹھا کہ نہیں“
مرے سے آرڈر کرتے وہ بڑے آرام سے سعدیہ کو حیرت میں گھرا چھوڑ کے اسود کے کمرے کی طرف بڑھ گئی سعدیہ بس اس کو دیکھ کے رہ گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

”افتی..... کیا ہوا تمہاری طبیعت خراب لگ رہی ہے؟“ وہ نڈھال و پڑ مردہ سی بچن میں کھڑی شام کا کھانا تیار کر رہی تھی جب رضائے اچانک ہی اس کے پیچھے آ کے کہا تھا افتی چونک کے پیچھے مڑی رضا متفکر سا اس کے پیچھے کھڑا تھا افتی نے جلدی سے خود کو سنبھالا اور اپنی آنکھیں صاف کیں جو شام ہی سے بے سبب ہی برس رہی تھیں۔
”کیا ہوا۔ تم رو کیوں رہی ہو۔“ رضا پریشان ہوا تھا۔

”نہیں۔ میں روتی نہیں رہی بس پیاز کاٹ رہی تھی تو اسی کی وجہ سے آنکھوں میں پانی آ گیا۔“ اس نے چھری والا ہاتھ فوراً آگے کر کے دکھایا رضائے اسے غور سے دیکھا افتی تم پیاز نہیں ٹماڑ کاٹ رہی ہو.....“ رضائے واضح طور پر اپنی مسکراہٹیں دہانے کی سعی کی۔

”اوہ..... افتی فوراً چونک کے سیدھی ہوئی تو نظر ہاتھ میں پکڑے ٹماڑ پر جا چکی بے ساختہ مسکراہٹ نے اس کے لبوں کا احاطہ کیا رضا دو قدم آگے بڑھا اسے بازوؤں میں بھرتے اپنی ٹھوڑی اس کے شانے پر ٹکائے اس کے وجود کی خوشبو کو اپنی سانسوں میں اتارنے لگا افتی کے وجود کی مہک اس کی پر کیف قربت اسے مسحور کر دیا کرتی تھی وہ بے خود ہونے لگتا وہ ہوش کھونے لگتا تھا افتی کو خود پر اور اپنی قربت پر ناز تھا وہ جانتی تھی کہ کسی بھی مرد کو گھائل کرنے کے تمام تر ہتھیاروں سے وہ لیس تھی اور وہ ایسا کر سکتی تھی وہ رضا کی بے خودی کے محفوظ ہوتے محسوس کرتی مگر اس وقت وہ کوئی بھی احساس رضا کی قربت سے کشید نہیں کر پائی وہ بدر کے خیالوں میں ابھی تھی اور اسی میں غلطان تھی تبھی تو رضا کی چھینٹ خانی پر بھیبت کی مانند بچن رینگ کے سامنے ایستادہ تھی۔

”اے..... کیا ہوا.....“ رضا اس کے بالوں میں مہکتی شیمپو کی خوشبو کو سانسوں میں ارتارتے خمار آلود لہجے میں

پوچھ رہا تھا۔

”کچھ نہیں..... بس سر میں ذرا سادہ روم رہا ہے آپ لاؤنج میں جا کے بیٹھیں میں کھانا تیار کر کے روم میں آرہی ہوں۔“ افتی اس وقت رضا کی قربت سے خائف تھی اور نہ ہی اس کے سوالوں کا جواب دینے کے موڈ میں تھی اس نے اسے وہاں سے جانے کو کہا تھا۔

”پر مجھے تمہاری طبیعت خراب لگ رہی ہے.....“ وہ ابھی بھی اسی بات پر اٹکا تھا۔ کچھ نہیں ہوا مجھے..... بس ذرا سی تھکاوٹ ہے اور کچھ نہیں تھوڑا ریٹ کر لوں گی تو سب ٹھیک ہو جائے میں بالکل فریش ہو جاؤں گی۔ وہ رضا کو وہاں سے ہٹانے کے لیے اس کی تسلی کروا رہی تھی حالانکہ اس کا بالکل بھی دل نہیں چاہ رہا تھا کوئی بھی کام کرنے کو وہ بہت پریشان تھی ہارنے بات ہی ایسی کر دی تھی کہ اسے پریشانی کا آسیب چٹ گیا تھا۔

”اچھا ٹھیک ہے..... چار ہا ہوں تم جلدی فری ہو کے آ جاؤ بلکہ سبزیاں مجھے دے دو میں سلا د بنا دیتا ہوں.....“

جاتے جاتے بھی وہ چلی ہوئی سبزیاں ٹوکری میں رکھ کر اپنے ساتھ لے گیا تھا افقی نے اس کے جاتے ہی شکر کی سانس لی تھی وہ جس وقت سے لوٹی تھی بدر کا ایک بھی مسج ہیں آیا تھا وہ آٹھ روز کے لیے آیا تھا اور وہ یہ آٹھ زور بدر کے ساتھ بہت خوشگوار انداز میں گزارنا چاہتی تھی مگر بدر کی بڑھتی وارفتگی اور ڈیمانڈ زدہ پوری کرنے سے خود کو قاصر و معذور پار ہی تھی۔ بدر آج واپسی پر اسے گھر ڈراپ کرنا چاہتا تھا اور افقی کے بھیجا بھی سے ملنے کا خواہشمند بھی..... مگر افقی اسے گھر نہیں بلا سکی اپنے فرضی بھیجا بھی سے وہ اگر بدر کو نہ بھی ملواتی تب بھی بدر کو اس کے گھر کا پتہ معلوم پڑ جاتا..... وہ کبھی بھی کسی بھی وقت اس کے گھر آ سکتا تھا اور اس کو یہ کسی طور پر گوارہ نہیں تھا وہ فول پروف پلان بنانے میں مہارت رکھتی تھی اور ایسا کیسے ہو سکتا تھا کہ افقی ایسی کوئی بھی حماقت جذبات کے دھارے میں بہہ کے کر گزرتی اس بات کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا تھا مگر ایسا وہ بدر کو نہیں سمجھا سکتی تھی بدر اپنی دھن کا پکا جذبات کے دھارے میں اندھا دھند تیرنے اور بہنے والا بندہ تھا وہ وہی کرتا جو اس کی من مرضی ہوا کرتی مگر افقی کو اس کی جذباتیت فائدہ نہیں دے سکتی تھی نہ ہی اسے اس کی ضرورت تھی۔ اسی لیے اس نے بدر کو صاف منع کر دیا تھا بدر موڈ سننے ہی آف ہو گیا تھا افقی کے لیے بدر کے منہ زور جذبات کے دھارے پر بند پر باندھنا مشکل ہو رہا تھا جتنا اس قے کو ختم کرنے کی کوشش کرتی اتنا ہی بدر کے جذبوں کی آگ مزید دہکتی جذبات کا ایک الاؤ تھا جو بدر کی آنکھوں میں دکھتا نظر آتا تھا، محبت اس کے انگ انگ سے لہو بن کے ٹپکتی تھی پالینے کی چاہ اور حاصل کرنے کی جستجو کا عزم اس کی نیلی آنکھوں کے سمندر میں موجزن بلکورے جیسا نظر آتا تھا۔ افقی کو اس کی آنکھوں سے خون محسوس ہوا۔ تبھی وہ اس کی ناراضگی کی پرواہ کیے بغیر لوٹ آئی مگر اپنا دل شاید کہیں وہیں بدر کے آس پاس ہی چھوڑ آئی تھی اس نے پہلی بار ایک خود غرض اور خود پسند عورت کے علاوہ ایک عورت بن کے سوچا اسے بدر کے بارے میں سوچ کے بُرا لگا اس نے بدر کے ساتھ زیادتی کی تھی..... پوری رات اس کی سوچتے گزری وہ بدر کو سچ بتا دے اور اس سے معافی مانگ لے۔ وہ بہت اچھا اور نرم دل کا مالک ہے وہ اسے معاف کر دے گا اور افقی اس کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دے گی۔ وہ رضا کے ساتھ وفا کرے گی اور ہمیشہ اس کی وفادار بن کے ہی رہے گی مگر اس سے وہ یہ بھول گئی تھی کہ اس کی زندگی میں موجود دونوں مرد بھلے نرم دل رکھتے ہوں مگر وہ دماغ بہر حال نرم اور پلپلا نہیں رکھتے تھے افقی نے کچھ سوچ کے بدر کو سچ لکھا اس وقت رات کے تین بج رہے تھے پوری رات افقی کی آنکھوں میں کٹ گئی تھی۔

”سوری..... آپ کو دکھی کر کے میں بھی سکون میں نہیں ہوں“۔ افقی نے موبائل سائڈ میں رکھ کر دونوں بازو اپنے سینے کے گرد لپیٹے اسے بالکل بھی امید نہیں تھی کہ بدر کا جواب آئے گا مگر اسے حیرت ہوئی جب اگلے پانچ سکینڈ میں اس کے موبائل پر سیج ٹون کی آواز سنائی دی تو..... اس نے لپک کر موبائل فون اٹھایا۔

”اداس مت ہو اور سو جاؤ..... میں بالکل بھی ناراض نہیں ہوں تم سے؟“ مسکراتے چہرے کے ساتھ آیار پلائی

افقی کو متحیر کر گیا۔

”تو پھر آپ جاگ کیوں رہے ابھی تک.....“ افقی کے دماغ میں شک کا کیڑا کلبلا یا۔

”اب سو جاؤں گا اور تم بھی سو جاؤ صبح گیارہ بجے پہنچ جانا مجھے کچھ خاص بات کرنی ہے تمہارے ساتھ.....“ اس کا سوال بڑے مزے سے گول کرتے اس نے افنی کو سو جانے کی ہدایت کی تھی افنی گہرائی میں نہیں گئی اس کے لیے بس بدر کا مان جانا ہی بہت تھا۔

☆.....☆.....☆

افنی نے بدر کا لایا کاہی رنگ کا فراک اور چوڑی دار پا جامہ پہنا ہلکا سا میک اپ کرتے اس نے بال کھلے چھوڑ دیے تھے کاہی رنگ کی فراک پر سلور رنگ کا ڈائمنڈ کانگوں کا کام بنا ہوا تھا ڈائمنڈ گلوں کی جھلمل روشنی افنی کے صبح چہرے کو روشن کر رہی تھی۔ افنی نے خود کو آئینے میں ناقدانہ نگاہ سے دیکھا اور مسکرا دی وہ ہمیشہ ہی خوبصورت دکھتی تھی کیونکہ وہ خوبصورت اور حسین تھی۔ اس نے زندگی میں جس مرد کو بھی اپنے زیر بار کرنا چاہا تھا اپنے حسن سے کر لیا تھا کوئی بھی مرد اس کے حسن کے تیر سے گھائل ہوئے بغیر نہیں بچ پایا تھا بچ ہی نہیں سکتا تھا افنی اسے ایسا کرنے کا موقع دیا ہی نہیں کرتی تھی۔

وہ ٹیکسی میں بیٹھی بار بار گھڑی کی جانب دیکھ رہی تھی گیارہ بجنے میں پندرہ منٹ باقی تھے اور ٹریفک جام ہونے کی وجہ سے وہ پچھلے آدھے گھنٹے سے ٹیکسی میں بیٹھی تھی۔ گاڑیوں کا سیلاب تھا جو کسی بند ٹونے کی مانند سڑک پر بکھرا تھا افنی کو انتظار سے بڑی کوفت ہوا کرتی تھی کیونکہ اسے انتظار کروانا پسند تھا کرنا نہیں..... تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ ایک بایک اسکے قریب سے گزری اور آگے جا کے رُک گئی بس صرف ایک لمحے کے لیے عامر نے دیکھ لیا تھا وہ سو فیصد افنی تھی مگر وہ اتنی صبح اکیلی کہاں جا رہی تھی عامر نے چند لمحے کے لیے سوچا اور پھر سر جھٹک کر رہ گیا ٹیکسی آگے گزر چکی تھی۔

عامر کو واضح انداز میں لگا کہ اسے غلط فہمی ہوئی ہے بھلا افنی اتنی صبح اور اکیلی کہاں جا سکتی ہے..... ٹیکسی آگے بڑھ گئی رش چھٹنے لگا مگر عامر افنی کے خیال کو ذہن سے جھٹک نہیں سکا وہ آفس جا رہا تھا مگر ذہن کام میں نہیں لگایا شاید وہ اپنا دماغ اپنی سوچ ٹریفک جام والی اسی سڑک پر ہی چھوڑ گیا تھا۔

”میں بھی کتنا شکی ہو گیا ہوں پولیس جوائن کرنے کے بعد.....! اس نے خود کو سرزنش کرتے مسکراتے ہوئے سوچا ”کیسی کیسی باتیں سوچنے لگ گیا ہوں انہونی باتیں“۔

وہ خود کو ریلیکس کرنے کی کوشش میں لایعنی باتوں پر مسکرایا مگر دماغ نے اس کی ایک بھی دلیل کو نہیں مانا..... اچانک وہ اٹھا اور تھانے سے باہر نکل گیا باہر آ کے اس نے افنی کے نمبر پر کال ملائی نیل جا رہی تھی مگر کوئی ریسپونس نہیں کر رہا تھا پھر اس نے گھر کے پانی سی ایل پر کال ملائی مگر اسے بھی کسی نے بھی ریسپونس نہیں اب اس کا شک یقین میں بدل رہا تھا مگر وہ حتمی بات نہیں کر سکتا تھا کہ افنی گھر میں نہیں ہے وہ بارہا اس کے میکے جا چکا تھا ان کا گھر ایک مختلف روٹ پر تھا افنی کہیں اور جا رہی تھی مگر کہاں۔ سوچ کی ساری حدیں بس اس لفظ پر آ کر ختم ہوئی تھیں۔ تبھی ایک خیال برقی کوند کی مانند اس کے دماغ کی سرزمین سے نکرایا اور وہ پرسکون ہو گیا اس نے اپنے سیل نمبر پر اپنے بھائی کا نمبر ملایا۔

”السلام علیکم رضا بھائی..... کیسے ہیں آپ؟“ وہ دل کی پریشانی چھپائے بظاہر شفقگی سے پوچھ رہا تھا۔

وہ علیکم اسلام۔ کیسے ہو عامر آج اتنی صبح یاد کیا خیریت ہے ناں؟

وہ جانتا تھا راضا حسن کو حیرت ہوگی تبھی اس نے جلدی سے بہانہ گھڑا۔

”جی وہ اصل میں امی جان بچوں کے لیے بہت اداس ہو رہی تھیں ملنے کے لیے گھر آنا چاہ رہی تھیں مگر گھر میں کوئی فون پک نہیں کر رہا بھابھی کا سیل آن تو ہے مگر وہ بھی کال نہیں ریسیو کر رہیں تو میں نے سوچا آپ سے پوچھ لوں کہ بھابھی اور بچے گھر پر تو ہیں ناں.....؟“

”ارے ہاں..... اصل میں افتی کی سہیلی بیمار ہے ناں تو وہ اس کے پاس جاتی ہے اسی لیے فون نہیں پک کر رہی اس کا نمبر سائلنٹ پر ہوگا۔ تم پریشان مت ہو اور امی جان سے کہنا کہ ہم خود آئیں گے دو تین روز میں ملنے..... بس ذرا فرصت مل جائے“ راضا حسن نے بے حد مطمئن انداز میں کہہ کے عامر کی تسکینی کروائی۔

”جی بھائی ٹھیک ہے میں کہہ دوں گا۔ ابھی رکھتا ہوں پھر بات کروں گا!“ اس نے خود پر نفرین بھیجتے فون بند

کیا۔

”لوگوں کو عشق نکما کرتا ہے اسے پولیس لائن نے کر دیا تھا..... فون بند کرتے اس نے سوچا تھا۔

☆.....☆.....☆

وہ اس کے کمرے کے سامنے کھڑی تھی اپنی تمام تر حشر سامانیوں اور شعلہ جوانی سمیت اس نے دروازہ ہلکے سے ناک کیا اگلے ہی لمحے دروازہ کھلا دونوں فریقین ایک دوسرے کو دیکھ کر ساکت رہ گئے لمحے صدیوں کے تخیل میں ڈوب گئے دونوں ایک ٹرائس کی کیفیت میں تھے آتی جاتی سانسیں ان برف کے مجسموں کے زندہ ہونے کا پتہ دے رہی تھیں۔ بدر نے نظر بھر کر اور نگاہ بٹھرا کر اپنے سامنے کھڑے چاندی کے مجسمے کو اپنے پسندیدہ روپ میں دیکھا اور مسمرائزڈ ہو گیا اس کا مسحور ہونا بنتا تھا مگر افتی کے ساتھ ایسا کیوں ہوا تھا وہ جو کسی بھی مرد کی وجاہت سے متاثر ہو جانے والوں میں سے نہ تھی اس وقت ایک اُجڑے بکھرے حلیے والے مرد سے ہار گئی تھی۔ شدت گریہ سے بدر کی آنکھیں سرخ تھیں بکھرے بال اور اجڑا ویران حلیہ ایسا لگتا تھا وہ ساری رات سو نہیں پایا وہ ہرٹ ہوا ہے شدید ہرٹ۔ افتی کو لکھوں میں احساس ہوا اور شدید ہوا..... اور پھر بھی وہ افتی کو پریشانی سے نکالنے کی خاطر خود پر جبر کرتے ہوئے اسے پرسکون کر رہا تھا افتی کو رات کی کہانی یاد آئی تو پہلی بار تکلیف کا احساس ہوا..... اس کے اندر کی عورت نے اسے ملامت کی۔

وہ کیا کھیل کھیل رہی تھی اس قدر اچھے معصوم انسان کے ساتھ..... وہ اس کے اعتماد سے کھیل رہی تھی وہ بدر جیسے محبت کے پیکر کو توڑ رہی تھی وہ کس قدر غلط کر رہی تھی..... کوئی افتی کے اندر بے دردی سے چلایا اس کی آنکھ سے آنسو گرا وہ آنسو شرمندگی اور ندامت کا تھا مگر بدر نے اس آنسو کو اپنے مطلب کے معنی پہنائے تھے وہ سراپا محبت تھا اور محبت بدگمان نہیں ہوتی وہ وہم بھی نہیں ہوتی وہ زندگی ہوتی ہے وہ زندگی کا سکون ہوتی ہے۔ وہ جینے کا جواز ہوتی ہے وہ زندہ رہنے کا محرک ہوتی ہے اور ہمیشہ رہتی ہے بہت خوبصورت لگ رہی ہو..... اس نے اسے دیکھتے ہی پہلی بات ہی یہی کی تھی۔

”ایسا لگتا ہے کہ دنیا کا ہر رنگ اور ہر خوبصورت چیز صرف بنی ہی تمہارے لیے ہے ہر وہ چیز جنہیں تم استعمال کرتی ہو خود پر ناز کرنے لگتی ہیں“ وہ مسکراتے ہوئے اس کی تعریف میں رطب اللسان تھا مگر افتی مسکرا نہیں سکی۔

”اندر آؤناں..... باہر کیوں کھڑی ہو؟ بدر اس کی خاموشی پر حیران ہوا مگر جتنا یا نہیں پھر بھی افقی کچھ نہیں بولی بس اندر آ کے کھڑکی کے ساتھ پڑی کافی ٹیبل کے گرد کھی چیز زپر جا کے بیٹھ گئی کافی ٹیبل پر سگریٹ کے ادھ جلے ٹکڑوں کا بھرا ہوا ایش ٹرے سامنے رکھا تھا اور کافی کے کئی خالی گلاس..... اس کے رت جگے کے گواہ اس کی بے تابی اور درد کے امین۔

افقی نے ایش ٹرے سے یکبارگی نگاہ اٹھا کر شکایتی نظر بدر پر ڈالی بدر ایک بے بس نگاہ دیکھ کے رہ گیا افقی اپنی حالت سے خود بھی ڈر گئی ایسا کبھی نہیں ہوا تھا وہ تو بہت سخت دل عورت تھی وہ تو اندر سے کبھی نہیں روئی تھی کبھی نہیں بکھری تھی

۴ آج اسے اپنے اندر کیا کرچی کرچی ہوتے محسوس ہو رہا تھا اور کیوں.....؟

”مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے بدر!“ بہت دیر خود کو سنبھالنے کے بعد بالآخر افقی نے کچھ کہنے کے لیے اپنے لب لہلہ تھے بدر کی ساری حسیں کان بن گئیں۔

”مجھے بھی تمہیں کچھ بتانا ہے افقی!“ بدر اس کے پاس دو زانوں ہو کے بیٹھ گیا مگر پہلے تم بولو..... میں پہلے تمہارے دل کی بات سننا چاہوں گا مجھے تمہیں سننا ہمیشہ ہی اچھا لگتا ہے“ بدر کے لہجے میں ہی محبت نہیں تھی اس کے ہر انداز میں محبت تھی۔ افقی نے بدر کی بات سن کے اپنی سسکی کا گلا گھونٹا۔

مجھے غلط مت سمجھئے گا بدر..... مگر آج میں آپ کو خدا حافظ کہنے آئی ہوں ہمیشہ کے لیے ہمارا ساتھ بس یہی تک تھا۔ افقی کو آج آنسو لانے کی ضرورت نہیں پڑی آنسو بدر کی دیوا لگی دیکھ کے خود ہی اندر رہے تھے۔ بدر پر ساتوں آسمان قہر ان کے ٹوٹے وہ جہاں کا یہاں پر بیٹھا ساکت رہ گیا۔

”یہ..... تم کیا کہہ رہی ہو افقی..... ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ دم بخود تھا کل مجھے آپ کے ساتھ میرے بھائی نے کہا لیا تھا..... اور مجھے انہوں نے بہت مارا بھی جان سے مارنے کی دھمکی بھی دی ہے۔ افقی سسکی مجھے اپنی پراوہ نہیں ہے بدر مگر کوئی آپ کی طرف انگلی بھی اٹھائے میں برداشت نہیں کروں گی میں نے اپنی جان دے دوں گی مگر آپ یہ آج نہیں آنے دوں گی۔“

”کوئی تمہیں ہاتھ لگا کے تو دیکھے میں ہاتھ کاٹ دوں گا“ بدر لمحہ میں آگ بگولہ ہوا یہ احساس ہی باعث تکلیف تھا لہذا افقی کو کسی نے اتنی بے دردی سے مارا ہے اور اس کی وجہ بدر کی ذات ہے۔

”میں ساری رات روتی رہی ہوں بدر..... بھیا کبھی نہیں مانیں گے اس بات کا اندازہ مجھے رات ان کے رویے سے اچھی طرح ہو گیا ہے ہم کبھی مل نہیں سکتے بدر..... آپ پلیز چلے جائیں یہاں سے میں نہیں چاہتی کہ عامر بھائی کو آپ کو کوئی نقصان پہنچائیں۔

افقی اس کے دونوں ہاتھ تھامے لجاجت سے کہہ رہی تھی۔

”میں اتنا کمزور نہیں ہوں افقی کہ تمہارے بھیا سے ڈر جاؤں۔ موت تو ایک دن آنی ہی ہے۔ تمہاری محبت میں

مرا تو محبت کے سامنے سرخرو ہوں جاؤں گا۔“

وہ افقی کے ہاتھوں سے دونوں ہاتھ چھڑاتے ہوئے بولا تو افقی نے بے ساختہ تڑپ کر اپنا مخروطی انگلیوں والا سپید ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔

”اللہ نہ کرے کہ آپکو کچھ ہو بدر۔ آپکو میری عمر بھی لگ جائے۔“ بدر نے اس کا اپنے دھکتے لبوں سے لگا ٹھنڈا رخ ہاتھ چوم لیا اپنے ہونٹوں کی ساری گرمی جذبات کی ساری جدت اس جسارت کے ذریعے افقی نے اپنے بدن میں برقی کوند کی مانند سرایت کرتی محسوس کی مگر میں ایسے ہار نہیں مانوں گا افقی..... میں اپنی آخری سانسوں تک تمہیں پانے کی کوشش کروں گا۔ اس کے لہجے کا عزم اور محبت کی طاقت اس کے مضبوط ارادے کا پتہ دے رہی تھی افقی کو بیک وقت اس پر پیار بھی آیا اور غصہ بھی۔

”زندگی میں ہم بہت ساری خواہش پالینے میں بدر..... مگر ضروری نہیں کہ وہ سب ہمیں حاصل ہوں میں سمجھ لوں گی کہ آپ بھی میری ایسی ہی ایک لا حاصل خواہش تھے شاید میں نے اپنی اوقات سے بڑھ کے خواب دیکھ لیے تھے“..... افقی نے ہنسی کی اور آنکھوں سے ڈھیر سارے موتیوں کو پانی بنا کے گرایا۔

”ہم ابھی بھی اپنے خوابوں کی تکمیل کر سکتے ہیں افقی..... اگر تم میرا ساتھ دو تو؟“ بدر کے لہجے میں آس تھی اور اس کا پورا وجود کشمکش بن گیا افقی کی ہاں کی بھیک کے لیے۔“

”میں ایسا کچھ نہیں کر سکتی بدر..... جو میرے بھائی کی عزت پر حرف لانے کا سبب بنے۔“ وہ جانتی تھی کہ بدر کی بات کا مقصد کیا ہے اسی لیے اس کا لہجہ دو ٹوک اور اٹل تھا۔ تو پھر مجھے اپنے طور پر کوشش کرنے دو۔ اب کی بار وہ ہلکے سے جھنجھلایا۔

”ہر کوشش بے کار جائے گی بدر..... میں چھ ماہ سے بھیا کو منانے کی کوشش کر رہی ہوں مگر وہ نہیں مانے اور کل تو حد ہی ہو گئی غصے میں آ کے انہوں نے میرا نکاح زبردستی بھابھی کے بھائی کے ساتھ طے کر دیا ہے۔ آج بھی میں بڑی مشکل سے آپ سے ملنے کے لیے آئی ہوں۔ ہمارا ساتھ شاید یہیں تک تھا مجھ سے وعدہ کریں بدر آپ اپنا گھر بسائیں گے کسی بہت اچھی لڑکی کے ساتھ..... آج کے بعد مجھ سے رابطہ نہ کرنا میں نمبر آف کر رہی ہوں آپ کی یادیں میری زندگی کا سرمایہ حیات ہیں میں انہیں کے سہارے اپنی زندگی گزار سکتی ہوں مگر آپ کو خوش رہنا ہے ویسا ہی گھر بسانا ہے جیسا ہم نے سوچا تھا۔“ وہ بیک کا ندھے سے لٹکائے آگے ہی آگے بڑھ رہی تھی اس کا بڑھتا ہر قدم بدر کو اس سے دور کر رہا تھا۔ اس نے بدر کی نہیں سنی تھی نہ ہی پیچھے مڑ کر دیکھا تھا شاید اس لیے کہ پیچھے مڑ کے دیکھنے والے پتھر ہو جایا کرتے ہیں مگر کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی افقی اور بدر کی کہانی تو ابھی شروع ہوئی تھی۔

☆.....☆.....☆

اسود کو سعدیہ کے گھر سے لینے کے بعد وہ تھکے تھکے قدم اٹھاتی گھر کی جانب بڑھی تھی۔ ایک طویل دلچسپ اور مشکل کھیل کا اختتام آج بالآخر افقی کے پلان کے مطابق ہو ہی گیا تھا اس نے جیسا سوچا تھا ویسا ہی ہوا تھا مگر وہ خوش اور

”مومن نہیں تھی ایک عجیب سی تھکن اس کی رگ و پے میں سرایت کرتے اسے حال سے بے حال کر رہی تھی۔ شاید کہیں نہ لہیں اس کھیل کو کھیلنے وہ ”بدر حیات“ سے اپنائیت محسوس کرنے لگی تھی وہ اس کی ذات کے دکھوں سے آشنا ہو گئی تھی وہ اس کا درد جاننے اور محسوس کرنے لگی تھی اور آشنائی چاہے چار دن کی ہو اپنا اسیر کر لیتی ہے اور اس اسیری سے رہائی اکثر عمر بھر مل نہیں پایا کرتی۔ وہ گھر پہنچی تو ایک سر پرانز اس کا منتظر تھا۔ وہ گھر کے کھلے دروازے میں کھڑے ہو کے اندر کا منظر دیکھ رہی تھی وہ ساکت و صامت اسود کو کندھے سے لپٹا کے کھڑی تھی جیسی مصروف سے رضا حسن کی نگاہ اس پر پڑی تھی وہ جو گھر کو سنانے میں از حد مصروف نظر آ رہا تھا لپک کر اس کی طرف بڑھا اسے محبت سے دیکھا اور مسکرا دیا۔

”پپی انیورسری ڈیروائف۔ وہ اسے بازوؤں کے حلقے میں لیے گھر کے اندر لے آیا۔ افنی کو دھچکا لگا اسے یاد نہیں تھا مگر رضا حسن کو کیسے یاد رہ گیا تھا کہ آج ان کی شادی کی سالگرہ ہے وہ تو اکثر ایسی باتیں بھول جایا کرتا تھا۔ کیسا لگا میرا سر پرانز۔ صبح سے گھر سجا رہا ہوں وہ تو شکر ہے امی جان اور عامر آگئے ورنہ میں اکیلے کیسے اتنا سارا کام کر پاتا۔ وہ خوش خوش سا اسے بتا رہا تھا افنی اپنی اندرونی ٹوٹ پھوٹ کو نظر انداز کر کے بدقت تمام مسکرائی۔

تھینکس آلات رضا۔ آپ ہمیشہ میری خوشی کا خیال رکھتے ہیں“ افنی کے حلق میں نمکین پانی کا پھندا لگنے لگا آکھیں ڈبڈبا گئیں نجانے وہ رویوں رہی تھی اور اندر تو پ کس بات کی تھی۔ شاید کہیں کچھ کھودینے کا احساس شدید تکلیف دے رہا تھا۔

”تم بھی تو میری اتنی پرواہ کرتی ہو۔ تمہیں سر پرانز اچھے لگتے ہیں ناں میں نے آج تمہارے لیے ایک سر پرانز بلان کیا ہے شکر ہے تمہیں پسند آ گیا۔“ رضا خوش تھا افنی مسکرائی تبھی وہ امی جان کے پاس بڑھی تھی جو کچن میں کھانا بنانے میں مصروف تھیں آج تو عامر بھی آیا ہوا تھا افنی کو اسے اپنے گھر میں دیکھ کر اچنبھا ہوا مگر اس نے ظاہر نہیں ہونے دیا وہ بڑے اخلاق و احترام سے طاہرہ بیگم سے ملی۔

”میں نے چائے دم پہ لگا دی ہے تم فریش ہو آؤ پھر مل کے مٹھائی کھاتے ہیں اور چائے بھی۔ آج تو ویسے بھی ایکیش مٹھائی لائے ہیں ہم لوگ۔“ ہنسنا مسکراتا ان کا چہرہ افنی کو حیرت میں مبتلا کر گیا۔

مٹھائی کس خوشی میں امی جان۔

عامر کا رشہ طے کر دیا ہے میں نے اپنی پسند کی لڑکی سے۔ طاہرہ بیگم کے لہجے میں عامر کے لیے مان اور پیار تھا امی کو لگا انہوں نے اسے سنایا ہے کہ اب کی بار وہ اپنی پسند کی بھولا رہی ہیں ”بہت بہت مبارک ہو امی جان۔ خدا مبارک کرے“ افنی دل پر جبر کرتے مسکرائی ورنہ دل تو آج رسوا کرنے پر تلا تھا خواجواہ میں بھر بھر کے آ رہا تھا۔ پھر اس نے ان سب کے ساتھ چائے بھی پی اور مٹھائی بھی کھائی۔ کھانا بے حد خوشگوار ماحول میں لگایا گیا۔

”جاؤ اور جلدی سے تیار ہو کے آؤ۔ اس قدر رُف حلیے میں کیک کا ٹوٹی کیا؟“ رضائے اسے ڈانٹا۔

”اچھے خاصے تو میں کپڑے۔ پھر کیا کرنے ہیں۔ افنی نے منہ بنایا۔

”آج کے خاص دن کوئی بہانہ نہیں چلے گا ڈیروائف۔ آرام سے اندر جاؤ اور تیار ہو کے آؤ تمہارا تحفہ بیڈ پر رکھا ہے۔“ رضا حسن نے اس کی ایک نہیں سنی بلکہ جلدی جلدی سے اندر کا راستہ دکھایا فتنی لمحہ بھر کو اس قدر محبت اور قدر پر سکت ہو گئی ڈبڈبائی آنکھوں سے اس نے رضا حسن کو دیکھا یوں جیسے آخری بار دیکھ رہی ہو۔

”میں جانتا ہوں کہ میں بہت پینڈم ہوں اب مزید ٹائم ویسٹ مت کرو اور جا کے تیار ہو جاؤ عامر اور امی جان نے واپس گھر بھی لوٹا ہے۔“ وہ شرارت سے کہتے بظاہر اسے ڈپٹ رہا تھا ورنہ وہ بھی دل سے جانتا تھا کہ فتنی اس کے محبت کے اس مظاہر پر سمرائز ہو رہی ہے۔

”جاؤ۔ وہ پھر بھی اسے وہیں کھڑا دیکھ کے ہلکا سا چلایا تو فتنی تو اندر جانا پڑا ہاتھ روم بند کر کے وہ واش بیسن کے آئینے میں نظر آتے اپنے عکس کو دیکھ کے پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔ وہ کتنی بری عورت تھی جو اچھے لوگوں کے پیارے پیارے دلوں سے کھیلتی تھی اور خوش ہوتی تھی۔ اس کو خود سے نفرت محسوس ہوئی آگہی کا در بڑے عجیب وقت پر اس پر کھلا کچھ اس طرح کہ اس کا سب کچھ بہا کے لے گیا۔ اس کا خودی کا مان ہستی کا غرور اور نسوانیت کی پندار سب ایک ہی ٹھیس میں چکنا چور ہوتے اسے زمین بوس کر گئے تھے۔ اس نے ایسا تو نہیں سوچا تھا بدر حیات اس کی زندگی میں آنے والے سبھی مردوں سے مختلف تھا۔ وہ دل کا اچھا تھا وہ حساں تھا وہ شکی تھا نہ دقیانوسی ہاں وہ قدامت پسند تھا مگر اس کی قدامت پسندی کبھی بھی شک کے زمرے میں نہیں آئی تھی۔

وہ اتنا اچھا تھا کہ فتنی کے سنائے گئے اکثر جھوٹے مظالم کی داستان و واقعات پر وہ اس کے ساتھ مل کے روتا۔ دنوں اس کی دل جوئی کرتا اسے خوش رہنے کی تاکید کرتا اور اسے ہنسانے کے لیے کتنے ہی جتن کر ڈالتا۔ فتنی کو اپنی نجی ضروریات کے لیے بھیا سے پیسے نہیں ملتے اس لیے وہ فتنی کے کہنے کے باوجود ہی اس کے پرسنل اکاؤنٹ میں اسے ماہانہ رقم بھیج دیا کرتا وہ اسے ابھی سے اپنی ذمہ داری سمجھنے لگا تھا اور ذمہ داریوں کو بخوبی نبھانا اسے آتا تھا وہ ایک اچھا کامیاب انسان ہونے کے ساتھ ایک اچھا دوست شوہر اور باپ بننا چاہتا تھا اس نے ساری زندگی اپنے باپ کے لیے اپنی ماں کو روتے دیکھا تھا وہ خود باپ کی توجہ و محبت کے لیے ترستار ہا تھا فتنی کے دکھ اسے اپنے دکھ لگتے تھے اسی لیے اس نے سوچا دو ٹوٹے بکھرے لوگ ایک مضبوط آشیانہ بنائیں گے۔ وہ اپنے آشیانے کے لیے خواب دیکھنے لگا محنت کرنے لگا اپنے اندر کی برائیاں چھوڑنے لگا فتنی کے بھائی کہیں اسے سگریٹ نوشی کرنے کی وجہ سے رنجکٹ نہ کر دیں اس نے دوبارہ سگریٹ کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا۔ اس نے سگریٹ چھوڑ دی کبھی کبھار شدید ٹینشن میں پی لیتا عام طور پر نہیں فتنی کے بھائی نماز روزے اور زکوٰۃ دینے کے پابند ہیں وہ نماز پڑھنے لگا اس نے روزے رکھنے شروع کر دیے اور غریب غرباء کے لیے زکوٰۃ باقاعدگی سے ادا کرنے لگا۔ اس نے کبھی کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کی تھی اب مزید محتاط ہو گیا اس کی ذرا سی غلطی کسی کا دل دکھا سکتی ہے اور اس شخص کی آہ کہیں فتنی کو اس کی زندگی سے نکال نہ دے۔ وہ قدم پھونک پھونک کے رکھتا تھا پھر بھی تقدیر نے اس کا ساتھ نہیں دیا تھا تقدیر نے اس کا ساتھ کیوں نہیں دیا تھا۔ کافی ٹیمبل کے پاس ویسے ہی دوزانو بیٹھے اس نے اپنے بالوں کو نوچتے

۲ چاہتا اس کے سر میں خون کی گردشیں معمول سے کہیں اور زیادہ جان لیوا تھی بار بار اور متواتر بجنے والا موبائل اب تھک کر خاموش تھا آخر کال کرنے والا کتنی ثابت قدمی دکھا سکتا ہے جانے کتنی دیر گزر گئی وہ وہیں بیٹھا رہا سوچتا رہا اور روتا رہا تبھی اس کا فون پھر بجا تھا۔ بدر نے نمبر دیکھے بغیر بھی جان لیا کہ فون کس کا تھا دنیا میں افقی کے علاوہ وہ صرف ایک ہی شخص کے قریب تھا اور وہی شخص یہ بات بھی جانتا تھا کہ آج وہ افقی کو باقاعدہ اور باضابطہ طور پر پوز کرنے والا ہے۔ دوپہر شام میں اصل گئی تھی اور شام رات میں تبدیل ہو رہی تھی اس شخص کو یقیناً بے چینی ہوگی وہ اپنے دوست کی زندگی میں در آنے والی مسین تبدیلی کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین ہوگا تبھی بار بار کال کر رہا تھا بدر نے فون اٹھا کے کان سے لگایا۔

”وہ مجھے چھوڑ کے چلی گئی ہے!“ فون آن ہوتے ہی بدر نے ضبط کے پل صراط پر کھڑے ہوتے مقابل کے حواسوں پر ہم گرایا۔

”اور تم نے اسے جانے دیا؟“ ٹھہرے ہوئے لہجے میں حیرت و دکھ سے زیادہ تھکن تھی۔

”میں اسے روک نہیں پایا“ بدر کا لہجہ ٹوٹنے لگا آواز بھرانے لگی۔

”محبت کمزور نہیں ہوتی“ دوسری جانب جیسے اسے تنبیہ کی گئی۔

”ہو جاتی ہے کبھی کبھار۔ جیسے ماما کی ہوئی تھی۔“

”تم تاریخ دہرانا چاہتے ہو۔“ اب کی بار مقابل کے لہجے میں حیرت و غصہ یکجا تھا آواز بھی قدرے بلند ہو گئی۔

”تاریخ دہرانا کوئی بھی نہیں چاہتا وہ خود اپنا آپ دہرائی ہے“ بدر کی آواز بھیگنے لگی۔

”تم مرد ہو کے ایک عورت سے ہار گئے بدر حیات۔“ آواز میں استہزاء تھا۔

”وہ عورت میری محبت تھی اور محبت محض طاقت و زبردستی نہیں بناتی کبھی کبھار بزدل بھی بنا دیتی ہے“ بدر زمین پر دیے

ہی ساکت و منامت بیٹھا تھا اس کا لہجہ سرد اور قدرے سفاک تھا۔

”حیرت کی بات ہے بدر حیات۔ اس نے تمہیں کہا کہ مجھے چھوڑ دو اور تم نے اسے اتنی آسانی سے چھوڑ دیا۔ تم

نے تو محبت کی توہین کر دی ہے تم محبت کو پانے کی کوشش تو کرو۔ پہلے مرحلے پر ہی ہار مان گئے کیا؟“

”میں اسے کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتا یا۔“ بدر نے اب کی بار تھکے تھکے سے لہجے میں اعتراف کیا تو دوسری

جانب وحید اقبال کا دل چاہا اپنا سر پیٹ لے۔

”تو تم سے جدا ہو کے وہ کونسا خوش رہے گی بدر۔ تم تو اسے بچ راہ میں چھوڑ کے اس کی مشکلات میں اضافہ

کر رہے ہو۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ وہ ساری عمر روتی رہے؟“ وحید اقبال کے آخری جملے نے بدر حیات کی ساری ہستی ہلا دی

تھی۔ اس کا رواں رواں ”نہیں“ کی گردان بن گیا۔

”جاؤ“ یک لفظی لفظ میں چھپی تنبیہ بدر حیات کے اندر ایک نئی طاقت بھر گئی۔ وہ تیزی سے اٹھا اور اس کے گھر

جانے کے لیے ہوٹل سے باہر نکل آیا اس کے گھر کا ایڈریس وہ جانتا تھا ایک دو بار افقی کو اس نے اپنی تصویریں پوسٹ کی

تھیں۔ اس نے تبھی اس کا ایڈریس محفوظ کر لیا تھا۔ راستے بھرا سے خود پر غصہ آتا رہا تھا اس نے کتنا غلط کیا تھا افقی کو جانے دے کے اس نے افقی کا مان توڑ دیا تھا کچھ نہ کہہ کے۔ اس نے محبت کا مان توڑ دیا تھا افقی تو رو رو کے پاگل ہو چکی ہوگی بدر کو سوچ کے دکھ ہوا۔

وہ جیسے تیسے کر کے اس کے بھائی کو منالے گا چاہے اسے اس کے پیروں پر کیوں نہ گرنا پڑے وہ افقی کے ساتھ کی بھیک مانگے گا اسے یقین تھا افقی کے بھائی مان جائیں گے وہ انہیں منالے گا کسی بھی طرح کسی بھی طریقے سے۔ اس نے سوچ لیا تھا۔

☆.....☆.....☆

”واؤ۔ یولک آؤٹ اسٹینڈنگ“ وہ تیار ہو کے باہر آئی تو رضا کا تعریفی جملہ اس کے کانوں میں پڑا تھا وہ ہولے سے مسکرائی بے تحاشا رونے کے باعث اس کی آنکھوں میں سرخ ڈورے تیرنے لگے تھے بھاری میک اپ کی تہہ بھی انہیں چھپا نہیں سکی تھی رضا لپک کے اس کے پاس آیا۔

”کیا ہوا جان تمہاری آنکھیں کیوں اتنی سرخ ہو رہی ہیں؟“ رضا کے لہجے میں بے چینی بھری تڑپ تھی۔

”آنکھ میں صابن چلا گیا تھا اسی لیے۔“ افقی نے فوراً بہانہ بنا لیا۔

”دھیان رکھا کرونا“ رضا کے لہجے میں فکر مندی تھی۔ کہیں انفیکشن ہی نہ ہو جائے خیر تم رات کو سوتے وقت کوئی آئی ڈراپس ڈال لینا۔ رضا کی تشفی نہیں ہو پا رہی تھی۔

”آپ خواہ مخواہ ٹینشن لے رہے ہیں رضا۔ میں بالکل ٹھیک ہوں ڈونٹ وری؟“

”کیا کروں۔ اتنی حسین بیوی اور وہ بھی بے تحاشا محبت کرنیوالی کوئی کافر ہی ہوگا جو اتنی اچھی بیوی کی پرواہ نہیں کرے گا اور میں نہ تو کافر ہوں نہ بد بخت۔“ رضا کو فرائض انداز میں کہتے وارفتہ انداز میں اس پر جھکا افقی نے منہ بگاڑ کے انہیں دیکھا۔

”بند کر دیں اب اپنی نوٹسکی۔ کچھ تو خیال کریں۔“ عامر ہنستا ہوا ان دونوں پر چوٹ کر رہا تھا۔ وہ دونوں انہیں

دیکھ کے ایک ساتھ چوٹے اور مسکرا دیے۔

”ایک تو یار۔ تم نے ہمیشہ کی طرح آج بھی غلط وقت پر انٹری دی ہے میاں بیوی کے رومانس میں خلل ڈالنے والے تم جیسے ہی نالائق ہوا کرتے ہیں۔“ رضا حسن نے مسکراتے ہوئے بے حد شگفتہ انداز میں عامر حسن پر چوٹ کی تھی آج تو رضا حسن کی شگفتگی عروج پر تھی وہ بات بے بات مسکرا رہا تھا اپنی خوشی کا اظہار کر رہا تھا تبھی بیل ہوئی تھی اور متواتر ہوئی تھی۔

”میں دیکھتی ہوں۔“ افقی اس ماحول سے نکلنا چاہ رہی تھی تبھی دروازے پر ہونیوالی دستک کو اس نے غنیمت جانتے فرار کی راہ تلاش لی تھی۔ وہ دل ہی دل میں حیران ہوئی دروازے تک آئی تھی یہ ایک مکمل گھریلو فنکشن تھا تبھی افقی کو حیرت ہوئی تھی کہ کون اس وقت آسکتا تھا اس نے لپک کر دروازہ کھولا اور خود کو برف کے مجسمے میں ڈھلتے محسوس کیا تھا۔

”تم یہاں۔“ وہ بدر کو وہاں اپنے گھر کے دروازے سے سامنے اجڑی بکھری حالت میں دیکھ کے حیران ہوئی تھی وہ لودنک سب سے تیار شعلہ جوالہ بنی اس کے سامنے کھڑی تھی مگر بدر نے ٹوٹس نہیں کیا وہ تو محبت کی آگ میں جل کر بھسم ہو چکا تھا بصارت رکھتے ہوئے بھی بصیرت نہیں تھی اس کے پاس۔

”میں آگیا ہوں افقی۔ اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں خود عامر بھائی سے ہماری شادی کی بات کروں گا انہیں مناؤں گا۔ وہ دیوانگی کی حالت میں صورتحال کا اندازہ لگائے بغیر بول رہا تھا افقی کو اپنے ہاتھوں کے سارے تو تے آن واحد میں اڑتے محسوس ہوئے۔

”ہمارے گھر میں فیملی فنکشن چل رہا ہے بدر۔ تم اب خدا کے لیے اس وقت یہاں سے چلے جاؤ میں صبح آؤں گی پھر مل کے بات کریں گے افقی نے اسے ٹالتے وہاں سے بھیجنے کی کوشش کی۔

”میں نہیں جاؤں گا افقی۔ تمہیں ان حالات میں چھوڑ کر۔ میں یہاں جانے کے لیے نہیں آیا۔“ بدر کے لہجے میں چٹانوں جیسی سختی تھی۔

”آؤ افقی آ کے ایک کاٹو۔ آپ تو دروازے میں ہی جم..... عامر کی زبان کو یک لخت بریک لگے تھے ایک اجنبی کو گھر کی دہلیز میں کھڑے دیکھ کر حیران ہونے سے زیادہ وہ افقی کے چہرے پر اڑتی ہوئیاں دیکھ کر متوش ہوا تھا۔

”تم جاؤ بدر..... میں صبح آ کے بات کروں گی پلیز.....“ افقی نے جلدی سے بدر کو باہر نکال کے دروازہ بند کرنا چاہا دروازہ بند کرنے کی خواہش میں بدر کو پیچھے ہٹاتے افقی کا دایاں ہاتھ بدر کے سینے پر پڑا تھا عامر نے اس بے تکلفی کے مظاہرے کو سلگ کے دیکھا۔

”نہیں افقی۔ میں عامر بھائی کو آج منا کے ہی جاؤں گا۔“ وہ اسے کندھے سے پکڑے پیچھے ہٹا کے اندر بڑھ آیا افقی متوش سی پیچھے لپکی مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا وہ لاؤنچ میں سب لوگوں کے درمیان پہنچ چکا تھا۔ طاہرہ بیگم بچوں کے ساتھ کھیل رہی تھیں رضا اسود کو گود میں لیے بیٹھا تھا ایک اجنبی لڑکے کو اپنے گھر کے لاؤنچ میں دیکھ کر چونکا۔

”یہ کون ہے افقی۔“ رضا اسود کو گود سے اتارنے کے بعد کھڑا ہو گیا تھا۔

افقی کو لگا اس کی موت آچکی ہے قیامت کا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے روشن تھا۔

روزِ محشر کے دن لگنے والی عدالت افقی کے سامنے آج لگی تھی اس کی شادی کی پانچویں سالگرہ کے روز۔ جس روز اس نے رضا حسن کے ساتھ اپنی زندگی کی شروعات کی۔

”میں بتاتا ہوں عامر بھائی۔ بدر لپک کے آگے بڑھا وہ رضا کو عامر سمجھ رہا تھا۔ افقی کا دل چاہا وہ کہیں سے سلیمانی ٹوپی لے کر بدر کے سر پر پہنانا اسے ہمیشہ کے لیے کہیں غائب کر دے یا پھر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کے اسے خاموش کرادے۔

”میں اور افقی ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں اور شادی کرنا چاہتے ہیں۔“ بدر نے رضا حسن کی آنکھوں میں

آنکھیں ڈال کے دھماکہ کیا رضا حسن کی پوری ہستی ہل گئی طاہرہ بیگم بھی مارے حیرت کے اٹھ کھڑی ہوئیں بدر کے انکشاف نے وہاں موجود کھڑے سبھی افراد کو انگشت بدنداں کر دیا تھا۔

”یہ کیا بکواس ہے۔؟“ رضا حسن کے اندر کا غیرت مند مرد بلبلاتا تھا۔

”یہ بکواس نہیں حقیقت ہے عامر بھائی۔ پوچھ لیں افقی سے ہم ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے ہیں ساتھ گھر بسانا چاہتے ہیں؟“ بدر لپک کر افقی کا ہاتھ پکڑ کر اسے آگے لے آیا۔

”یہ پاگل ہے رضا۔ میں اسے نہیں جانتی؟“ افقی کو لگا اگر ابھی وہ نہ بولی تو بہت دیر ہو جائے گی اور دیر تو ہو چکی تھی افقی نے ایسا کیسے سوچا تھا کہ وہ چنے کا بج بو کے گندم کاٹنے کی امید رکھے گی۔ بول بو کے گلاب نہیں اُگائے جاتے۔

”افقی۔“ بدر کے لہجے سے دکھ و حیرت یکساں پنہاں ہو کے عیاں ہوا اسے لگا وہ اپنے بھائی کے سامنے ڈر گئی ہے اسی لیے مگر گئی ہے وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے تسلی آمیز لہجے میں بولا۔

”تمہیں اب ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اب میں آگیا ہوں؟“ اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے اس لیے اپنے ہونے کا احساس دلایا۔

”یہ کیا ڈرامہ ہے لڑکے کھل کے کہو“ طاہرہ بیگم کسی انہونی کے خیال کے پیش نظر تھوڑا غصے سے بولی تھیں۔

”ماں جی۔ آپ تو یقیناً سمجھیں گی افقی صرف اپنے بھیا بھائی کے خوف سے ایسا کہہ رہی ہے۔ میں بدر ہوں افقی کا دوست لاہور سے اس کو ملنے آیا ہوں اور ہم ایک دوسرے سے بہت پیار کرتے ہیں پوچھ لیں اس سے۔“ افقی نے اپنا ہاتھ غصے سے بدر کے ہاتھ سے چھڑایا۔

”کیا بک رہے ہو بدر۔ نہیں جانتی میں تمہیں چلے جاؤ یہاں سے“

افقی ایک دم سے چیختی تھی وہ ناچا ہتے ہوئے بھی خود کو عیاں کر گئی تھی۔

”کیا یہ سچ کہہ رہا ہے افقی۔ طاہرہ بیگم نے سب سے پہلے خود کو سنبھالا تھا۔

”نہیں امی جان۔ میں نہیں جانتی یہ مجھے کیسے جانتا ہے میں نے تو اسے کبھی دیکھا بھی نہیں“

افقی بے ربط سے انداز میں کہنے بدر کو حیران کر گئی بدر کو سمجھ نہیں آیا افقی ایسا کیوں کر رہی ہے۔

”بدر..... تم نے سنا بھی افقی نے کیا کہا۔“ طاہرہ بیگم اس کی جانب مڑیں بدر نے افقی کی بے اعتنائی پر اسے شکوہ کناں نظروں سے دیکھا آخر اسے اتنا ڈرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ وہ اسے اپنانے کے لیے آیا تھا اس کا ہاتھ تھامنے کے لیے ساتھ بھانے کے لیے۔

”افقی صرف آپ لوگوں کے ڈر کی وجہ سے اقرار نہیں کر رہی۔ ورنہ آج صبح ہی ہم لوگ ملے ہیں اور اس نے مجھے بتایا ہے کہ اس کے بھائی نے اس کا رشتہ زبردستی اس کی بھائی کے بھائی سے طے کر دیا ہے۔ مگر میں ایسا نہیں ہونے دوں گا افقی میری زندگی ہے میں اسے نہیں چھوڑ سکتا۔“ آخری بات پر عامر کے کان کھڑے ہوئے۔

”کینی انسان۔ تیری تو میں زبان کھینچ لوں گا اگر اب افقی کا نام بھی لیا تو.....“ اس سے پہلے کہ رضا اس پر جھپٹتا عامر نے آگے بڑھ کر اسے پکڑ لیا۔

”افقی میری بیوی ہے اور میرے بچوں کی ماں..... تم اپنا یہ گھٹیا ڈرامہ کہیں اور جا کے رچانا۔“ رضا حسن نے عامر سے خود کو چھڑاتے ہوئے چلا کر کہا اور بدر نے خود پر ٹھنڈے پانی کی بالٹی پڑتی محسوس کی یا نہیں کوئی حیرت درد کا گلشیر تھا جو اس انکشاف کے بعد بدر حیات کے جذبات منجمد کر گیا تھا۔ دنیا جہان کی ساری حیرت بدر حیات کی آنکھوں میں سمٹ آئی۔ بدر کا انداز افقی سمیت وہاں موجود کبھی افراد کوں کر گیا تھا۔ مگر نہیں۔ بدر حیات کو کسی بھی ڈرامے کے سامنے ہار نہیں مانتی تھی وہ اب آگیا تھا اس نے افقی سے محبت کی تھی اسے اپنانے کی بات کی ہے وہ اب پیچھے نہیں ہٹ سکتا تھا کسی بھی قیمت پر نہیں۔ وہ اپنی دھن کا پکا تھا ضدی تھا لیکن اس سے بھی بڑھ کے وہ پر عزم تھا زبان رکھتا تھا وعدے کی پاسداری کو جان دینے کی حد تک نبھانے کا قائل تھا۔

”آتم سوری بدر صاحب..... آپ کو شاید غلط فہمی ہوئی ہے افقی میری بھابھی ہیں آج ان کی شادی کی سالگرہ ہے اور یہ رضا حسن کی وائف ہیں.....“ عامر نے ساری صورتحال کو سمجھتے ہوئے بدر حیات کو وہاں سے چلے جانے کے لیے کہا تھا اشتعال کی ایک تیز رولہ بدر حیات کی رگ و پے میں نفرت بن کے دوڑی۔

اتنا بڑا دھوکہ اتنا بڑا جھوٹ اس قدر غلط بیانی۔ بدر حیات کو آسمان سے زمین کی طرف بیچ گیا۔ افقی نے اسے بے وقوف کیوں بنایا تھا آخر کیا وجہ و محرک کارفرما تھی اس سارے معاملے کے پیچھے۔ اس نے لحوں میں حساب لگایا اور ٹھان لی۔

”افقی سچ کیا ہے؟ رضا حسن نے افقی کے چہرے پر ہوائیاں دیکھیں تو پوچھے بغیر رہ نہیں سکا۔

”سچ بولو افقی اور بتا دو سب کچھ سچ سچ۔ ابھی تھوڑا مشکل ہے مگر اس کے بعد ہم اپنی من پسند زندگی گزاریں گے۔ کہہ دو سب سچ سچ چھوڑ دو ایسی ناپسند زندگی ہمارے پاس ایک اچھا موقع ہے۔“ وہ اسے اُکسارہا تھا۔ افقی بے ساختہ رو دی۔ محض تفریح میں کھیلا جانے والا کھیل اسے تباہی کے دہانے پر لے آیا تھا۔ نہ وہ اقرار کر سکتی تھی نہ ہی انکار۔ اقرار کرتی تو گھربتاہ ہوتا انکار کرتی تو بھی گھربتاہ ہوتا بدر حیات کی ناراضی سہنا آسان کہاں تھا پھر رضا حسن جیسا شوہر چھوڑنا۔

”افقی..... کیا یہ لڑکا سچ کہہ رہا ہے۔ تمہارا کیا تعلق ہے اس کے ساتھ اور تم نے اسے کیا کیا بنا رکھا ہے؟“ رضا حسن بے حد سرد اور کیٹیلے لہجے میں کہتا افقی کے سامنے آکھڑا ہوا افقی کی جان پر بن آئی افقی نے ایک نفرت کی نگاہ بدر حیات پر ڈالی اس نظر میں شکوہ تھا درد تھا غصہ تھا بدر حیات اسے دیکھ کے مسکرایا ایک انتقامی مسکراہٹ وہ اپنی ماں پر نہیں گیا تھا کہ جب اس کے باپ نے دوسری شادی کی اس کی ماں نے موت کو گلے سے لگا لیا۔ اور بدر حیات کے باپ کو کبھی اندازہ ہی نہ ہو پایا کہ اس کی بیوی کو کون سا غم مار گیا ہے۔

بدر حیات ٹھان چکا تھا اس نے اپنی محبت کو کسی بھی قیمت پر حاصل کرنا تھا۔ کسی بھی قیمت پر۔ اپنے راستے میں

آنے والی ہر رکاوٹ کو اس نے ٹھوکر پر رکھنا تھا۔ اور اس وقت وہ اپنی اسی اسٹریٹیجی پر عمل کر رہا تھا۔
افتی نے اس کے ساتھ اس کے جذبات کے ساتھ اس کی زندگی کے ساتھ کھیل کھیلا تھا۔ بدر حیات وہی کھیل
اب اس کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ بدر حیات زندگی میں اتنے دکھ دیکھ چکا تھا کہ اسے اپنا ہر دکھ اب اپنے قد سے چھوٹا لگنے لگا تھا
وہ خود کو اب سنبھالنے لگا تھا۔

”رضا۔ آپ میری بات کا یقین کریں یہ لڑکا جھوٹ کہہ رہا ہے آپ تو اپنی افتی کو جانتے ہیں ناں۔ آپ تو مجھ
سے بہت پیار کرتے ہیں میرا اعتبار کرتے ہیں۔“ افتی رضا حسن کے کندھے سے لگ کے روتے تڑپتے اپنی سچائی کا یقین
دلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”یہ بات تو تم مجھے بھی کہتی ہو افتی۔ ڈرو مت افتی تمہاری جو بھی حقیقت ہے میں اسے قبول کرنے کو تیار ہوں۔
میں نے تم سے سچی محبت کی ہے اور میری محبت کا ظرف اتنا وسیع ہے کہ تمہاری بڑی سے بڑی خطا معاف کر سکوں۔“ وہ اسے
اُکسار ہاتھ آگھکھوں میں محبت کے دیپ روشن کیے۔

”سوری بدر۔ میں نے تمہارے ساتھ غلط کیا مگر مجھے تمہارے اتنے گہرے جذبات کا پتہ نہیں تھا مجھے جیسے ہی
اندازہ نہ کھیل ختم کر دیا پلزی یہاں سے چلے جاؤ میں اپنی زندگی میں بہت خوش ہوں۔“ افتی رضا حسن کی موجودگی کی پرواہ
کیے بغیر بدر حیات کی منت سماجت کر رہی تھی ایک وقت انسان پر آتا ہے جب سارے راستے مسرور ہو جاتے ہیں۔ اپنے
بنائے جال میں افتی خود ہی پھنس رہی تھی بُرائی مکڑی کے جال کی مانند ہے بظاہر بہت پرکشش باریک اور نفیس مگر ریشم کے
پتھوں کی مانند جو الجھتا ہے مگر ٹوٹتا نہیں بالکل اسی طرح بُرائی سے بچ نکلتا مکڑی کے جال سے زندہ و سلامت باہر نکلنے جیسا
ہے وہ جتنا آسان دکھتا ہے اتنا ہی پر پیچ اور گھمبیر ہوتا ہے۔ اور گناہ کبھی چھپتا نہیں وہ کبھی نہ کبھی ہمارے سامنے آکھڑا ہوتا
ہے افتی یہ بات بھول گئی تھی اکثر لوگ بھول جاتے ہیں۔

”میں نے تمہیں اپنانے کی بات کی تھی افتی..... آج تمہیں یہاں اپنے ساتھ لے کے ہی جاؤں گا۔ بدر حیات
نے دونوں لہجہ اپنا یا رضا حسن نے افتی کو دیکھ کے زمین پر تھوک دیا۔ افتی نے دہل کے دیکھا وہ غضبناک ہو رہا تھا اس کی
آنکھیں قہر برسا رہی تھیں وہ خود زہر آلود ہو رہا تھا۔

”آج میں نے تمہیں تھوک دیا افتی۔ میری طرف سے تم آزاد ہو اب چاہے جہاں مرضی اپنے جس عاشق کے
ساتھ رہو۔ میں غلط تھا جو تم پر اتنا اندھا اعتماد کرتا رہا۔“ رضا حسن بول نہیں پھینکا رہا تھا اعتماد کی بہت اونچی مسند سے وہ گرا تھا
اپنے وجود کے پر نچے سینے کو ایک عمر کا کافی تھی اپنے آنسو اندر گرائے وہ ضبط کے کڑے مراحل سے گزر رہا تھا۔

”آپ ایسا نہیں کر سکتے رضا۔ آپ تو میری محبتوں کے امین ہیں میرے صادق جذبوں کے گواہ ہیں۔ یہ شخص
جھوٹ بول رہا ہے۔“ وہ روتے روتے بے حال ہو گئی اور بے حال ہو کے رضا حسن کے قدموں پر جھک گئی وہ نہیں جانتی تھی
کہ اب کی بار جو وہ گری ہے تو اب ساری عمر اسے گرے ہی رہنا ہے وہ کبھی سر نہیں اٹھاپائے گی سر اٹھا کر چلنا تو دور کی بات۔

رضاحسن نے اس کے ہاتھوں سے اپنے پیر نوراً چھڑائے انداز ایسا تھا بدکنے کا گویا اسے کسی پلید چیز نے چھو لیا ہو۔
 ”یہ شخص جھوٹ نہیں بول رہا الفتی..... اس بات کی گواہی میں دے سکتا ہوں آج صبح میں نے تمہیں خود اس سے ملنے کے لیے جاتے دیکھا ہے اور میں پہلے تمہارے کھیل اور تمہاری چالاکی نہیں سمجھ پایا مگر اس وقت آج یہاں اس شخص کو دیکھ کر مجھے یقین آ گیا کہ امی جان کتنا صحیح کہا کرتی تھیں۔“ عامر نے بھی اپنے حصے کی آگ اگلی۔

”تم بچ میں مت بولو۔ تم تو خود میرے پیچھے پھرتے تھے تم کہاں کے حاجی ثناء اللہ ہو۔“ الفتی روتے روتے بھری تو طاہرہ بیگم نے عامر حسن کو خاموش رہنے کی آنکھوں ہی آنکھوں میں تلقین کی۔

”بہت شوق ہے ناں تمہیں کہ لوگ تمہارے حسن کے قصیدے پڑھیں۔ جاؤ اب کسی بازار کی زینت بن کے بیٹھ جاؤ وہاں بہت آئیں گے تمہارے چاہنے والے“ عامر حسن ماں کی تنبیہ بھولے زہرا گل رہا تھا۔

”کہاں کمی رہ گئی تھی میرے پیار میں الفتی کہ تم نے باہر دوستیاں پالنی شروع کی کر دیں۔“ رضاحسن کے لہجے میں شکوہ تھا طاہرہ بیگم کا دل کٹ کر رہا گیا کوئی اور عورت ہوتی تو اس شکوے پر کٹ کے مر جاتی مگر الفتی زندہ کھڑی رہی اسے اپنی صفائی دینا تھی۔

”میں قسم کھا کے کہتی ہوں رضا۔ میں نے آپ سے کوئی بے وفائی نہیں کی ہاں جس میں کچھ دیر اس سے بات

.....
 ”کیا بات کر رہی ہو اُتین حیدر ہماری محبت پاکیزہ ہے ہمیں ان لوگوں کو کوئی صفائی نہیں دینی۔ بدر حیات اس کی بات کاٹتے الفتی کو بال نوچنے کی حد تک زچ کرتے مجبور کر رہا تھا۔ تبھی کب سے خاموش کھڑی طاہرہ بیگم کو بولنا پڑے۔
 ”رضاحسن..... تمہاری رگوں میں ایک با کردار ماں کا خون دوڑ رہا ہے کیا تم چاہو گے کہ تمہاری اولاد کی پرورش ایک ایسی عورت کے ہاتھوں ہو جس کا کردار مشتمی ہو۔ اچھی طرح سے سوچ لو اور فیصلہ کر لو کیونکہ جو کچھ تم آج دیکھ رہے ہو اسے میں پانچ سال پہلے دیکھ چکی تھی۔ مجھے اب اس عورت کو تمہارے گھر نہیں رکھنا تمہاری خواہش ہو آنکھوں دیکھی کبھی نکلنے کی تو پھر میری وصیت ہوگی کہ تمہیں میری مری ہوئی کا منہ بھی نہ دکھایا جائے۔“ الفتی نے خوف سے آنکھیں پچ لیں ورنہ دیکھتی کہ بدر حیات مسکرارہا تھا۔

”میں رضاحسن بھائی ہوش و حواس تمہیں طلاق دیتا ہوں۔ طلاق دیتا ہوں طلاق دیتا ہوں..... اُتین حیدر ساکت ہو گئی بہت دیر گزر گئی کچھ دیر پہلے خوشیوں کا گہوارہ بنا گھر اب موت کی سسکیوں میں ڈوب گیا طوفان آ کے تباہی مچا کے گزر گیا بچے رضاحسن نے چھین لیے الفتی نے زیادہ اصرار بھی نہیں کیا بدر حیات نے اسے دونوں کندھوں سے تھام کر باہر لاکے گاڑی میں بٹھایا رضاحسن کی تکلیف میں اس فاشی کو دیکھ کے اور بھی اضافہ ہوا۔ الفتی سے اس نے سچی محبت کی تھی ہمیشہ اس کی خوشی کی پرواہ کی تھی مگر الفتی نے اسے اتنا بڑا زخم دیا تھا کہ بچپلی عمر اس کی بھر پائی ممکن نہیں تھی۔ وہ ٹوٹ کے بکھر گیا تھا اس کا اعتبار و اعتماد کچی کرچی ہوا تھا۔ کوئی پوچھا بھی کرتا ہے کسی کے ساتھ یوں بھی ہوتا ہے جیسا اُتین حیدر نے رضاحسن

کے ساتھ کیا تھا۔ اپنے بچھائے جال میں افقی نے خود ہی پھنس گئی تھی بدر حیات کے لیے کچھ دیر قبل محسوس کیا جانے والا درد اب یکسر ختم ہو گیا تھا اس کی جگہ اب غصے اور نفرت نے لے لی تھی اسے بدر حیات کی کمینگی پر غصہ تھا اس نے اس کا گھر تباہ کر دیا تھا اپنا گناہ وہ بھول گئی تھی۔ بدر اسے لے کر سیدھا لاہور آیا تھا ماں باپ کے گھر بدر نے جانے نہیں دیا نہ ہی انہوں نے اب اسے قبول کرنا تھا اس کے والدین کی ایک عزت تھی۔ معاشرے میں وہ اپنی نیک نامی کی وجہ سے جانے اور پہنچانے جاتے تھے۔ افقی کی لگائی کا لک وہ ساری عمر دھونہ پاتے بدر حیات نے ایک طرح سے نادانستہ ان پر احسان کیا تھا..... راستے بھرا افقی خاموش رہی اور بدر حیات بھی۔ مگر وہ بدر کی خاموشی سے اس کے موڈ کا اندازہ نہیں لگا پائی۔ اس کے اندر ہی خود پسند عورت نے زیادہ دیر اسے رضا حسن کی بے اعتنائی و بے اعتباری کا غم منانے نہیں دیا۔ اس کے زرخیز دماغ نے بہت جلد تمام حقیقت کو قبول کرتے آئندہ کے لائحہ عمل کو تیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے ایک نئی چال چلنی شروع کی تھی۔ بدر حیات افقی کے خیال میں اس سے محبت ہی نہیں بلکہ دیوانگی کی حد تک عشق کرتا تھا وہ یقیناً اس کی خطا معاف کر دے گا وہ اس سے معافی مانگے گی بدر کا غصہ اترتے ہی وہ دونوں شادی کریں گے پھر وہ دونوں ساری زندگی ایک دوسرے کے وفادار رہیں گے افقی کبھی اسے شکایت کا موقع نہیں دے گی۔ مگر وہ یہ بھول گئی تھی کہ بدر حیات نے اس افقی سے محبت نہیں کی تھی جو دغا باز تھی جھوٹی اور مکار تھی اس نے اس افقی سے محبت کی جیسی اس نے بدر حیات کے سامنے خود کو بنا کے پیش کیا تھا۔ نفرت کا ایک بے کراں سمندر تھا جو آن کی آن میں بدر حیات کے وجود میں اٹھا تھا مگر وہ اس طوفان کو اپنے اندر سموئے نظارہ پر سکون نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا..... افقی اسے خاموش اور پرسکون دیکھ دیکھ کے نئے نئے منصوبے بناتی رہی کبھی انہیں توڑتی کبھی انہیں جوڑتی رہی..... اس جوڑ توڑ میں سارا سفر کٹ گیا بدر حیات اسے اپنے گھر لے آیا۔ وہ گھر جہاں اس نے افقی کے ساتھ رہنے کے خواب دیکھے تھے افقی کی سوچ سے بھی زیادہ بدر حیات کا گھر حسین تھا۔ دنیاوی آسائشوں سے ہر لحاظ سے مکمل اور بھرپور اور بے حد خوبصورت..... گھر پہنچنے کے بعد افقی جب بدر فریش ہو کے باہر آیا تب اسکے پاس آئی تھی۔

”سوری بدر..... میں آپ کو سب کچھ سچ بتا دینا چاہتی تھی مگر آپ کو کھودینے کے خوف سے میں آپ کو اپنی اصلیت بتا نہیں پائی۔ میں آپ سے محبت کرنے لگی تھی.....“ بدر کا لفظ محبت پر خون کھولنے لگا۔ اس کے سارے جسم کی رگیں تن گئیں وہ جو بھی کہتی مگر اسے محبت کا نام دوبارہ اپنی کہانی میں نہیں جوڑنا چاہیے تھا یہ اس نے بہت بڑی بھول کی تھی اور اس کی خمیازہ یقیناً اسے بہت عبرتناک بھرنے لگا تھا۔ بدر حیات نے اس کے خوبصورت چہرے پر اپنی پوری طاقت لگا کے تھپڑ مارا وہ چکنے فرش پر پھسلتی دور جا گری۔

”جتنا چاہیں مار لیں..... جیسی چاہیں سزا دے لیں مگر میری بات کا یقین کریں میں آپ سے محبت کرتی ہوں میں آپ کا دل نہیں توڑنا چاہتی تھی وہ جھوٹ بول کے آپ کو چھوڑ آئی تھی ہمیشہ کے لیے.....“ افقی کو لگا اب وہ کچھ سمجھے گا بدر حیات خاموش کھڑا کچھ دیر سوچتا رہا۔ افقی کی ہمت بندھی وہ اس کے قریب آئی۔

”آئی۔ لو۔ یو بدر جو ہوا اسے بھول کے ہم ایک اچھی اور بہتر زندگی کا آغاز کریں گے۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر لمبی تھی مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ اس نے یہ بات کر کے بدر حیات کے اندر بے درندے کو آواز دی ہے بدر حیات نے اس کا ایک وحشت کے عالم میں اپنے گھونسلوں لاتوں اور تھپڑوں کی بارش کر دی تھی وہ ہدیان بک رہا تھا اس کے اندر کا فرسٹرینڈ اور کاسیکلیڈ مرد باہر نکل آیا تھا۔

”کیوں کیا میرے ساتھ ایسا..... آخر کیوں؟“ وہ ہدیان انداز میں اسے ٹھوکروں کی زد میں رکھتے چلایا۔ افقی مار

کھا کھا کے ادھ موٹی ہو گئی اس کا ہونٹ پھٹ گیا خون رسنے لگا۔

”تمہیں پتہ تھا میری محرومیوں کا..... میرے دکھوں کا پھر کیوں کیا میرے جذبات سے کھلوا.....“

وہ اس کے خون آلود چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں جکڑے آنکھوں میں وحشیانہ پن بھرتے پوچھ رہا تھا افقی کا جبر سختی سے اس کے دونوں ہاتھ میں بھینچا تھا وہ بول نہیں پائی بدر کو اور تاؤ چڑھا اس نے غصے سے اس کے خوبصورت چہرے پر تھوکا۔ افقی نڈھال ہو کے گر گئی وہ اسے مارتا رہا اس نے اسے اتنا مارا کہ بدر حیات کے ہاتھ دکھنے لگے۔

”بہت ناز ہے تمہیں اپنے خوبصورت ہونے پر۔ اب میں تمہیں خراج پیش کروں گا؟“ اس نے وسفاکیت سے کہتے ادھ موٹی فرش پر لیٹی افقی کو گھسیٹا اور تیز دھار بلیڈ کی مانند ٹیکھی چھری سے اس کے گالوں پر نقش و نگار بنانے شروع کر دیے۔ تکلیف کے اتھاہ احساس سے افقی کی چیخیں نکل گئیں اس کی چیخیں بدر حیات کو غیر معمولی طور پر پرسکون کرنے لگیں۔

”بول..... کیوں کیا میرے ساتھ ایسا۔ بول۔“ وہ اس کے نازک ہونٹوں کو سختی سے پکڑتے اسے بولنے پر اکسا

رہا تھا افقی بلبلانے لگی۔

یا پھر ہر ایک کے ساتھ ایسا کرتی ہے بول..... ورنہ جان سے مار دوں گا۔ جلدی بتا حرافہ تجھے کس نے کہا تھا کہ

میرے دکھوں و محرومیوں سے کھلوا کر..... بول؟“ وہ نوکیلی تیز دھار چھری اس کی گردن پر رکھے اس سے پوچھ رہا تھا

سفا کی و بربریت اس کے انگ انگ سے مترشح تھی افقی کو حیرت ہوئی یہ وہی شخص تھا جو محبت کا مجسمہ ہوا کرتا تھا۔

شدید محبت کرنیوالوں کی نفرت بھی شدید ہوا کرتی ہے..... وہ اپنے ہر جذبے میں مخلص اور کھڑے ہوتے ہیں

بدر حیات بھی انہیں لوگوں میں سے تھا۔

”میں نے تمہارے ساتھ جان بوجھ کے ایسا نہیں کیا“ افقی کو بولنا پڑا نہ بولتی تو اور مار کھاتی بدر حیات اس کی بات

سن کے تہقہہ لگا کے ہنسا پھر دیر تک ہنستا رہا افقی کو اس کی دماغی حالت پر شبہ ہوا وہ اس کے سامنے کرسی ڈال کے بیٹھ گیا۔

”کتنے مردوں کو بے وقوف بنایا میرے سمیت وہ پیر کی جوتی سے افقی کے گال مسلتے بولا وہی گال جن پر کچھ دیر

پہلے اس نے چھری سے نقش و نگار بنائے تھے۔

”کسی کو نہیں..... میں نے تمہیں بھی بے وقوف نہیں بنایا۔“ افقی درد کو چھپاتے بمشکل تمام بولی اس کے سارے

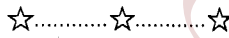
چہرے پر چھری سے کٹ گئے تھے پورے چہرے سے خون رس رہا تھا اور بہت درد کر رہا تھا۔

”جھوٹ مت بول حرافہ..... تجھے شوق ہے نامردوں کو الو بنانے کا۔ اور تو کامیاب بھی ہوتی ہے لے اب میں تجھے انہیں عورتوں کے لیے نشانِ عبرت بناؤں گا جو یہ سب ایک دوسرے کے دیکھا دیکھی میں کرتی ہیں.....“ وہ ایک دفعہ پھر اسے مار رہا تھا۔ مارتے مارتے افقی نیم بے ہوش ہو گئی لب سوکھ گئے حلق میں پیاس سے کانٹے اُگ آئے۔

”پانی.....“ افقی نیم بے ہوشی میں کراہی بدر حیات کے زخم ادھڑنے لگے اس کا بس نہیں چل رہا تھا وہ اسے جان سے مار ڈالتا مگر..... اتنی جلدی اسے نہیں مارنا تھا وہ اسے تڑپا تڑپا کے مارنا چاہتا تھا تاکہ پھر دوبارہ وہ کسی اور مرد کی زندگی سے کھیلنے کی کوشش نہ کر سکے بلکہ وہ اس قابل ہی نہ رہے۔ وہ ایسے لوگوں میں سے نہیں تھا کہ افقی اسے دھوکا دیتی اور وہ اس دھوکے اور بے وفائی کا بدلہ بے گناہ دوسری عورتوں سے لیتا..... اسے اپنا بدلہ افقی سے ہی لینا تھا اور اسی سے لے رہا تھا۔ اس نے جتنی شدید اور گہری محبت کی تھی اتنی ہی نفرت بھی کرتا تھا کر رہا تھا۔

”پانی“ افقی دوبارہ کراہی..... بدر حیات بے ہنگم سفاک قہقہے لگا کے ہنسا۔

”پانی چاہیے ناں تمہیں..... ہا ہا ہا..... نہیں ملے گا یہاں کچھ نہیں ملے گا تمہیں نہ پانی نہ کھانا یہاں صرف مارا اور نفرت ملے گی تمہیں۔ تمہارے گناہوں کی سزا، وہ پانی کی بوتل کھول کے پانی پیتے اسے لپٹا رہا تھا افقی کو صحیح معنوں میں اپنا آپ دوزخ میں محسوس ہوا مجھے معاف کر دو..... مجھے جانے دو.....؟ افقی بمشکل تمام خود کو گھسیٹتی اس کے قدموں تک پہنچی پانی پیتے بدر کو اچھو لگ گیا وہ پانی پیتے پینے ہنسا خوب ہنسا اور دیر تک ہنسا ہی رہا۔ معافی۔ اتنی جلدی۔ ابھی تو تمہارے حسن کا خراج باقی ہے میری جان۔ وہ ایک دم سے اپنا لہجہ بدل کے اس پر جھکا پھر اسے گھسیٹے ہوئے بیڈ پر لے گیا چھری کی نوک سے اسے برہنہ کیا اور اسے نہایت سفاکیت سے اپنی درندگی کی بھینٹ چڑھایا۔ ایک وحشت و بربریت کے عالم میں ساری رات وہ اسے تار تار کرتا رہا اور اس کے منہ پر تھوکتا رہا۔ وہ پہلے اسے چومتا پھر اس کے چہرے پر تھوکتا۔ افقی نے زندگی میں کی جانے والی اس فاش غلطی کو اذیت سے دیکھا اسے رضا حسن کا التفات یاد آیا وہ ان لمحات میں اسے کسی نازک کلی کی مانند نرمی سے چھوا کرتا تھا۔ وہ اتنی مار کھا چکی تھی کہ اب اس میں رونے کی ہمت بھی نہیں تھی۔



صبح وہ ابھی تو بدر کمرے میں نہیں تھا..... اس کے جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا..... وہ بمشکل تمام ابھی اور واش روم جا کے پانی کے دو چار چھینٹے مارے جو گزشتہ رات پورے سیاق و سباق کے ساتھ اس کے ذہن کے پردے پر نمودار ہو گئی۔ باہر جانے کا اپنا ارادہ ملتوی کرتے اس نے غسل کیا اور دوبارہ وہی پھنے پرانے کپڑے پہن کر اپنا تن ڈھانپنے کی کوشش کی۔ جو کہ کچھ ایسی کامیاب بھی نہیں گئی تھی۔ اسکے بدن کی ہڈیاں چور چور ہو رہی تھیں چہرے پر لگنے والے زخموں پر اب خون جم گیا تھا پانی کے چھینٹے زخموں پر تیزاب بن کے گرے افقی کے رہ گئی اتنا درد ہوا کہ آنکھیں بھرا آئیں کسی کی زندگی سے کھیلنے والوں کا یہ شوق جتنا عجیب ہوتا ہے اسکی سزا بدلہ بھی اتنا ہی عجیب اور اذیت ناک ہوتا ہے۔ افقی کو پہلے اندازہ نہیں ہوا مگر جب ہوا تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ دودن کی بھوک تھی اسے بے حد بھوک لگی تھی وہ باہر نکل آئی کچن میں بدر کھڑا اپنے

لے چائے بنا رہا تھا۔ بدر نے افقی کو دیکھا اس کی موجودہ حالت اس کی نفرت کی بھڑکتی آگ پر پھوار کی مانند برسی۔
 ”اودہ سویٹ ہارٹ۔ کیا ہوا تم باہر کیوں آگئیں آرام کرتیں ناں۔“ وہ چائے کا کپ ہاتھ میں پکڑے اس کی طرف گھوما وہ یک سب سے تیار شاید آفس جا رہا تھا۔

”مجھے بھوک لگی ہے“ افقی نے اپنے درد چھپائے اپنی انا کو بالائے طاق رکھتے بتایا۔

”اچھا..... آؤ آؤ..... تمہارا اپنا گھر ہے ویسا ہی گھر اور وہی گھر جو تم نے اور میں نے بنانے کی خواہش کی تھی.....
 آؤ یہ کچن ہے سنبھالو اسے.....“ وہ طنز کی آمیزش لیے بظاہر محبت سے لبریز ہو کے کہہ رہا تھا افقی کبھی گہرائی میں نہیں جاتی تھی اس نے ابھی بھی نہیں سمجھا اسے صرف بھوک لگی تھی اور اپنا پیٹ بھرنا تھا کسی بھی قیمت پر..... وہ آہستہ آہستہ چلتی اس کے پاس آئی۔

”تمہیں کھانا چاہیے نا۔ لوکھاؤ خود ہی پکا کے.....“ بدر نے افقی کا ہاتھ پکڑ کر جلتے چولہے پر رکھ دیا تھا افقی کی دلدوز چیخیں پورے گھر میں گونجنے لگی تھی آنکھیں دہل کے باہر کو آرہی تھیں درد ہی درد تھا اور اذیت ہی اذیت..... بدر حیات نے ایک بے ہنگم اور طنزیہ تہقہہ لگایا۔

”بس اتنا ہی برداشت کر سکی ہو..... جب مجھے درد دیا تھا تو تب کیوں نہیں سوچا کہ درد کبھی مجھے بھی سہنا پر سکتا ہے.....“ وہ اسے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹے ہوئے لاؤنج میں لے آیا ساتھ ساتھ وہ چلا بھی رہا تھا۔

”مجھے جانے دو..... خدا کے لے مجھے جانے دو.....؟ افقی درد سے بے حال بمشکل تمام الفاظ مجتمع کر پائی۔
 بدر حیات نے اس کے زخمی چہرے پر کس کے تھپڑ مارا۔

”یہ سوچ اب نکال دو کہ کبھی تم واپس جا پاؤ گی۔ تمہیں واپس جانے دوں تا کہ تم پھر کسی بدر حیات کی زندگی خراب کرو۔ اس کی خواہشوں سے کھیلو اس کے خوابوں کو سوا کرو۔“ وہ ہزانی انداز میں اسے پیٹ رہا تھا اس نے اسے اتنا مارا کہ تھک گیا۔

”تم ایک پاگل شخص ہو.....“ افقی نے خود کو اپنی ساری ہمت مجتمع کرتے خود کو چھڑاتے چیخ کر کہا بدر حیات لمحہ بھر کو اس کی جرات پر حیران رہ گیا اتنی مار اور تشدد سہہ لینے کے بعد بھی وہ تن فن کر رہی تھی اسے اس کی ہمت و جرات پر داد دینے کو جی چاہا اور اس نے دی بھی ہاں اس کا انداز اور طریقہ ذرا مختلف تھا۔

”ہاں ہوں میں پاگل..... اور مجھے پاگل بنانے والی تم ہو۔“ وہ چلایا۔

”مگر میں نے تم سے معافی مانگی ہے.....“ افقی نے جرح کی۔

”تو تمہیں لگتا ہے کہ تم معافی مانگو گی تو میں تمہیں معاف کر دوں گا افقی نے اس کی طرف دیکھتے اپنے دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑ دیے اس کا دایاں ہاتھ بری طرح سے جل گیا تھا اوپر سے سارا گوشت اتر گیا تھا نیچے سے ہڈیاں تک دکھ رہی تھیں افقی اپنے ہاتھ دیکھ کر خود بھی ڈر گئی اس کے ہاتھوں کا یہ حال تھا تو اس کے چہرے کا کیا حال کیا ہوگا اس پاگل شخص

نے.....؟

”اب تمہارا بدلہ پورا ہو گیا ہوگا مجھے جانے دو میرا گھر تم تباہ کر چکے ہو میرا وجود بھی۔ اب میرے اندر تمہاری مار سہنے کی طاقت نہیں ہے خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو میرے زخم بہت درد کر رہے ہیں اور مجھے بہت بھوک لگی ہے پلیز یا تو مجھے جانے دو یا پھر مجھے کچھ کھانے کو دے دو۔“ وہ ظلم کرنے والے سے رحم کی امید کر رہی تھی۔

”نہ تو میں تمہیں یہاں سے جانے دو گا نہ ہی تمہیں کھانا ملے گا۔ یہی تمہاری سزا ہے اب میں آفس جا رہا ہوں تم اپنا گھر سنبھالو میں واپس آؤں تو سارا گھر مجھے صاف کیا ہوا ملے.....“ وہ سفاکی کی حد تک بے بہرہ بنا ہوا تھا۔ وہ غلط بھی نہیں تھا ہر عمل کا رد عمل شدید ہی ہوا کرتا ہے۔



رضا۔ طاہرہ بیگم نے اندر کمرے میں جھانکا رضا حسن کمرے میں اندھیرا کیے لیٹا تھا رضا اٹھو بیٹا۔ کھانا کھا لو۔ میں نے لگا دیا ہے! طاہرہ بیگم نے اندر آ کے کمرے کی لائٹ جلائی رضا نے بے ساختہ بازو آنکھوں پر رکھا طاہرہ بیگم نے دیکھا وہ رو رہا تھا ان کا دل کٹ کٹ کے گرا۔ اپنے بیٹے کی حالت ان سے دیکھی نہیں جا رہی تھی۔

”بھوک نہیں ہے امی جان..... آپ پلیز بچوں کو کھلا دیں۔“ اس نے نظریں جراتے ہوئے کہا۔

”ایسا کب تک چلے گا رضا..... کیا وہ عورت اس قابل ہے کہ اس کے لیے آنسو بہائے جائیں۔“ وہ کتنے دنوں سے اس کی ایسی حالت دیکھ دیکھ کے پریشان ہو رہی تھیں جب سے وہ واقعہ ہوا تھا رضا حسن ٹوٹ کے بکھر سا گیا تھا۔ بچے الگ ماں کے لیے رو رہے تھے جب ہنسائی الگ ہو رہی تھی۔ کھانا گھر میں پکایا جاتا ٹیبل لگائی جاتی مگر کوئی بھی نہیں کھا پاتا۔ عامر الگ اس سارے واقعے سے الجھا ہوا تھا اسے رہ رہ کہ خود پر غصہ آتا رہا کتنی آسانی سے افق کے ہاتھوں استعمال ہوتا رہا۔ وہ اس کا دیور تھا اس کا پہلا شکار یہ مانا کہ ان دونوں کے درمیان کوئی ناجائز رشتہ نہیں تھا مگر پھر بھی پیار محبت کے والہانہ مظاہرے دونوں طرف سے چلتے رہتے تھے۔ ہاتھ پر ہاتھ مارنا۔ بازو گلے کے گرد بات کرتے کرتے حائل کر دیتا۔ غیر اخلاقی لطائف کا تبادلہ اخلاق سوز حرکتیں جنہیں دوستی کے لبادے میں لپیٹ دیا جاتا۔ وہ کردار کے حوالے سے نہ ہی مگر ذہنی پراگندگی میں اس کے ہمراہ چلا تھا وہ بھی Sprualprostitution کا شکار ہوا تھا اور رہا تھا۔ افق ایک ایسی ساحرہ تھی جو ایک ہی نظر میں مقابل کو چاروں شانے چت کر ڈالتی ہے۔

اس پر بھی اکتین حیدر کا سحر چلا تھا اور کئی سال چلا تھا ابھی بھی چل رہا تھا تبھی تو وہ مضطرب تھا بے چین تھا۔

”رضا۔ اٹھ جاؤ آ کے کھانا کھا لو۔ آج میں تمہاری ایک نہیں سنوں گی میں بوڑھی جان سارا دن ہڈیاں چٹختی ہوں اور تم لوگوں کا نغزہ ہی ختم نہیں ہوتا۔“ وہ رضا حسن کی غیر معمولی خاموشی سے تنگ آ کے خواہ مخواہ میں الجھ پڑی تھیں۔

”آپ چلیں میں آتا ہوں“ رضا نے منہ پر ہاتھ مار کے خود فریش کرنے کی کوشش کی۔

”نہیں تم فریش ہو آؤ۔ میں تمہارا میں انتظار کرتی ہوں؟“ انہیں پتا تھا وہ صرف ٹال رہا ہے تبھی انہوں نے اسے

جواب دیا تھا رضا حسن کے پاس اب کوئی چارہ نہیں تھا وہ ان کے ساتھ آکے ڈانٹنگ نیبل پر بیٹھانچے پہلے ہی وہاں موجود نے ملازمہ انہیں کھانا کھلا رہی تھی اسود ماں کے بغیر بہت چڑچڑاہورہا تھا۔ وہ افقی کے ساتھ بہت مانوس تھا بار بار ماں کو دہراتا۔

”عامر نہیں آیا ابھی تک۔“ رضا حسن نے عامر کی غیر موجودگی کو محسوس کرتے پوچھا تھا۔ گھر میں کتنے لوگ تھے ابھی خاموشی موت کے سناٹے کو پیچھے کر رہی تھی افقی کا تو انگ انگ بولتا تھا وہ گھر میں ہوتی تو رونق رہتی بھلے خاموش ہوتی مگر سناٹے بھی بات کرتے تھے اس کے وجود کی مہک بے جان اشیاء کو بھی مسحور کیے رکھتی۔

نہیں۔ آجکل اس پر کام کا لوڈ بہت زیادہ ہے اسی لیے رات دیر سے پہنچتا ہے۔ تم باتیں بعد میں کرنا پہلے کھانا کھا لو۔ میں نے تمہاری پسند کی مکس سبزی بنائی ہے۔ انہوں نے اس کی پلیٹ میں سالن نکال کر ہاتھ میں چپاتی چپاتی پڑائی رضا کو پکڑنی پڑی بھوک تو کب کی مرچکی تھی مگر وہ انکار کر کے ماں کو ناراض نہیں کر سکتا تھا وہ جانتا تھا اس کی ماں اپنا دکھ چھپائے سب کچھ نارل کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

”عبداللہ آپ رات کو میرے پاس سو جانا۔ دادو کو تنگ مت کرنا اسود پہلے ہی انہیں بہت تنگ کرتا ہے۔“ وہ اسود کو گود میں اٹھاتا کھانا کھاتے عبداللہ کو بول کے گیا۔

”امی۔ اسود کا فیڈر بھجوادیں میں اسے سلا دیتا ہوں آپ کھانا کھا کے تھوڑی دیر آرام کر لیں۔ اچانک اسے اندازہ ہوا کہ وہ اتنے دنوں سے بچوں کی ساری ذمہ داری ماں پر ڈالے ہوئے تھا وہ بچوں کے پیچھے بھاگتے بھاگتے تھک گئی تھیں۔

دادو۔ عبداللہ کھانا ختم کرتے ہی اٹھ کر دادی کے پاس آیا تھا۔ میری ماما کب آئیں گی طاہرہ بیگم کے دل پر ہاتھ پڑا وہ اس چھوٹے سے بچے کو اس قیامت کا کیسے بتائیں کیسے سمجھائیں کہ تمہاری ماں اب تم لوگوں کی زندگیوں میں نہیں آسکتیں شیشہ ایک بار ٹوٹ چکا تھا اب اس میں بال آگیا تھا اب سب کچھ پہلے کی طرح ٹھیک نہیں ہو سکتا تھا۔

آپ بالکل بھی اچھا ہوم ورک نہیں کروا تیں۔ میری ٹیچر ڈانٹ رہی تھیں۔ عبداللہ معصومیت سے انہیں بتا رہا تھا البتہ جیسی بھی تھی مگر وہ ایک اچھی ماں تھی بچوں میں اس کی جاں تھی اور وہ رضا کو بھی سنبھالے ہوئے تھی کبھی ایک لمحے کو بھی رضا سمجھ نہیں پایا کہ افقی اسے دھوکہ دے رہی ہے وہ اس سے بے وفائی کر کے کسی اور کے ساتھ افہر چلا رہی ہے۔

”اچھا ٹھیک ہے میں آپ کے بابا سے کہوں گی وہ آپ کو ہوم ورک کروادیا کریں گے!“ طاہرہ بیگم نے اپنے آلسوؤں کا گلا گھونٹا۔

”نہیں۔ پاپا کو بھی ہوم ورک نہیں کروانا آتا۔ مجھے میری ماما کے پاس جانا ہے وہ سب سے اچھا ہوم ورک کرواتی ہیں۔“ عبداللہ کی آنکھوں میں ڈھیر سارے آنسو ایک ساتھ آئے۔

”آپ کی ماما اب کبھی نہیں آئیں گی عبداللہ“ طاہرہ بیگم نے محبت سے اس کے بال سنوارے۔

”لیکن کیوں دادو۔“ عبداللہ کے لہجے میں حیرت تھی آنکھوں میں ویسے ہی آنسو اٹکے تھے۔

”کیوں کہ وہ آپ کو چھوڑ کے ایسی جگہ چلی گئیں ہیں جہاں وہ چاہیں بھی تو واپس نہیں آسکتیں۔“ طاہرہ بیگم نے چونک کے دیکھا رضا حسن اسود کو کاندھے پر سلائے دروازے میں کھڑے عبداللہ سے نہایت قطعیت سے کہہ رہے تھے۔

”لیکن کیوں پاپا۔“ عبداللہ باپ کی طرف مڑا۔

ابھی آپ اس سوال کو رہنے دو جب آپ بڑے ہو جاؤ گے تب میں آپ کو ساری بات سمجھاؤں گا۔ وہ نرمی سے اسے بات ختم کرنے پر اکساتے ساتھ لے کر بچوں کے کمرے کی طرف بڑھ گیا تھا طاہرہ بیگم ان کے جانے کے بعد پھوٹ پھوٹ کے رو دیں تھیں۔

☆.....☆.....☆

شدید بھوک کی وجہ سے اس پر غنودگی طاری ہو گئی تھی درد سہتے سہتے اب اس کا جسم سن ہو گیا تھا اس میں اٹھ کر بیٹھنے کی سکت بھی نہیں رہی تھی۔ بدر جب آفس سے واپس آیا تو وہ وہیں بے سدھ پڑی تھی جہاں وہ اسے چھوڑ کے گیا تھا۔ بدر کو اسے ہنوز حالت میں دیکھ کر بے حد غصہ اور اشتعال آیا۔ اس نے ٹھنڈے بن پانی کا گلاس بے سدھ پڑی افقی پر ڈالا۔ ٹھنڈا پانی اس کے اڑے ہوئے زخموں پر تیزاب بن کے گرا وہ بلبلا اٹھی بے ساختہ اس کی چیخیں نکل گئیں۔ بدر حیات اسے بری طرح سے گھسیٹتے ہوئے کرسی پر بٹھا کر باندھنے لگا افقی عجب وحشت کے عالم میں اس کا پاگل پن دیکھ رہی تھیں کھٹی کھٹی سسکیاں اس کے اندر ہی دب گئیں تھیں اسے کسی وجہ کی ضرورت نہیں رہی تھی افقی پر تشدد کرنے کے لیے۔ اسے بس وقت چاہیے ہوتا تھا اور وقت اب اس کے پاس تھا افقی نے نیم وا آنکھوں سے دیکھنے کی کوشش کی آج وہ اس پر کس انداز اور کس قدر تشدد کرنے والا تھا افقی کی گردن ایک طرف کرسی پر لڑھک گئی اس کی آنکھیں غنودگی سے بند ہونے لگیں وہ بھوک تھی اس کا پی پی حد سے زیادہ گر گیا تھا مگر یہاں پرواہ کسے تھی وہ تو اسے حد سے زیادہ اذیت دینا چاہتا تھا اور دے رہا تھا۔

”بول..... کیا کہہ کے گیا تھا میں.....“ گرم گرم اُبلتا پانی اس نے اچانک ہی افقی کے پیروں پر گرایا تھا افقی نے تڑپ کر اپنے پیروں کی طرف دیکھا جو بے حد سرخ ہو رہے تھے اذیت سی اذیت تھی جو رگ جاں کو چیر گئی تھی کرموں کا پھل اتنا کڑوا کیلا بھی ہوگا..... افقی نے خواب میں بھی نہیں سوچا ہوگا۔ مجھے یاد نہیں.....“ افقی اسے دوبارہ پانی کا گلاس بھرتے دیکھ کر جلدی سے بولی تھی ایک قیامت سے وہ گزری تھی۔

”کیوں..... کیوں یاد نہیں تھے حرافہ..... بول کتنے لوگوں کی زندگیاں تباہ کیں تو نے“

اس کی ذہنی رو بھٹک گئی وہ پھر اشتعال میں آ کے وہیں کھڑا ہو گیا جہاں سے چلا تھا۔ وہ کیا کہہ کے گیا تھا اسے بھول گیا یا درہاتو بس اپنا بے وقوف بنائے جانا۔

”میں نے کسی کو بے وقوف نہیں بنایا اور میں سچ کہہ رہی ہوں.....“ افقی درد سے کراہ کے رہ گئی۔

”جھوٹ..... جھوٹ بول رہی ہے تو.....“ بدر حیات نے ایک اور گلاس افقی کے منہ پر ڈالا جو منہ سے ہونے

مے اس کی گردن تک جھلسا گیا وہ تڑپ ہی تو گئی۔

”تو ذہنی فاحشہ ہے لوگوں کی زندگیوں سے کھیلتی ہے تو..... تیرے جیسے گھروں میں بیٹھی ہوئیں ذہنی طور پر انگندہ مرنس (U-R- Spritualprostitute)“ وہ غصے سے اس پر جھپٹا۔

اس نے اس کو مار مار کے حسب معمول بے حال کر دیا افقی کے زخم ادھڑ گئے۔ پہلی بار افقی نے مر جانے کی دعا کی۔ اور دوسری یہاں سے بھاگ جانے کی..... دونوں ہی اس کے بس سے باہر تھیں۔ مگر خواہش تو نا تمام اور لا حاصل رہی جایا کرتی ہیں۔ ”مار دو مجھے..... خدا کے لیے بدر مار دو پھر تو تمہارا بدلہ پورا ہو جائے گا“۔ افقی گڑ گڑاتے اس کے پیروں پر گری بدر حیات نے نفرت سے اس پر تھوکا۔

”اتنی جلدی تمہیں آزادی بخش دوں مسز اختین حیدر..... وہ نفرت اور استہزاء سے ہنسا: کتنی خوش فہم ہوتی.....“ اس نے اسے بالوں سے پکڑ کر جھٹکا دیا۔

”نشان عبرت بناؤں گا میں تمہیں..... نشان عبرت ان عورتوں کے لیے جو گھر بیٹھ کے رائگ نمبروں پر محض تفریح کے لیے لوگوں کی زندگی اور ان کے جذبات و احساسات سے کھیلتی ہیں تمہاری طرح انہوں نے بھی کبھی نہیں سوچا ہوگا کہ جب وہ کسی کا دل توڑتی ہیں تو کیسے لوگوں کی زندگیاں انکا اعتماد ان کے خواب ٹوٹتے ہیں وہ کیسے بکھرتے ہیں وہ کیسے پامال ہوتے ہیں۔ وہ اسے ٹھوکروں کی زد پر رکھے چلا رہا تھا پھنکار رہا تھا مگر افقی ہوش و خرد سے بیگمہ اس کی مار سہہ رہی تھی۔



چھ ماہ وہ بدر حیات کا تشدد سہتی رہی..... اور ان چھ ماہ میں ہر گز رے دن اس نے بدر حیات کی نفرت میں اضافہ ہوتے دیکھا تھا۔ بدر حیات کی شدید محبت پر اس کی شدید نفرت غالب آگئی تھی۔ اس نے جس زندگی سے نفرت کی تھی اسے ویسی ہی زندگی گزارنی پڑ رہی تھی..... وہ اکیلا رہ گیا تھا افقی کے دیے دھو کے کے بعد اس کی ذہنی سطح بری طرح سے مجروح ہوئی تھی..... وہ اندر سے ٹوٹ چکا تھا اور یہ عین ممکن تھا کہ وہ پاگل ہو جاتا..... ان گز رے چھ مہینوں میں وہ کئی کئی دن افقی کو بھوکے رکھتا۔ اس نے بھوک کی شدت سے نڈھال افقی کو بار بار اس کے بچے ہوئے کھانے کو بے تابی سے کھاتے دیکھا پھر وہ اسے اذیت دینے کو کھانا بچا کے ڈسٹ بن میں پھینک دیتا۔ افقی زندہ رہنے اور اس کا تشدد سہنے کے لیے وہ کھانا ڈسٹ بن سے نکال کے بھی کھاتی۔ افقی کو عرصہ ہو گیا تھا ڈھنگ کا کھانا کھائے ہوئے اور پیٹ بھر کے کھانا اس نے کب کھایا تھا یہ تو اسے یاد ہی نہیں رہا تھا۔ بدر حیات پر جب قنوطیت کا حملہ ہوتا وہ افقی کو مارتے ہوئے بجلی کے جھٹکے دیتا۔ اس کے لبوں پر ایک ہی سوال ہوتا تھا کہ افقی نے اسے دھوکہ کیوں اور کس کے کہنے پر دیا۔ افقی کے پاس جواب تو پہلے بھی نہیں تھا اب تو بجلی کے جھٹکے کھانے کی وجہ سے اس کی ذہنی حالت خمدوش ہو چکی تھی وہ بدر حیات کی مارتو سہتی مگر اسے اجنبیوں کی مانند نکر بھی دیکھتی گویا پہنچانے کی کوشش کر رہی ہو۔ بدر حیات کو اور بھی غصہ آتا وہ اسے اور بھی مارتا وہ ہمیشہ اس سے اپنے ساتھ کی گئی زیادتی

کے متعلق استفسار کرتا مگر کیا اس نے خود کبھی سوچا تھا کہ افقی ایسی کیوں تھی..... کبھی اس نے جاننے کی کوشش نہیں کی کہ افقی کے ایسا ہونے کے پیچھے کیا ردِ عمل کارفرما تھا۔

آٹھ ماہ میں پہلی بار بدر حیات کو اس پر ترس آیا اس روز وہ کچن میں کھڑی کھانا ڈھونڈ رہی تھی بدر نے تعصب کی عینک اتار کے دیکھا وہ پہلے سے بے حد کمزور ہو گئی تھی بے تحاشا مار کھانے کی وجہ سے اس کی شکل و صورت بگڑ چکی تھی اس کے زخموں میں پیپ پڑ گئی تھی اس کے چہرے کے زخموں سے ریشہ رستا تھا اور بے حد کریمہ نظر آتا تھا۔ اسکے جلے ہوئے ہاتھ پر دو انہ ملنے کی وجہ سے دوبارہ گوشت نہیں آیا تھا بے حد پتلی اور باریک کالی سی جلد تھی جو ہڈیوں کو بمشکل ڈھانپے ہوئے تھی۔ وہ ایک حسین عورت سے بے حد کمزورہ اور کریمہ صورت عورت میں تبدیل ہو چکی تھی۔ بدر خاموشی سے چلتا ہوا اس کے پاس آیا وہ بدر کو اپنے پاس اس قدر اچانک دیکھ کے بے حد پریشان ہو گئی تھی۔ وہ ڈر گئی تھی اب وہ بدر کو دیکھ کے ڈر جایا کرتی تھی۔ وہ اسے بہت مارتا تھا اذیت دیتا تھا اور کھانا بھی نہیں دیتا تھا۔ بدر نے کچھ دیر اس کی طرف دیکھا اگر اس نے بدر کو دکھ دیا تھا تو کچھ کم اذیت بدر نے بھی اسے نہیں دی تھی۔ بدر نے اس کا گھر ہی تباہ نہیں کیا تھا اسے کسی کو صحیح معنوں میں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔

”بھوک لگی ہے نا تمہیں.....“ وہ پہلی بار اس سے نرمی سے بات کر رہا تھا۔ افقی نے ڈر کے مارے جھٹ نفی میں

سر ہلایا۔

”ڈرو نہیں..... سچ بتاؤ میں تمہیں نہیں ماروں گا!“ بدر نے نرمی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی تو افقی نے اپنے سر کو اثبات میں آہستگی سے جھٹ دے دی۔ بدر نے آہستگی سے ہی اپنے نمبر سیل پر کوئی نمبر ملایا۔ اگلے آدھے گھنٹے میں ہوم ڈیلیوری سروس کے تحت ہوٹل سے بیک شدہ کھانا آچکا تھا۔ بدر نے خود پلیٹوں میں نکالا اور افقی کو ڈائننگ ٹیبل پر بٹھا دیا: کھانا افقی کے سامنے رکھا اور اسے خود کھلایا افقی اس عنایت پر کچھ کچھ حیران رہ گئی مگر حیرانی پر غالب بھوک آگئی اس نے ندیدوں کی طرح بدر کی آفر کے چھن جانے سے پہلے ہی کھانا کھایا اور سیر ہو کے کھانا نجانے دوبارہ ایسا کھانا کبھی ملے بھی کہ نہ ملے۔

”میں تمہیں بہت مارتا ہوں ناں“۔ وہ اب اس سے سوال کر رہا تھا افقی مخمضے میں ڈوب گئی وہ اس سوال کا جواب

کیا دے۔

”بولو..... بہت تنگ ہونا مجھ سے.....؟“ افقی نے اب کی بار نفی میں سر ہلایا اور بدر کے تنے عضلات میں

واضح نرمی اُترتی محسوس کی۔

”اچھا ٹھیک ہے ایک ذیل کرتے ہیں..... میں تم سے ایک سوال پوچھوں گا تم مجھے اس کا صحیح صحیح جواب دینا پھر

میں تمہیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ دوں گا پھر تم جہاں چاہے جانا اور رہنا بولو۔ منظور ہے ناں تمہیں.....“ افقی کی جان پہ بن آئی وہ اسے کیا کہے ہاں کرتی تو بھی پھنستی نہ کرتی تو بھی مرتی۔

”بولو.....“ وہ افقی کی خاموشی سے چڑتے ہوئے ایک دم سے جلایا افقی کے اوسان خطا ہونے لگے جھٹ اثبات

میں سر ہلایا۔

”تم ایسی کیوں ہو افقی..... دیکھو تمہارا بولا آج کا سچ تمہاری جان بخشی کروا سکتا ہے!“ وہ اسے پکپکار رہا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ بھی یہ کھیل کھیلتے کھیلتے تھک گیا تھا۔ افقی نے اپنی سسکی دباتے بچی لی اس کی آنکھیں یک لخت نمکین پانیوں سے بھر گئیں۔

اس کا نام شایان لغاری تھا..... افقی نے یاد کرنے کی کوشش کرتے آنکھیں جھپکیں۔ وہ ہمارے محلے کا سب سے پیارا ہنڈم لڑکا۔ میں اسے روز دیکھتی تھی اپنی کھڑکی سے کبھی چھت سے کبھی سڑک پر رک کے۔

”پھر..... کیا ہوا تھا“ بدر کے لہجے میں بے تاب در آئی۔

”مجھے وہ اچھا لگتا تھا..... بہت زیادہ اور وہ بھی جانتا تھا میں نے اسے بتا دیا اپنی محبت کا مگر اس نے میری محبت کو قبول نہیں کیا اس نے کہا میری جیسی ہزاروں روز اس کے پیچھے مرتی ہیں..... میں اس کے لیے اہم نہیں تھی پھر ایک روز اس نے مجھے اپنے گھر بلایا اور بولا۔ میں نے تمہاری محبت قبول کی آؤ ایک نئی زندگی شروع کرتے ہیں میں اُس وقت صرف پندرہ سال کی تھی..... وہ مجھے اپنے بیڈروم میں لے گیا۔ افقی کی ہچکیاں بندھ گئیں ماضی پوری آب و تاب کے ساتھ اس کے سامنے روز روشن کی طرح عیاں ہو گیا اس نے میری محبت کا بدلہ اپنی ہوس کے ساتھ دیا اس نے مجھے استعمال کیا اور ایک استعمال شدہ ٹشو کی طرح پھینک دیا میں نے اس کی بہت منتیں کیں اسے روکا مگر وہ وہاں سے چلا گیا اور جانتے ہو اس نے جاتے سے مجھے کیا کہا.....“ وہ اپنی کہانی روکتے بدر سے اس طرح بولی جیسے دونوں بہت اچھے دوست ہوں اور ایک دوسرے کا غم بانٹتے رہتے ہوں۔

”اس نے کہا میرے جیسی لڑکی کو سچا پیار کرنے والا کوئی مل ہی نہیں سکتا کیونکہ میں اس قابل ہی نہیں کہ کوئی مجھ سے سچا پیار کرتے ہوئے مجھے اپنے گھر کی زینت بنائے۔ وہ چلا گیا میں نے اس کی اس بات کو چیلنج کی طرح لیا شایان لغاری چلا گیا لیکن میرے اندر ایک ایسی عورت کو جگا گیا جو.....“ اس سے آگے افقی سے بولا نہیں گیا بدر ساری کہانی سمجھ گیا۔

”اور تم نے مجھ سے بدلہ لیا اس کی بے وفائی کا..... بدر کے زخم ادھر نے لگے اس پر وحشت طاری ہونے لگی وہ سفاک ہونے لگا افقی نے اس رات اسے خود پر تشدد کرنے سے نہیں روکا اس نے بجلی کے جھٹکے دیے افقی کی چنچیں بلند سے بلند تر ہو گئیں بالآخر بدر کا ضبط جواب دے گیا اس نے اپنا کہا پورا کیا اور بے سدھ پڑی افقی کو گھر سے باہر گلی میں کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر پھینک دیا۔



رضا حسن اپنے آفس میں لیپ ٹاپ پر مصروف کوئی کام کر رہا تھا انداز سے وہ اس وقت بے حد مصروف نظر آ رہا

تھا۔ جیسی کوئی دستک دے کے اندر آیا تھا۔ رضا حسن نے لمحے بھر کے لیے نگاہ اٹھا کے دیکھا اور ساکت رہ گیا اس کے سامنے سعد یہ کھڑی تھی افقی کی بہترین دوست ”اندر نہیں بلاؤ گے رضا حسن!“ وہ مسکراتے ہوئے پوچھ رہی تھی رضا حسن کو اسے اندر بلانا پڑا وہ پچھلے ایک سال سے ہر ہفتے اس کے پاس صرف معافی کی درخواست لے کر آتی تھی اس نے افقی کے جانے کے بعد ہی رضا سے رابطہ کیا تھا۔

”سوری فارا پوری تھنک رضا..... مجھے اگر ذرا بھی اندازہ ہوتا کہ افقی یہ سب کرے گی میں کبھی بھی اس کا ساتھ نہ دیتی..... میں تمہاری مجرم ہوں کیونکہ اگر میں افقی کا اس وقت ساتھ نہ دیتی تو وہ کبھی بھی اتنا بڑا قدم نہ اٹھا پاتی۔“

”تمہاری بات مکمل ہو گئی کیا“ رضا حسن نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں سعدیہ سے استفسار کیا سعدیہ اس بے اعتنائی پر جل کر رہ گئی۔

”رضا۔ مجھے معافی چاہیے تم سے میرے اندر کا گٹ ساری ساری رات مجھے سونے نہیں دیتا مجھے اپنی غلطی کا ازالہ کرنا ہے.....“ سعدیہ زچ ہو کر رودی رضا نے اسے نظر بھر کر دیکھا دونوں اچھی فرینڈز تھیں اور دونوں کی دوستی میں کوئی قدر مشترک نہیں تھی۔

”کیا ازالہ کرنا چاہتی ہو تم.....“ رضا حسن نے اسے دیکھتے پوچھا سعدیہ کو خوشی ہوئی چلو وہ اس سے پوچھ تو رہا تھا ورنہ تو اس گزرے ایک سال کے عرصے میں وہ اس کی بات سننا گوارا ہی نہیں کرتا تھا۔

”تمہاری اور بچوں کی زندگی سنوارنے کی ایک کوشش کر کے۔“ سعدیہ نے آس کے جھنڈے آنکھوں میں چمکائے رضا حسن کے زخم ادھیڑے کیا افقی کے دیے دکھ کے بعد وہ کسی پر اعتماد کر سکتا تھا اسے تو عرصہ ہو گیا تھا مسکرائے ہوئے چین کی نیند سوئے۔

”تمہیں کیا لگتا ہے سعدیہ..... کیا میرے اندر مزید تجربہ کرنے کی ہمت ہے ابھی؟“ وہ لیپ ٹاپ بند کر کے پوری طرح سے اس کی جانب متوجہ ہوا۔

”تمہیں کم از کم خود کو اور مجھے ایک موقع تو اور دینا ہی چاہیے رضا حسن..... پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوا کرتیں اور میری زندگی ایک کتاب کی مانند تمہارے سامنے کھلی پڑی۔“ سعدیہ رویا نسی ہوئی۔

”مگر میری کتاب زندگی کے صفحات اب کسی بھی قسم کے جذبات و احساسات سے خالی ہو چکے ہیں اب..... میرا ساتھ تمہیں سوائے درد کے اور کچھ نہیں دے سکتا تم کیوں اپنی زندگی تباہ کرنے پر تلی ہوئی۔“ رضا حسن نے اس کی جلتی آنکھوں میں واضح نظر آتے پیغام پر اسے جھنجھلا کر سمجھایا سعدیہ مسکرائی۔

”رضا حسن..... مجھے ایک موقع دو اپنی محبت کو آشکار کرنے اور پردہ کرنے کے لیے تم بھلے مجھے محبت نہ دو۔ بے اعتباری و بے اعتنائی دو مگر مجھے میری محبت سے مت روکو..... میں بچوں کے ساتھ رہ لوں گی اور تب تک تمہیں نہیں تمہاری زندگی میں خود کو شامل ہونے کے لیے کہوں گی جب تک تم خود اپنے لیے میرے دل میں جگہ نکلتی محسوس نہ کرو۔“

اور محبت کرنا کوئی ایسا مشکل بھی نہیں ہے رضا..... سعدیہ نے ایسا کہتے ہوئے رضا حسن کے تمام اعتراضات ختم کیے تھے رضا حسن نے ہلکا سا مسکراتے اپنا سر کسی کی پشت سے ٹکا دیا ایک لمبا اور تھکا دینے والے سفر کا اختتام اب ہو اہی چاہتا تھا کیونکہ اکیلا رہتے اور افقی کے دبے غم سب سے سب سے اب وہ بھی تھکنے لگا تھا زندگی اسے ایک موقع فراہم کرتے کھلی بانہوں سے اپنی طرف بلارہی تھی تو رضا حسن کو بھی نہیں چاہیے کہ وہ ناشکری کرتا۔ اس نے زندگی کو آگے بڑھ کے گلے لگا لیا تھا۔

☆.....☆.....☆

افقی کی آنکھ بے تحاشا شور سے کھلی۔ اس نے آنکھیں مل کر اٹھ کر سوچنے کی کوشش کی کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آئی ہے یہاں کوڑے کے ڈھیر پر اسے کون پھینک کے گیا اسے یاد نہیں آسکا۔ وہ اپنا ذہنی توازن اور یادداشت کھوجی تھی۔ اس نے اپنے ارد گرد بے تحاشا لوگوں کا ہجوم دیکھا بھانت بھانت کے لوگ اس سے طرح طرح کے سوالات کر رہے تھے وہ ایک کریہہ صورت عورت تھی بچے اس سے ڈر کے بھاگنے لگے کچھ سخت دل اسے مار کے بھگانے کے درپے ہو گئے..... آہستہ آہستہ لوگوں کا ہجوم دھند کی مانند چھٹنے لگا۔ وہ وہیں کوڑے کے ڈھیر کی باسی ہو گئی۔ بھیک مانگ کے کھاتی کبھی کوڑے کے ڈھیر سے کھانا ڈھونڈتی۔ پیٹ کا دوزخ بھرتی کبھی بچوں کے پیچھے انہیں پتھر مار کے بھگانے کی کوشش کرتی جو اسے مارنے کو لپکتے تھے ان میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ آئین حیدر تھی جس کی مرضی سے دن طلوع ہوتا تھا دنیا جس کے تابع تھی خوشیاں اس کے گھر کی باندی تھیں اور وہ خود کسی شہزادی کی طرح سب کے دلوں پر راج اور حکومت کیا کرتی تھی۔ ایک چھوٹی سی غلطی محض وقت گزاری کے لیے کھیلا جانے والا کھیل یوں بھی قیامت لاسکتا ہے افقی سمیت شاید کسی کو بھی اندازہ نہ ہو ہو ہی نہیں سکتا اور نہ کوئی یہ قبیح فعل سرانجام ہی کیوں دے۔ موبائل کمپنیوں کے سستے ترین کال ریش اور ایس ایم ایس چیکر کئی گھروں کو تباہ کر چکے ہیں کر رہے ہیں اس میں قصور موبائل کمپنیز کا نہیں انھیں استعمال کرنے والے لوگوں کا ہوتا ہے جو غلط استعمال کرتے ہیں۔

☆.....☆.....☆

عامر حسن کی لاہور پوسٹنگ ہوئی تو وہ اپنی فیملی کو لے کر یہاں شفٹ ہو گیا تھا آجکل اس کی بیوی دوسرے جی سے تھی سوا اکثر بیمار ہا کرتی عامر حسن نے اسے کراچی سے میکے بھجوا دیا تھا ویسے بھی ایک ذمہ دار پولیس انسپکٹر ہونے کے ناطے اس کا شیڈول بہت بڑی تھا سو وہ اس انداز میں سارہ کی کیئر نہیں کر پاتا تھا جیسی اس کو ان شروع کے ایام میں ضرورت تھی۔ سب کچھ اپنے معمول پہ آگیا تھا آہستہ آہستہ سب نارمل ہو گئے تھے رضا حسن کو کہ افقی کو مکمل طور پر نہیں بھولا تھا مگر پھر بھی وہ سعدیہ کا مقام پہچاننے لگا تھا اس کا رویہ کبھی بھی سعدیہ کے ساتھ سرد نہیں رہا تھا لیکن اس میں وہ گرجوٹی بھی مفقود تھی جیسی وہ پہلے افقی کے ساتھ رکھتا تھا اب وہ اعتبار کرنے سے ڈرتا تھا وہ محبت کرنے سے بھی ڈرتا تھا افقی کی ایک چھوٹی سی بھول نے کئی لوگوں کی زندگیوں کو ڈسا تھا کئی گھر تباہ ہوئے تھے کئی لوگوں کی عزت نفس ذات کا غرور شخصی انا بھروح ہوئی تھی..... مگر وقت سب سے بڑا رحم ہوتا ہے جلد یا بدیر زخم بھر ہی جایا کرتے ہیں اور ایسا ہی ان لوگوں کے ساتھ بھی ہوا تھا..... بچے افقی کو بھول کر سعدیہ کو اپنی ماں سمجھنے لگے تھے اور سعدیہ نے بھی اپنا آپ گنوا دیا تھا رانجھا رانجھا کردی نی میں

آپے رانجھا ہوئی کے مصداق اس نے رضا حسن کے نکاح میں آتے وقت اپنے اندر سے میں کی ”خو“ نکال دی تھی۔
فون کی بیل ہوئی تو عامر حسن نے فائل پر سے نظریں اٹھا کر انٹرکام اٹھا کر کان سے لگایا۔ دوسری جانب حوالدار اسے کچی آبادی کی طرف کسی کی لاش کے ملنے کی بابت بتا رہا تھا وہ کسی لادارث عورت کی لاش تھی اور کچی آبادی میں سے کوئی بھی اس کی تدفین کرنے کی ذمہ داری نہیں لینا چاہتا تھا اسی لیے انہوں نے پولیس سینٹر کال کی تھی۔ عامر حسن نے ساری تفصیل سننے کے بعد خود وہاں جائے وقوعہ پر جانے کا ارادہ کیا۔ اگلے آدھے گھنٹے میں وہ وہاں پر موجود تھا۔ کچی آبادی میں لوگوں کا ہجوم جمع تھا۔ وہ بھیڑ کو چیرتا اس لاش کے پاس گیا اسی عورت کا بوسیدہ سا ڈوپٹا اس پر ڈال کر اسے لپیٹا گیا تھا۔ عامر حسن نے بس ذرا کی ذرا اس کا چہرہ دیکھا اور ساکت رہ گیا۔ وہ ہر چہرے کے متعلق سوچ سکتا تھا مگر اس چہرے کو دیکھنے کے لیے نہیں اُفتین حیدر کا خوبصورت ترین چہرہ اب کسی کوڑھی کی مریضہ کے چہرے میں تبدیل ہو چکا تھا اس کا سارا چہرہ کھلا ہوا تھا مگر عامر حسن نے اسے پھر بھی پہچان لیا تھا اس کی باطن کی آنکھ ویسے ہی شفاف تھی اور دل کا کوئی نہ کوئی کونہ آج بھی افقی کی یاد سے روشن تھا۔

”اس کی موت کیسے ہوئی.....“ وہی بوسیدہ چادر اس کے چہرے پر ڈال کر وہ ایکدم آنکھوں میں اٹنی نمی کو چھپاتے وہاں جمع ہجوم سے پوچھ رہا تھا۔
”کوڑے کے ڈھیر سے کھانا ڈھونڈ ڈھونڈ کے اکثر کھایا کرتی تھی جی۔ شاید کوئی زہریلی چیز کھالی ہو۔“ ہجوم میں سے کسی نے بتایا تھا عامر حسن کے دل پر گھونسا پڑا۔

”کب سے ہے یہ عورت یہاں۔ میرا مطلب ہے کتنا عرصہ ہو گیا؟“ اس نے اپنی زبان لڑکھڑاتے محسوس کی۔
”یہی کوئی ایک ڈیڑھ سال سے تو دیکھ ہی رہے ہیں جی کہاں سے آئی یہ بھی نہیں پتا ایک دن کوڑے کے ڈھیر پر بے ہوش دیکھی تھی ہم نے“ ہجوم میں سے ہی جواب آیا تھا۔ عامر حسن انہیں پوچھ نہیں سکا کہ اس عورت کو یہاں کون پھینک گیا ہوگا اس کے ساتھ جو کچھ ہوا ہوگا وہ تو اس کی حالت بتا رہی رہی تھی مگر دل کا ایک گوشہ جانے کیوں مگر درد کی بھاری سل میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا کیونکہ جن لوگوں کو کبھی آپکا دل اسیری کی اونچی منہ پر بٹھا دے اسن سے رہائی پھر ممکن نہیں ہو پایا کرتی۔ اور شاید نہیں یقیناً عامر حسن کبھی بھی افقی کے بارے میں رضا حسن کو بتا نہیں پائے گا کہ کیونکہ جن سے محبت کا رشتہ رہ چکا ہو ان کے پھٹ جانے کے باوجود بھی دل کا ایک کونہ ان کی یاد کے دیے سے ہمیشہ روشن رہتا اور کبھی نہ کبھی کہیں اچانک سے ان کے سامنے آ جانے کی خواہش بھی ہمیشہ دل میں پختی ہی رہتی ہے۔

عامر حسن نے رضا حسن کے دل میں اس یاد کے دیے کو ہمیشہ جلنے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ (تاریکبوت) برائی تاریکبوت کی مانند پہلے شکار کو اپنی جانب راغب کرتی ہے اور جب وہ بھنس جائے تو اسے یونہی خود میں دبوچ لیتی ہے پھر چاہنے کے باوجود اس جال سے رہائی نہیں مل پایا کرتی اور تڑپ تڑپ کر جان دینا ہی مقدر ٹھہرتا ہے۔ جیسے اُفتین حیدر کے ساتھ ہوا تھا اور جیسا اکثر اُفتین حیدر جیسی لڑکیوں کے ساتھ ہوتا رہتا ہے۔

میرے بے خبر، میرے بے نشان

انہوں نے اسے سر تا پیر غور سے دیکھا پھر اس کا نام پوچھا تھا
 ”کلی“ اس نے لہرا کے بتایا تو مسکراہٹ نے ان کے چہرے کا احاطہ کر لیا تھا بڑے عرصے کے بعد وہ مسکرائے تھے۔
 ”کچی کلی“ انداز میں حیرت کے ساتھ شرارت بھی کھل گئی تھی۔

”نہیں نہیں..... کھلی ہوئی کلی“ بتانے والی کا انداز بڑا بے ساختہ اور تردیدی تھا۔
 ”کم عمر ہو“ انہوں نے اپنی تجرباتی نگاہیں اس کے کامنی سراپے پر ڈالیں تو بول اٹھے۔
 ”دکھتی ہوں مگر ہوں نہیں“ اس نے جواباً بڑے آرام سے پھر تردید کی تھی۔

”اٹھارہ کی ہو“ انہوں نے موٹے عدسہ والا چشمہ آنکھوں پر جمایا۔

”نہیں..... تیس کی“ کلی کا انداز ابھی بھی وہی تھا تردیدی اور قطععی۔

”پہلی بار میرا اندازہ غلط ثابت ہوا کسی کے بارے میں“ ان کے لہجے میں شکستگی بھرا دکھ تھا کلی کھل کے مسکرائی دو
 قدم ان کے بیڈ کے قریب بڑھ آئی۔

”یہی تو زندگی ہے.....“ انداز مدبرانہ تھا۔ ”سیانے کہتے ہیں کہ زندگی میں کیا ہر کام کبھی نہ کبھی پہلے ہی کیا جاتا
 ہے“ حشمت زیدی نے چونک کر دیکھا۔

”یعنی تم کہنا چاہتی ہو کہ میرے اندازے غلط ہو گئے آج کے بعد..... یہ اس کی شروعات ہے“ عینک اتارتے
 ہوئے انہوں نے اضطراب کی کیفیت میں اس پر سے گرد جھڑی۔ مگر کھلی ہوئی کلی کا اپنا وہی پر اعتماد قدرے لا پرواہ سا انداز تھا۔
 ”نہیں..... یہ ضروری بھی نہیں مگر ہونے کو تو کچھ بھی ہو سکتا ہے ہر انسان کو ذہنی طور پر تیار رہنا چاہیے“ اس نے
 آگے بڑھ کے کھڑکی کے پردے کھول دیے تازہ ہوا کے ساتھ روشنی نے کمرہ اپنے وجود سے بھر لیا ایک ساٹھ سالہ شخص کو جو
 تجربات کی بھٹی میں جل کے کندن بن گیا تھا، ایک تیس برس کی لڑکی زندگی پڑھا رہی تھی سمجھا رہی تھی۔

”یہ جاب تمہاری ضرورت ہے“ انہوں نے اس کے جواب کی تردید کی تا تا بید، موضوع ہی بدل دیا۔
 ”شوق ہے“ اس نے پھر تردید کی۔

”ہائیں“ ان کی آنکھیں اور منہ کھل گیا ایسی عجیب و غریب لڑکی انہوں نے آج تک نہ دیکھی تھی۔

”تو پھر تنخواہ نہیں ہوگی“ کھلی ہوئی کلی نے ایک نظر دیکھا اور سر کونفی میں جنبش دی۔

”نہیں..... اس کے بدلے کچھ اور لوں گی.....“ کھل کے ٹھنڈی سانس بھرتے اس نے ایک نظر حشمت زیدی کو دیکھا مگر وہ کوئی جواب نہیں دے پائے سوچ میں پڑ گئے کہ ان کے پاس پیسے کے علاوہ کیا ہے جو وہ اس کا مٹی سی لڑکی کو دے سکتے ہیں مگر

”وہ بھول گئے تھے کہ وہ پاس تھے.....“



دوسرے ہی دن وہ صبح آگئی تھی گھوم پھر کر سارا گھر دیکھا..... انداز میں ایسا استحقاق تھا گویا یہ گھر اس کی اپنی ملکیت ہو..... حشمت زیدی جیسا جاہ جلال والا بندہ بھی حیران رہ گیا گو کہ اب انہوں نے حیران ہونا چھوڑ دیا تھا مگر پہلی بار..... انہیں اس کیئر ٹیکر کو دیکھ کر اچھا لگا اس کا مالکانہ استحقاق بھرارویہ انداز دل کو بھایا شاید تنہائی کے عفریت سے بچنے کو وہ اس کی ذات میں دلچسپی لے رہے تھے تقدیر کا کیسا ہیر پھیر تھا کہ حشمت زیدی جیسا قابل، ناقابل تسخیر شخصیت کا حامل شخص ایک معمولی سی کیئر ٹیکر کی ذات میں دلچسپی کا پہلو ڈھونڈ رہا تھا..... یہ قدرت کی ستم ظریفی ہی تو تھی مگر زعم اناء کے مارے لوگ اکثر ہی تقدیر اور وقت کے تھپیڑے کھانے کے بعد اپنی بھی باتیں اور اصول بھول جایا کرتے ہیں سو حشمت زیدی کو بھی یاد نہیں رہا..... ورنہ شاید مر جاتے

”آپ کا گھر اچھا ہے مگر بہت اچھا نہیں“ کھلی ہوئی کلی گھوم پھر کر واپس ان کے سامنے آجلی تھی۔

”یہ گھر کہاں ہے یہ تو مکان ہے“ ان کے اندر کا سارا کرب لہجے میں ڈھل گیا کھلی ہوئی کلی نے چونک کر دیکھا۔

”آپ نے اسے مکان کیوں بنے دیا..... آپ کو گھر اچھے نہیں لگتے کیا؟“ وہ کتنی بڑی بات کر رہی تھی نوکری

کے پہلے ہی دن..... اتنا ذاتی سوال..... وہ گھر سے نکالی بھیجی جاسکتی تھی حشمت زیدی کے جاہ جلال سے کون واقف نہیں تھا

پھر کلی نے ایسے بے احتیاطی کیوں کی تھی کیا وہ ان کی عادات سے ناواقف تھی ادب کی دنیا کی اتنی معروف شخصیت کو وہ کیوں

نہیں جان سکتی تھی یا پھر وہ نڈر تھی یا نا سمجھ..... مگر وہ نڈر ہی تھی تبھی تو آنکھیں ان کے بھریوں والے چہرے پر گاڑھے جواب

کی منتظر تھی۔ حشمت زیدی کو برا نہیں لگایا ان کے لیے بھی حیرت کا مقام تھا مگر انہیں کلی کو ٹوکنا بھی اچھا نہیں لگا جواب تو تھا

نہیں..... اسی لیے مسکرا کر چپ ہو گئے۔ آپ نے جو اسے نہیں دیا..... پوچھ سکتی ہوں کہ کیوں نہیں دیا۔ کھلی ہوئی کلی پاؤں

بسا رہے ان کے سامنے آئیٹھی نیلے سمندر جیسی آنکھوں میں اشتیاق کی سرخی لہرا رہی تھی چہرہ کا بھولپن استحقاق کی روشنی میں

مدغم ہو کر چہرے کی چمک بڑھا رہا تھا حشمت زیدی کو اس میں ضد اور ہٹیلاپن واضح دکھا..... ان کے اپنے ناولز کی ہیروئن کی

طرح..... جن کی مداح ایک دنیا تھی

”گھر تو عورت سے ہوتا ہے..... اور مجھے محو رتیں اچھی نہیں لگتیں“ انہوں نے تھک کر ٹوٹی سانس بحال کی

..... کبھی کبھار عام سے سوال کے مشکل جوابات دینے بہت دشوار لگتے ہیں۔

”جھوٹ“ کلی نے حسب عادت کھل کے ترحوہ کی ناچاہتے ہوئے بھی وہ چونک گئے بولا ان کے سامنے ان کی

کئی بات سے تردید کرنا ممکن تھا کسی کے لیے..... اور یہ چھٹانک بھر کی لڑکی.....

”میں مان ہی نہیں سکتی یہ بات، سر کو دائیں بائیں نفی میں جنبش دیتے ہوئے وہ پر یقین تھی“

”تم مجھے کتنا جانتی ہو بھلا“ انہیں برا نہیں لگا انہیں عجیب لگا تھا۔

”جتنا میں آپ کو جانتی ہوں اتنا آپ خود کو بھی نہیں جانتے“ کھلی ہوئی کلی کا پر اعتقاد انداز مدلل اور قطعی تھا۔ اس

کی بات سن کے وہ ہولے سے انداز میں مسکراتے ہوئے بولے۔

”تم اپنی عمر سے بڑا دعویٰ کر رہی ہو“

”کلی..... بغیر ثبوت کے دعویٰ نہیں کرتی“ اس کے لہجے میں خودی کے اعتقاد کا چشمہ پھوٹ پڑا تھا۔ جس نے کلی

کی پور پور کو بھگوننا شروع کر دیا تھا۔ پہلی بار وہ دل کھول کے ہنسے شاید بہت مدت کے بعد..... انہیں اس چھوٹی سی لڑکی کی پر اعتقاد شخصیت میں اپنی جھلک نظر آئی مگر کلی برا مان گئی۔

”آپ میرا مذاق مت اڑائیں..... یہ بات میں ثابت بھی کر سکتی ہوں“ اس کا روکھا پن گول چہرے کی

معصومیت پر حاوی ہو گیا۔

”اچھا..... مگر کیسے“ اب کی بار انہوں نے دلچسپی سے پوچھا۔

”میں آپ کی بہت بڑی فین ہوں جناب..... جتنا میں نے آپ کو پڑھا ہے اتنا کوئی اور نہیں پڑھ پایا ہوگا اور

آپ کے ہر ناول میں مرکزی کردار عورت کا ہی ہوتا ہے آپ عورت کو مضبوط شخصیت کے روپ میں دنیا کے سامنے لانا

چاہتے ہیں آپ کی تخلیق کردہ عورت..... آج کی عورت کی نمائندہ ہے ہر عورت آپ کی تخلیق کردہ عورت کو کاپی کرنا اپنا فخر

سمجھتی ہے آپ ہر عورت کو مضبوط و مستحکم اور کامیاب دیکھنا چاہتے ہیں تو اسی لیے ناں کہ آپ کو عورت پسند ہے مگر اس کی

بے بسی اور بے کسی آپ کو دکھ دیتی ہے آپ کو عورت کے دکھ..... دکھی کر دیتے ہیں“ کلی کا جوش و خروش آخری جملے پر دھیمبا پڑ

گیا“ اور یہ سچ ہے کہ آپ کی ہر تخلیق کردہ عورت کے دکھ پر میں پہروں روئی ہوں اور جانے مجھے ایسا کیوں لگتا تھا ہر بار کہ

آپ بھی تحریر کے ساتھ ساتھ روئے ہوں گے۔

کلی کے خاموش ہونے پر وہ یوں ہنسے گویا رو دیے ہوں انہوں نے سر کو جھٹکا ایسے جیسے دکھوں کو جھٹک رہے

ہوں مگر کچھ دکھ زندگی کا ناسور بن جاتے ہیں جو ہماری حماقتوں کی وجہ سے ہمارے حصے میں آتے ہیں ساری زندگی ہمارے

ساتھ چلتے ہیں نہ ٹھیک ہوتے ہیں نہ مضلل بس رستے ہی رہتے ہیں۔

”تم باتیں بہت کرتی ہو..... جب سے آئی ہو چائے تک تو پلانی نہیں مجھے تم نے..... جبکہ تمہارا دعویٰ تھا کہ تم

میرا اوروں سے بہتر خیال رکھ سکتی ہو“ انہوں نے اسے بات بدلتے ہوئے ڈپٹ دیا تھا کلی نے سر پر چپت مار کے خود کو اس

غلطی کی جیسے سزا دی۔

”میں ابھی آپ کے لیے چائے لاتی ہوں..... آپ نے اس جیسی اچھی چائے زندگی میں کبھی نہیں پی

ہوگی“ اس نے حسب عادت پھر دعویٰ کیا تھا..... اور کچن کی جانب سر پٹ بھاگ گئی تھی۔



”سر..... آپ سے کوئی ملنے آیا ہے..... وہ بیڈ پر دراز گاؤتیکے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے ہاتھ میں کتاب پڑھ رہی تھی اپنا ہی پانچ سال قبل شائع ہونے والا ناول تمام رکھا تھا جیسی کلی نے کمرے کے اندر جھانک کے دیکھ کر کہا تھا۔“

”کون ہے؟“ وہ بس ذرا کی ذرا متوجہ ہوئے تھے۔

”معلوم نہیں..... میں تو نہیں جانتی“ اس نے کندھے اچکاتے ہوئے جواب دیا تھا۔ حشمت زیدی نے ایک ٹھنڈی آہ فضا کے سپرد کی بھلائیہ لڑکی تھی کیا چیز..... انہیں بتانے سے پہلے کم از کم اسے آنے والے سے پوچھ تو لینا چاہیے تھا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے بے شک وہ ادب کی دنیا کے ایک قدآور شخصیت تھے ایوارڈ یافتہ ڈرامہ نویس تھے ان سے ملنے والوں کا ایک جم غفیر تھا مگر پھر بھی..... اپنی بیماری کے باعث اب نہ وہ زیادہ دیر بیٹھ سکتے تھے نہ ہی بات چیت کر سکتے تھے اسی لیے وہ بہت خاص لوگوں سے انتہائی ضرورت کے تحت ملا کرتے تھے..... گھر میں چونکہ اکیلے تھے اسی لیے انہیں اپنے لیے ایک کیئر ٹیکر کی ضرورت پڑی تھی، انہیں یادداشت کا عارضہ بھی لاحق ہو گیا تھا تبھی تو دو الینا بھول جاتے تھے جس کا نتیجہ ان کے بیمار پڑنے کی صورت میں نکلتا تھا۔ آفاق (جھنجھکا) کے جرمنی جانے کے بعد ہی وہ زیادہ بیمار پڑے تھے شوگر اور ہائی بلڈ پریشر کی وجہ سے انہیں بائیں طرف فالج ہوا تھا اور اب وہ چلنے پھرنے سے قاصر تھے زیادہ وقت اپنے کمرے میں گزارتے تھے یا کبھی کبھار وہیل چیئر پر باہر چلے جاتے گھر کے کام کاج کے لیے ایک جزوقتی ملازمہ آتی تھی مگر کلی کے آنے کے بعد تمام گھر کی ذمہ داری اس نے از خود اپنے سر لے لی تھی ہاں اوپر کے کاموں کے لیے ایک لڑکا رکھا ہوا تھا اور کلی کا بس چلتا تو اسے بھی چلتا کرتی کہ بہ زعم خود وہ محترمہ خود بھی کافی پھرتیلی واقع ہوئی تھیں اور خاصی نڈر اور بے باک بھی.....“

”بیج دوں اندر.....“ انہیں سوچ میں گم دیکھ کے وہ ایک بار پھر احتراماً پوچھ رہی تھی۔

”تم نے نام پوچھ لینا تھا ان سے“ جانے وہ سختی کیوں نہیں کر سکے۔

”نام پوچھنے سے کیا فرق پڑ جاتا..... آپ بتائیں اگر آپ کی طبیعت ٹھیک ہے تو انہیں بلا لاتی ہوں۔ آپ نوارو سے مل لیجیے ورنہ میں آپ کی طبیعت کا بتا کر ان صاحب سے معذرت کر لیتی ہوں.....“ اس نے ان کے تھکے تھکے نڈھال چہرے کی طرف دیکھ کر توقف کیا پھر خود ہی وضاحت دیتے بول اٹھی شاید اس نے بھی ان کے غیر مطمئن انداز کو نوٹ کر لیا تھا۔

”سر..... آپ کی طبیعت اب ٹھیک نہیں رہتی اب آپ اپنے دیرینہ اور خاص دوستوں سے مرونا بھی گفتگو کے لیے وقت نہیں نکال پاتے آپ کی صحت آپ کو اس بات کی اجازت نہیں دیتی اسی لیے میں نے مفتی صاحب کو ایسا کہا ہے“ اس نے آہستگی سے کہہ کر سر جھکا لیا تھا لہجہ مضبوط اور قطعی تھا گویا اس نے جو کیا تھا اپنے تئیں بالکل ٹھیک کیا تھا۔

”مفتی نصیر الدین آئے ہیں“ حشمت زیدی کے دیرینہ دوست، بہت بڑے کالم نگار اور ڈرامہ نویس..... وہ ان کے تئیں برس پرانے دوست تھے کلی نے ان کے استفسار پر اثبات میں سر کو جنبش دی۔

”وہ میرے تیس سال پرانے دوست ہیں اور تم نے انہیں باہر بٹھا دیا ہے؟“ انہیں بے حد غصہ آیا تھا۔

”یعنی میرے گھر میں مجھ سے ملنے کے لیے اب اسے اجازت درکار ہونے لگی.....“ ان کے لہجے میں غصہ اور رنج ایک ساتھ پنہاں ہونے لگا کلی کا سر جھک گیا ناچاہتے ہوئے بھی وہ انہیں غصہ دلا گئی تھی کلی کو دکھ ہوا وہ ان کی بہت عزت و قدر کرتی تھی وہ تو انہیں ناراض کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی دکھ دینا تو پھر دور کی بات.....

”سوری سر..... میں تو بس آپ کی خرابی طبیعت کے باعث..... اس کی بات مکمل نہیں ہو سکی تھی حشمت زیدی نے اس کی بات اس کے لبوں سے اچک لی تھی۔“

”بس..... انہیں بلا کر لے آؤ“ انہوں نے تحکم بھرے لہجے میں اسے ڈپٹا تھا کلی سر پٹ ڈرائنگ روم کی طرف بھاگی تھی۔

”سر آپ کو بلار ہے ہیں..... اس نے آتے ہی مفتی صاحب کو کہا تھا وہ اٹھ کر دروازے کی جانب بڑھنے ہی لگے تھے کہ اس کی آواز نے انہیں رک جانے پر مجبور کر دیا تھا۔“

”سنیں..... وہ آپ کے دیرینہ دوست سہی مگر..... اب وہ پہلے کی طرح آپ کے ساتھ لمبی نشیمن نہیں جما پائیں گے آپ ذرا کام کی بات جلدی کر لیجیے گا“ مفتی صاحب بے چارے رتو ہونے ہو گئے منہ آپ ہی مارے حیرت کے کھل گیا۔

”اب چلیں بھی..... ان کی طبیعت ویسے بھی آج صبح سے ٹھیک نہیں ہے“ وہ ان کے تاثرات سے بے نیاز اپنی ہدایات ان کے گوش گزار رہی تھی۔

”یہ بچی کون رکھی ہے تم نے زیدی، اندر آتے ہی انہوں نے سلام دعا کے بعد پہلا سوال یہ دیا تھا۔“ کلی کے پیروں کے نیچے سے زمین کھسکی وہ چائے لینے بھاگی..... زیدی صاحب کو ان کے استفسار پر بلا وجہ کی شرمندگی ہوئی انہیں جیسے یقین تھا کلی نے کچھ نہ کچھ انہیں بھی کہا ہوگا۔

”معاف کرنا یار..... جانے کس طرح غلط فیصلہ کر گیا اور اسے رکھ لیا جیسے میرے دوستوں کی خبر ہی نہیں ہے عجیب من مانی کرنے والی لڑکی ہے..... اب بھی تمہیں اتنی دیر باہر بٹھائے رکھا اور مجھے خبر تک نہ دی“ انہوں نے شرمندگی سے وضاحت دی تو مفتی صاحب بے ساختہ مسکرائے۔

”مجھے بالکل برا نہیں لگا یار..... میں تو یہ اس لیے پوچھ رہا تھا کیونکہ پہلی بار تم نے کوئی درست فیصلہ کیا ہے“ وہ ہنس دیے تھے زیدی صاحب کو تعجب سا ہوا۔

”مطلب؟“

”مطلب یہ کہ..... تم نے اس لڑکی کو رکھ کر بہت اچھا فیصلہ کیا ہے اسے تمہاری بہت پرواہ ہے اور تمہاری صحت کی خرابی کا از حد خیال بھی..... ورنہ سچ پوچھو تو میں خود کو تمہارا لنگوٹیا یا رکھتا ہوں مگر جب تم سے ملنے کے لیے آتا ہوں تو اپنی باتوں کے قصوں میں اتنا محو ہو جاتا ہوں کہ یہ بھی بھول جاتا ہوں کہ تم نہ زیادہ بیٹھ سکتے ہو نہ ہی زیادہ بات چیت کر سکتے ہو مگر

آج اس لڑکی کی وجہ سے مجھے اس بات کا احساس ہوا ہے اور مجھے بہت اچھا لگا ہے کم از کم کوئی تو ہے جو تمہارا بہتر خیال رکھ سکے گا اب“ زیدی صاحب کوکلی کی تعریف سن کے بے حد اچھا لگا۔ کچھ دیر پہلے جوان کا موڈ خراب ہوا تھا وہ مفتی صاحب کی بات سن کے اب ٹھیک ہو گیا تھا بلکہ قدرے خوشگوار ہو گیا تھا انہیں کچھ دیر قبل کلی کی کہی ان کی صحت کے حوالے سے بات یاد آئی تھی..... بے ساختہ وہ مسکرا دیے تھے اس روز مفتی صاحب بھی جلدی اٹھ گئی تھے اور ان کی طبیعت بھی زیادہ خراب نہیں ہوئی تھی۔

☆☆☆

کلی ان کا ناشتہ لے کر آئی تھی..... کارن فلیکس کے ساتھ گرم دودھ اور ابلا ہوا انڈہ تھا۔ حشمت زیدہ نے دیکھا تو ان کا منہ بن گیا تھا وہ ہائی بلڈ پریشر کے مریض تھے انڈہ کبھی نہیں کھاتے تھے اور انہوں نے آتے ہی کلی کو اپنا ڈائٹ چارٹ اور دواؤں کا استعمال سمجھا دیا تھا اور وہ اپنے اصولوں میں کس قدر سخت اور قطعی تھے یہ بھی مگر کلی کو جیسے ان سے متعین کردہ اصولوں سے انحراف کرنے میں مزہ آتا تھا تبھی تو روز ہی کوئی نہ کوئی ان کا اصول توڑ دیتی۔

”پہلے انڈہ کھالیں سر..... تب تک دودھ تھوڑا ٹھنڈا ہو جائے گا آج میں زیادہ گرم کر بیٹھی تھی“ وہ ان کے سرد برقیے تاثرات سے بے نیاز اپنی ہدایات دے رہی تھی۔

”مجھے انڈہ نہیں کھانا تھا! بمشکل تمام اپنے غصے کو کنٹرول کرتے وہ بول پائے ورنہ توجی چاہ رہا تھا کہ وہی انڈہ اٹھا کر اس کے سر میں مارتے جو شاید جان بوجھ کے انہیں زچ کرتی تھی ویسے بھی وہ مزاحا شارٹ ٹیمپرڈ تھے رہی کس بیماری نے چڑچڑاہا کر پوری کر دی تھی مگر وہ ازلی بے نیازی سے پوچھ رہی تھی۔“

”ارے..... آپ کو انڈہ پسند نہیں کیا مجھے تو اتنا اچھا لگتا ہے“

”اف“ ان کا جی چاہا وہ اپنا سر نوچ ڈالیں کیونکہ بال تو جھڑ چکے تھے۔

”شاید آپ بھول رہی ہیں کہ میں بلڈ پریشر کا مریض ہوں اور مجھے انڈہ ڈاکٹر نے روکا ہے“ وہ غصے کو دباتے ہوئے الفاظ نہیں اسکا وجود چارہ ہے تھے گویا..... کہانیوں میں ضدی، بیٹی اور منہ پھٹ بے نیاز ہیر و سنز کی خود سری بے وقوفی کے قصے تحریر کرنا بہت آسان تھے جبکہ حقیقت میں برداشت کرنا بہت مشکل..... جبکہ وہ مزے سے انڈہ چھیل کے کھا رہی تھی

”ارے سر آپ بھی کمال کرتے ہیں ڈاکٹر ز کو کیا پتا..... وہ تو بس ایویں ہر چیز سے روک دیتے ہیں اب بھلا بیمار بندہ کیا کھائے گھی، چینی، نمک تو وہ روک دیتے ہیں اور خالی ہوا سے پیٹ بھرتا نہیں..... اور انڈے کے پیچھے تو یہ ڈاکٹر ز ویسے ہی پڑے رہتے ہیں بھلا ایک بے ضرر سا انڈہ اتنے بڑے انسان کا کیا بگاڑ سکتا ہے بلکہ اس میں موجود پروٹین جو جسم کے لیے بے حد مفید ہوتا ہے..... بھی میں تو روز انڈہ کھاتی ہوں چاہے سنڈے ہو یا منڈے روز کھاؤ انڈے.....“ وہ بے حد مزے سے انڈہ کھاتے ہوئے بول رہی تھی حشمت زیدی نے بے حد خاموشی سے اس کے بے فکرے انداز کو دیکھا زمانے کی تختیوں سے بے نیاز اسکا چہرہ ہر قسم کے تفکر سے پاک تھا انہیں بے ساختہ اس پر رشک آیا وہ کس قدر خوش نصیب تھی جو من

موجی کرتی تھی مزے سے جیتی تھی جس کے چہرے پر تفکرات کا جال نہیں بچھا نظر آتا تھا مگر وہ یہ بھول گئے تھے کہ ضروری نہیں کہ جن کے چہرے صاف اور تفکرات سے پاک نظر آئیں انہیں کوئی دکھ نہیں ہوتا بعض لوگ دکھوں کو ہنسی کی تہہ میں بھی چھپائے رکھتے ہیں دکھ دیمک کی مانند انہیں چاٹ کے کھوکھلا کر دیتے ہیں مگر کسی کو خبر ہی ہونی نہیں پاتی۔

”مگر یہ بالکل بھی ضروری نہیں کہ آپ اپنی صحت سے کوتاہی برتیں میں جانتی تھی کہ آپ کو انڈہ پسند تو ہے مگر ڈاکٹر نے منع کر رکھا ہے یہ میں نے اپنے لیے بنایا تھا، حشمت زیدی نے اس کی اس حرکت پر اسے گھور کے دیکھا تو کیا وہ انہیں لپچا رہی تھی“

”نہیں سر..... میں آپ کو لپچا نہیں رہی تھی مگر میں نے ویسے ہی پوچھ لیا کیونکہ بیمار انسان کے دل میں بھی ایک خواہشات کا سمندر موجزن رہتا ہے اور کبھی کبھی بے احتیاطی کر لینے سے کوئی مسئلہ نہیں بنتا نہ ہی ایک دن ڈائٹنگ چھوڑنے سے کوئی موٹا ہو جاتا ہے“ وہ بے ربط سے انداز میں مثال دے رہی تھی مگر اس کے چہرے سے ایسا لگتا تھا جیسے وہ خود بھی اپنی دی جانے والی وضاحت سے مطمئن نہیں ہے مگر اسے چہرے کے تاثرات پڑھنے آتے تھے حشمت زیدی نے اس کی بات سننے کے بعد بے حد آہستگی سے سوچا تھا۔

”ناشتہ کر لیں سر..... دس بجے آپ کو دوا بھی لینی ہے“ وہ ان کے بے جا خاموشی سے شاید گھبرا گئی تھی تھی بول اٹھی تھی ویسے بھی زیادہ دیر وہ خاموش رہ نہیں سکتی تھی زیدی صاحب نے اسے اکثر خود کلامی کرتے دیکھا تھا پورے گھر میں چکراتے وہ اونچی آواز میں بڑبڑاتی رہتی تھی کبھی بجلی پر برستی کبھی گیس کی لوڈ شیڈنگ کرنے والوں کو کوستی اور نہیں تو حشمت زیدی کی لائبریری سے نکال نکال پر پڑھی جانے والی کتابوں کے اقتباسات دہراتی رہتی جن میں سے اکثر ہی زیدی صاحب کے ناولز کی کہانیوں کے اقتباس ہی ہوتے اور حشمت زیدی کو برملا اعتراف تھا اس بات کا کہ ان سنہری الفاظ کو تخلیق کرتے سمے وہ اس قدر خوبصورت اور تاثیر بھرے نہیں تھے جتنے کلمی کی زبان سے ادا ہونے کے بعد وہ دلنشین محسوس ہوتے تھے وہ زندگی کی حکایتوں پر مبنی فلسفہ بگھارتے کوئی ماورائی کردار ہی دکھتی اور محسوس ہوتی تھی کبھی البر، بے نیاز اور شوخ کبھی سنجیدہ مدبر اور متین..... وہ چلتا پھرتا کوئی ماورائی کردار ہی تھی زیدی صاحب نے بارہا اس کی شخصیت میں مخفی داستانوں کو کھوجنا چاہا تھا اسے ایک ماہ سے زائد کا عرصہ گزرا تو زیدی صاحب نے اسے کچھ رقم دینا چاہی تھی..... وہ بقول اسکے اخبار میں ان کا دیا اشتہار پڑھ کر ان کے پاس نوکری کی درخواست لے کر آئی تھی یہ الگ بات کہ درخواست بس اسی کے بقول تھی ورنہ عملاً تو وہ تہیہ کر کے آئی تھی ان کے ہاں یہ جاب کرنے کا اور گھر سے ہی یہ یقین بھی اپنے ساتھ باندھ لائی تھی کہ اسے ہی یہ جاب ملنی ہے نہ ملتی تو وہ قائل کر لیتی جیسا کہ اس نے کیا بھی تھا۔

”مجھے پیسے نہیں چاہئیں سر! وہ روپے دیکھ کر یوں بدکی گویا کوئی سانپ دیکھ لیا ہو“

”میں نے آپ سے کہا تھا مجھے اس خدمت کے پیسے نہیں لینے، کھلی ہوئی کھلی کے لہجے میں درد سمٹ آیا۔ زیدی صاحب اس کی کیفیت سمجھ نہیں سکے بلکہ الجھ گئے۔

”مگر..... تم میری اتنی خدمت کرتی ہو..... میرا بھی تو کوئی حق بنتا ہے“ ان کے سادہ سے لہجے پر کھلی نے انہیں

ایک نظر دیکھا۔

”میں آپ کی خدمت کسی بھی صلے کی تمنا کے بغیر کرتی ہوں سر..... میں آپ کی فین ہوں آپ کی ہر تحریر ہر جملے سے محبت کرنے والی..... پہلی بار مجھے آپ کے قریب رہنے کا موقع ملا ہے اور اسے میں کسی غرض کی نظر نہیں کر سکتی اور یہ بات حشمت زیدی جیسے عالمگیر شہرت رکھنے والے رائٹر کے لیے نئی نہیں تھی وہ جوان اور بوڑھے ہر طرح کے لوگوں کے دلوں پر راج کرتے تھے ان کی تحریریں قارئین کے دلوں میں روشنی امید اور مصبت کا دیا بن کر جلتی تھیں دھڑکتی تھیں یہی وجہ تھی جب اپنی بیماری کے باعث انہوں نے اخبار میں کیئر ٹیکر کی تلاش کا ایڈ دیا تو شہر بھر سے موصول ہونے والی کالز کی تعداد سینکڑوں میں تھی ان کے اس قدر چاہنے والے تھے کہ کیا ہی کسی آسکر ایوارڈ یافتہ کسی اداکار کے ہونگے۔ ان کے یہی چاہنے والے ان کی زندگی بھر کا حاصل تھے ان کا غرور ان کا فخر و انبساط..... وہ خوش نصیب تھے مگر حقیقتاً نہیں تھے وہ لوگوں کی بھیڑ میں ان کی چاہتوں کے جہوم میں گھرے تھے لیکن درحقیقت اکیلے تھے اور یہ بات دنیا والے انہیں جانتے تھے مگر کھلی ہوئی کلی جان گئی تھی اور کہیں نہ کہیں وہ انہیں پہچان گئی تھی۔

”مگر یہ غرض تو نہیں ہے..... تم میرا تاخیل رکھتی ہو میری خاطر مجھے ہی ڈانٹ دیتی ہو تو کیا میں اتنا خود غرض ہوں کہ تمہارا خیال نہ رکھوں“ انہوں نے اسے عادت کے برخلاف وضاحت دی کھلی ہوئی کلی اور کھل گئی مسکراہٹ نے اس کے چہرے پر ستاروں جیسی جھللاہٹ بکھیر دی تھی۔

”مجھے جب کچھ چاہیے ہوگا بتا دوں گی بلکہ زبردستی لے لوں گی آپ سے“

”مگر میرے پاس ایسا کیا ہے پیسے کے علاوہ..... میں تو خالی ہاتھ ہو چکا اب..... میرے دامن میں سوائے پچھتاؤں کے اور ہے ہی کیا..... میں تو ایک ہارا ہوا شخص ہوں جو دکھوں کا بار اٹھاتے اٹھاتے تھک گیا ہوں.....“ جواباً وہ جیسے شرمندہ سے ہو گئے اپنی خدمت کے عوض اگر کلی نے کچھ ایسا مانگ لیا جو وہ دے نہ سکے تو..... اس اس خوف ناک سوچ کا کرب برزا جان بلب تھا۔

”جو آپ مجھے دے سکتے ہیں وہ مجھے اس دنیا میں اور کوئی نہیں دے سکتا سر..... اور جو مجھے چاہیے وہ آپ کے علاوہ اور کسی کے پاس ہے بھی نہیں“ اس نے مسکرا کر بہم سالجہ اپنایا تھا

”مثلاً کیا“ انہیں اس پہیلی پر تجسس ہوا۔

”بتا دوں گی..... ابھی اتنی جلدی بھی کیا ہے“ وہ پراسرار مسکراہٹ سجائے ان کے تجسس کو ہوا دے رہی تھی۔

”ابھی کیوں نہیں“ ان کے لہجے میں بے چینی در آئی وہ عمر کے اس حصے میں نہیں رہے تھے کہ انتظار کی گھڑیاں گن سکیں۔

”اس لیے کیونکہ فی الحال آپ کے پاس وقت نہیں ہے..... میں نے فزیو تھراپسٹ کو فون کر دیا ہے وہ بس آتا ہی ہوگا اب آپ کچھ دیر آرام کر لیں پھر میں آپ کو دھوپ میں لے جاؤں گی وہ حسب عادت ہدایات دیتی چھپاک سے نکل گئی تھی پیچھے انہیں سوچوں کے گھٹے اندھیرے جنگل میں تنہا چھوڑے ہوئے“



”آپ کو بچے اچھے لگتے ہیں سر.....“ پارک میں کھیلتے بچوں کو دیکھتے اس نے بڑے اشتیاق سے پوچھا تھا۔
 ”نہیں“، ایک لفظی جواب میں کہہ کر انہوں نے گویا بات ختم کرنے کی کوشش کی تھی مگر کھلی ہوئی کلی کا منہ حسب
 عادت حیرت سے کھل گیا وہ ذہیل چیخ کر دوڑ کے گھوم کے ان کے سامنے گئی زیدی صاحبہ جھنجھلا گئے انہیں کی اس کی اسی
 عدالت سے ڈر لگتا تھا جو وہ وقت بے وقت جگہ بے جگہ لگائے کھڑی ہو جاتی تھی۔

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے سر..... آپ کہانیوں میں تو ہر مرد کو بچوں سے عشق ہوتا ہے“
 ”مجھے میری تخلیق کردہ کرداروں سے منسوب مت کیا کرو کلی..... میں اپنی تخلیق کردہ کہانیوں میں کہیں نظر نہیں
 آتا“ انہوں نے اسے ٹوک دیا تھا۔

”نہیں سر..... ایک تخلیق کار اپنی ہر تخلیق میں سانس لیتا نظر آتا ہے وہ ہر جگہ محسوس ہوتا ہے اس نے بڑی روانی
 اور جوش سے ان کی بات کی تردید کی“ زیدی صاحبہ چڑ سے گئے اس لڑکی کو خدا جانے ان سے کیا یہ تھیرا جو ان کی ہر کبھی بات
 کی تردید کر دیتی یوں ظاہر کرتی گویا وہ انہیں خود سے زیادہ جانتی ہو۔

”تم کتنا جانتی ہو میرے بارے میں.....“ وہ ایک دم غصے میں آ گئے تھے آنکھوں میں غصے و درشتی کی سرخی
 آنکھیں دہکا رہی تھی لب بھینچے ہوئے تھے گویا بڑے ضبط کے مراحل سے گزر رہے ہوں کلی نے انہیں ایک نظر دیکھا پھر
 مضبوط لہجے میں بولی۔

”جتنا میں نے آپ کی تحریروں میں آپ کو جانا ہے اس حوالے سے آپ بچوں کو پسند کرتے ہیں آپ بچوں کو
 فرشتوں سے منسوب کر دیتے ہیں انہیں پھول کہتے ہیں ان کے منہ بسور نے پر آپ دکھی ہوتے ہیں ان کی شرارتوں پر آپ
 معظوظ ہوتے ہیں..... سر آپ کو بچے اچھے لگتے ہیں مضبوط لہجے میں سمجھاتے گویا وہ انہیں اس حقیقت کو مان لینے پر آمادہ کر
 رہی تھی کیسی پاگل لڑکی تھی جو اپنے سے دو گنا بڑے آدمی کو اس کے رائج کردہ اصول و ضوابط توڑنے کی باتیں سمجھایا کرتی تھی
 وہ انہیں ان سے زیادہ جاننے کا دعویٰ کرتی تھی وہ انہیں انہی کی رائے اپنے بارے میں بدلنے کی بات کرتی تھی وہ غلط نہیں
 تھی مگر عجیب ضرور تھی وہ انہیں اپنی نظر سے دیکھتی تھی اس کے ذہن میں جو تخیل ان کی شخصیت کا بن چکا تھا وہ انہیں اس
 حوالے سے دیکھا کرتی تھی جانچا کرتی تھی اور اس بات کی خواہاں رہا کرتی کہ ”حشمت زیدی“ خود کو اسی کی نظر سے دیکھا
 کریں وہ نڈر تھی اور دلیر تھی جو حشمت زیدی کے بارے میں اپنی قطعی رائے پیش کرتی تھی اور اسی پر ڈٹ جاتی تھی۔

”تم نے ابھی دنیا نہیں دیکھی لڑکی..... کتابوں کی دنیا سے نکل آؤ حقیقت کچھ اور ہے..... ایک تخلیق کار کی تخلیق
 کردہ دنیا چاہے جتنی بھی حسین و مکمل سہی مگر ضروری نہیں کہ اس کی زندگی بھی اسی قدر حسین و مکمل ہو..... اتنی ہی آسودہ اور
 خوشحال ہو اور اس کی شخصیت اگر کامل و یکتا محسوس ہو تو یہ بھی ضروری نہیں کہ حقیقت میں بھی وہ تخلیق کار مادرائی دنیا کا ہی
 فرشتہ صفت انسان ہو..... سوچیں خوبصورت اور مکمل ہو سکتی ہیں مگر انسان نہیں، انہوں نے دو آسمان پر اڑتے پرندوں کو
 دیکھتے کسی غیر مرئی نقطے پر نگاہ جمائی۔ کلی ان کے چہرے سے نظر نہیں ہٹا سکی ہٹا سکتی بھی نہیں تھی ان کے چہرے کے تاثرات

میں واضح دھتے درد نے کلی کی نگاہوں کو جیسے باندھ سادیا تھا ماضی کا خوفناک عفریت پھر انہیں ڈس رہا تھا وہ بہت تکلیف میں تھے۔“

”تو پھر لکھاری ایسی دنیا تخلیق ہی کیوں کرتے ہیں سر..... کہ بندہ خود بخود ایسی دنیا میں رہنے کے خواب دیکھنے لگے جہاں صرف محبت، سکون اور خوشحالی ہوتی ہے جہاں اعتماد ہوتا ہے محبت کی فضا ہوتی ہے جہاں کسی کی مضبوط پناہ گاہ کا احساس ہوتا ہے..... یہ تو دھوکہ دینے والی بات ہوئی ناں راہ سے بھٹکانے والی..... اس کی بات پر وہ دھیرے سے مسکرائے تھے انہیں کسی کی یاد آئی تھی۔“

”تخلیق کار اس معاشرے کا حساس ترین فرد ہوتا ہے لڑکی.....“ اگر وہ اپنے ارد گرد اپنی دنیا نہ بسائے تو زمانے کی سختی اور گرمی میں پکھل کر مر جائے اس کی ایک دن کی زندگی بھی اچھی نہ گزرے اسی لیے وہ اپنی دنیا بسا لیتا ہے جس میں وہ اپنی مرضی سے جیتا ہے جہاں زندگی اس کے تابع ہوتی ہے..... اور میرے خیال میں ایک تخلیق کار کا اتنا تو حق بنتا ہی ہے“

”تو پھر میرے لیے بھی ایک ایسی دنیا تخلیق کیجیے ناں سر..... جہاں سب کچھ میری ہی مرضی سے ہو..... جہاں میرے ہونٹوں سے ہنسی جدا نہ ہو جہاں کبھی میری آنکھ میں آنسو نہ آئے جہاں میرے درد ہانٹنے والے ہوں“ کلی کی نیلی آنکھوں میں نمکی چمکی لہجہ بھر گیا زیدی صاحب چونک گئے وہ ان دو ماہ میں پہلی بار کھلی تھی مبہمی غریب سے انداز میں..... مگر درد کی زبان نہیں ہوا کرتی اس کا محسوس ہونے کا انداز ہمیشہ ایک سا ہی ہوتا ہے اور وہ درد میں تھی دکھی وغیرہ تھی وہ لحوں میں جان گئے تھے مگر انہیں ظاہر نہیں کرنا تھا۔

”بتائیں ناں سر..... بتائیں گے، میرے ارد گرد بھی ایسی دنیا..... جو صرف میری دنیا ہو جہاں صرف میرے پاس صرف خوشیاں ہی خوشیاں ہوں..... اس سے اس کے چہرے پر اتنا کرب تھا کہ وہ انکار نہیں کر سکے وہ جانتے تھے اس کی زندگی محرومیوں میں گزری ہے“

”ہاں میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے لیے ایسی دنیا بناؤں گا مگر اس سے پہلے میں تمہیں ایک اور کہانی سناؤں گا جسے میں نے کبھی کسی سے شیئر نہیں کیا مگر اس کی تنگی میری پوری زندگی پر محیط ہے میں کبھی اس کے حصار سے نکل نہیں سکا میں کبھی اس تکلیف کو ختم نہیں کر پایا“

”میں تمہیں اپنی زندگی کی کہانی سناؤں گا.....“ کلی نے ایک دم تحیر سے انہیں دیکھا جنہوں نے نجانے کیوں مگر ایک دم ہی یہ فیصلہ کیا تھا۔



”مجھے تمہارے پیسوں کی ضرورت نہیں ہے..... مجھے تمہاری ضرورت ہے میں تنہائی سے جنگ لڑتے اب تھک گیا ہوں یار.....“ کلی دروازے پر ہی ٹھٹک کے رک گئی اندر سے آتی آواز نے اس کے قدم جکڑ لیے تھے وہ جتنی بھی کوشش کر لیتی مگر وہ حشمت زیدی کی اندر کی تنہائی دیکھنے پر پناہ نہیں دے سکتا تھا۔

”مجھے بھیجنے والے بھی تو آپ ہی تھے چچا جان..... اب کانٹریکٹ ختم کر کے میرے لیے آنا ممکن نہیں ہے میں خود آپ کے لیے بہت اداس ہوں مگر بہت مجبور بھی پانچ سال مکمل کرنے سے پہلے میرے لیے واپس آنا بہت مشکل ہے۔ دوسری جانب آفاق بہت تڑپ کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ حشمت زیدی کے نڈھال دل کو اس کا جواب سن کے ڈھارس ملی گویا اسے بھی ان کی اسی قدر پروا تھی وہ بھی ان کے لیے اداس تھا دنیا میں کوئی تو انکا اپنا تھا ناں؟“

”تم اپنا کام تسلی سے کرو..... میں تو بس ویسے ہی جب تنہائی سے گھبراتا ہوں تو شکوہ کر بیٹھتا ہوں تم سے میرے لیے تمہاری ترقی و کامیابی اہم ہے تمہارے لیے بھی یہی ہونی چاہیے“

”پھر بھی چچا جان..... مجھے آپ کی بہت فکر رہتی ہے جانے وہ کڑی آپ کا صحیح طرح سے دھیان رکھ بھی رہی ہے یا نہیں؟“ وہ ان کے لیے پریشان و متفکر تھا۔

”ارے اس کی تم فکر مت کرو..... وہ تو پوری تھانیدارنی ہے..... بہت ڈانٹتی ہے مجھے“ کلی کے ذکر نے ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ چمکادی تھی آفاق انہیں ہنستا مسکراتا دیکھ کر پرسکون ہو گیا۔

”بہت سختی کرتی ہے وہ مجھ پر اور ایسا لگتا ہے جیسے میں کوئی معصوم بچہ ہوں اس کے سامنے“

”آپ کی تنہائی کچھ تو کئی ناں چچا جان..... یہ کتنی اچھی بات ہے“

”ہاں یہ بھی ہے..... اس بچی کے ساتھ وقت نہ گزرنے کا احساس ذرا کم ہی ہوتا ہے مگر اپنوں کی کمی وہ بچی پوری نہیں کر سکتی نہ ہی میں وہ رشتے اس کی ذات میں تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ انہوں نے کلی کی طرف داری کی تھی“ آفاق مسکرا دیا انہیں سب کی فکر رہتی تھی ماسوائے اپنے۔

”یہ تنہائی آپ نے اپنے لیے خود منتخب کی ہے چچا جان..... اگر اس وقت یہ فیصلہ نہ کرتے تو آج کس قدر آسودہ حال ہوتے.....“ آفاق نے یہ سب سوچا ضرور مگر اپنے بیمار چچا سے کہا نہیں اب وہ مضبوط قوت ارادہ رکھنے والے انسان نہیں رہے تھے بلکہ اب وہ اپنی عمر سے زیادہ نڈھال اور کمزور ہو چکے تھے ان کا ناتواں دل اب سچائی بھری حقیقت کا سامنا کرنے کا اہل نہیں رہا تھا اب۔

”پھر تو اس بچی کو شاباشی دینا پڑے گی چچا جان..... جوڑ کی آپ کا اتنا خیال بھی رکھتی ہے اور بدلے میں کچھ لیتی بھی نہیں ہے“

”اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ وہ بہت بے غرض لڑکی ہے سارا دن میرے ناولز کی ہیر و منیر کے ڈائلاگز بولتی رہتی ہے“

”یعنی وہ لڑکی آپ کی فین ہوئی ناں پھر تو“ آفاق ہنستے ہوئے جیسے نتیجے پر پہنچا تھا۔

”ہاں..... وہ اس دنیا میں میری سب سے بڑی فین ہونے کا دعویٰ کرتی ہے“ وہ جیسے کلی کی ہی کبھی گئی اس بات سے دوبارہ محظوظ ہوتے مسکرائے۔

”کیوں کیا یہ بھی آپ کو اپنے خون سے خط لکھتی رہی ہے“ آفاق نے انہیں ماضی کی خوشگوار یادوں کا حوالہ دیتے

ہوئے چھیڑا۔

”نہیں..... مگر یہ ان سب سے زیادہ میری قدر کرتی ہے،“ حشمت زیدی کے لہجے میں یقین تھا باہر کھڑی کُلی نے بے ساختہ اطمینان محسوس کیا تھا گویا وہ ان کا اعتماد جیتنے میں کامیاب ہو چکے تھے وہ اسے پسند کرنے لگے ہیں اور یہ کوئی چھوٹی بات نہیں تھی اس کے لیے بہر حال!

☆☆☆

سیارہ اردو ڈائجسٹ آداب عرض لاہور سے شائع ہونے والے وہ ڈائجسٹ تھے جنہوں نے پہلی بار ادب کے فروغ کے لیے کام شروع کیا تھا وہ دور نہ کمپیوٹر کا تھا نہ ہی انٹرنیٹ کا..... لوگوں میں کتب بینی کا ذوق بام عروج تک پہنچا ہوا تھا ہر خاص و عام مطالعے کی اہمیت سے واقف اور اس کا قدردان تھا ڈائجسٹ نے ایسے لوگوں کی مطالعے کے ذوق کی تسکین کی جو لوگ کتاب خرید کر نہیں پڑھ سکتے تھے ڈائجسٹ نے ان کے لیے ایک نئی دنیا قائم کر دی تھی بہت کم پیسوں میں انہیں بہترین ادب پڑھنے کو ملنے لگا تھا دیکھتے ہی دیکھتے ڈائجسٹ کو شہرت کے بام عروج تک پہنچنے سے کوئی نہیں روک پایا۔ اس وقت کا سب سے مشہور ڈائجسٹ سب رنگ تھا جس میں وہ لکھا کرتے تھے ان کے رومان پرور سنسنی خیز ناولز قارئین کے دلوں میں جذبات کا لاڈ لہکا دیا کرتے تھے دنوں میں وہ ایسے مشہور ہوئے جتنی شہرت کسی کوسالوں کی ریاضت سے ملا کرتی ہے محبت پیار اور وفا کی جو دنیا انہوں نے قارئین کے دلوں میں بنائی تھی اس کا تاثر بہت گہرا اور دیر پا ثابت ہوا تھا۔ ہر ماہ انہیں اپنے چاہنے والوں کے میٹکوزں خطوط ملتے جن میں مردوں سے زیادہ خواتین کی تعداد شامل ہوتی تھی فخر و انبساط سے ان کا سر بلند ہو جاتا گردن میں پہلے سے زیادہ کلف لگ جاتی..... ان کے سنسنی خیز رومان پرور کہانیاں خواتین کو ان کے عشق میں گرفتار کرنے میں کامیاب ٹھہری تھیں گو کہ وہ ایسا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے لیکن جب ہر ماہ درجنوں خطوط میں سے آدھے خون سے لکھے ملتے تو ان کا سیروں خون بڑھ جاتا تھا نوجوان لڑکیاں گھر والوں سے چھپ چھپ کے کانچ جاتے ہوئے سب رنگ خرید کر انہیں ٹیکسٹ کی کتابوں میں چھپا کر پڑھا کرتیں..... لڑکیاں بالیاں انہیں بغیر دیکھے ہی ان کے الفاظ کے سحر میں گرفتار ہو کر ان سے مصہبت کرنے لگی تھیں ایک دم سے وہ محبت کے معاملے میں امیر ترین انسان بن گئے تھے۔

”مگر محبتیں پانے والا انسان اتنا خوش نصیب نہیں ہوتا جتنا محبتوں کو سنبھال کر رکھنے والا انسان خوش نصیب ہوتا ہے..... وہ ہر خط کا جواب بہت محبت و توجہ سے دیتے..... ان جیسا نرم خو، خوش گفتار، باتھذیب مصنف جو ہر خط کو توجہ سے پڑھتا تھا اور ہر خط کا جواب انتہائی محبت سے دیتا تھا جس ماہ ان کی کہانی آتی اس ماہ اسٹال پر ڈائجسٹ شارٹ ہو جاتے کسی کو ملتے کسی کو نہیں جن کو نہیں ملتے وہ حشمت زیدی کی کہانیاں فوٹو اسٹیٹ کروا کر وہاں کے پڑھتے پھر تبصرہ بھیجتے..... ڈائجسٹ کے مالکان اور ایڈیٹر بخوبی جان گئے تھے کہ ان کے ڈائجسٹ کی کامیابی کی کنجی اب حشمت زیدی کے ہاتھ میں ہے تبھی انہوں نے ان کا ایک سلسلے دار ناول شروع کر دیا تھا سب رنگ کراچی سے نکلتا تھا مگر پورے ملک میں وہ سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ڈائجسٹ تھا اور ایسا حشمت زیدی کی وجہ سے ممکن ہوا تھا یہی وہ وقت تھا جب ادارے نے انہیں اپنے ساتھ

کانٹریکٹ کے لیے آمادہ کرنا چاہا تھا مگر حشمت زیدی کو اپنی صلاحیتوں کو زنگ نہیں لگنے دینا تھا انہیں اپنا علم اور اپنی تخلیق کو کسی ایک جگہ باؤنڈ نہیں کرنا تھا اسی لیے انہوں نے کانٹریکٹ پر سائن کرنے سے انکار کر دیا تھا اور گزرتے وقت نے یہ ثابت کیا کہ ان کا یہ فیصلہ کس قدر درست تھا ایک اخبار میں ان کا مفت روزہ کا لم لگتا تھا اور اخبار والوں کی ڈیمانڈ تھی کہ ساتھ وہ اپنی فوٹو بھی دیں یہ پہلی بار تھا جب وہ اپنے چاہنے والوں کے سامنے منظر عام پر آئے تھے وہ بلاشبہ بلند قد و قامت کے ایک پرکشش انسان تھے ان کی آنکھیں ذہانت سے بھرپور چمکتی ہوئی تھیں ان کی ناک بالکل ٹیکھی اور سیدھی تھی گویا وہ اپنے ارادوں میں کس قدر اٹل ہیں اس بات کو واضح کرتی ہوئی..... عنابی باریک ہونٹ گھنی مونچھیں کندن کی مانند چمکتی ہوئی گندی رنگت..... گویا ان کے تخلیق کردہ مرکزی کردار ہی خوبصورت نہیں ہوا کرتے تھے وہ خود بھی دیو مالائی حسن رکھنے والے تھے اور یونانی دیوتا ہی دیکھتے تھے“

ان کے منظر عام پر آنے کے بعد ان کے فیر کے خطوط میں شادی کے پیغامات آنے لگے تھے یہ ایک دلچسپ صورتحال تھی ان کے لیے..... لیکن وہ مسکرا کر ٹال جایا کرتے..... ایک بار تو دو لڑکیاں ان کے گھر تک بھی پہنچ گئی تھیں کئی ایک کی سفارش تو اخبار کے ایڈیٹر کو بھی کرنی پڑی تھی مگر وہ ان کے کیریئر بنانے کا وقت تھا بحیثیت تخلیق کار وہ اپنا آپ منوا چکے تھے مگر ابھی بہت سے ترقی کے ستارے جن پر کندوڑا لہنی باقی تھا سوان کا فی الحال ادی کے لیے کوئی ارادہ نہیں تھا پھر انہیں شادی اس سے کرنی تھی جس کو وہ پہلی نظر میں پسند کرتے..... وہ محبت کے دنیا کے باسی تھے پہلی نظر کی محبت پر یقین رکھتے تھے سو ایسا کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ شادی جیسا اہم فیصلہ کسی کی محبت میں کر دیتے..... انہیں شادی اس سے کرنی تھی جسے وہ پسند کرتے جس سے وہ پہلی نظر میں محبت کرتے لیکن انہیں اپنا فیصلہ بدلنا پڑا تھا۔



مال روڈ پر کیتھولک چرچ کے سامنے میزان ریسٹورانٹ بنا ہوا تھا جو دیال سنگھ مینشن کے مخالف سمت میں فخر سے کھڑا تھا یہاں پر بایونائپ کے تخلیق کار اور شاعر حضرات اکٹھے ہوا کرتے تھے..... مل کر بیٹھتے چائے کا مزہ لیتے سگریٹ کے گہرے لمبے کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑتے ادب کی خدمت اور اس کے فروغ کے لیے لمبی لمبی محفلیں جما کر بحث و مباحثہ کیا کرتے تھے..... اس کے سامنے تھوڑی دور پاک ٹی ہاؤس تھا جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ صرف غریب طبقہ کے مصنف اور شاعر حضرات کے لیے مخصوص تھا یا ان کے لیے جن کے لاشعور میں کوئی انقلاب لانے کی آرزو چلتی رہتی تھی ساتھ ہی کچھ فاصلے پر پی سی تھا یہاں پر سب سے امیر طبقے کے شاعر حضرات اور ادیب حضرات کا آنا جانا رہتا تھا یہ وہ لوگ تھے جو شوقیہ شاعری یا ادب کے شعبے سے منسلک تھے کچھ شہرت کے لیے کچھ محض شوقیہ وقت گزاری کے لیے..... یہاں سب کا ذکر نہیں ہو رہا چند ایک کو چھوڑ دو واقعتاً ادب کی خدمت کر رہے تھے اور پیش پیش تھے۔ یہ تینوں عمارتیں طبقاتی فرق کے ساتھ ایک دوسرے کے سامنے کچھ فاصلے پر ایسا وہ تھیں حشمت زیدی تینوں طبقات میں فٹ آتے تھے معاشی لحاظ سے وہ دوسرے نمبر پر آتے تھے مگر ان کے اندر ادب کے لیے کچھ کرنے کا جذبہ اکثر ہی انہیں پاک ٹی ہاؤس کی طرف رخ کرنے پر مجبور کر دیا کرتا تھا کبھی پینے پلانے کے شوق میں یا امراء کی دی گئی دعوت میں وہ بھد شوق وہاں جایا کرتے یوں

معلوم ہوتا جیسے ان کی شایانِ شان جگہ بی سی کے علاوہ اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔

الحرماء آرٹ کونسل میں ہونے والے مشاعروں میں وہ دل کھول کر داد دیا کرتے انہیں مشاعرے میں بھی کچھ نہ کچھ پڑھ کے سنانے کو کہا جاتا کبھی وہ اپنا کالم پڑھ کے سناتے کبھی کوئی افسانہ یا کبھی کسی مشہور ناول کا فراموشی اقتباس وہ کہہ کر پی سی کا جاتے مگر ملتے پاک ٹی ہاؤس میں اکثر ان کے دوست انہیں پاک ٹی ہاؤس میں ڈھونڈنے کے لیے جاتے مگر وہ پی سی یا شیراز سے ملا کرتے وہ ان گنے چنے ادیبوں میں سے تھے جو ان تینوں ریسٹورنٹس میں ہر دلچیز تھے انہیں ہر جگہ خوشدلی سے خوش آمدید کہا جاتا کچھ وہ خود بھی اس قدر ہر دلچیز اور مٹ ہوئی طبیعت کے تھے کہ ہر جگہ با آسانی ایڈجسٹ ہو جایا کرتے اور دلوں میں گھر بنانے کا فن تو انہیں بخوبی آتا تھا۔

پاک ٹی ہاؤس مال روڈ پر واقع ہے جو کہ انارکلی بازار اور نیلا گنبد کے قریب ہے لاہور کے گم گفٹہ چائے خانوں میں سب سے مشہور چائے خانہ پاک ٹی ہاؤس تھا جو ایک ادبی، تہذیبی اور ثقافتی علامت تھا۔ پاک ٹی ہاؤس شاعروں، ادیبوں اور نقاد کا مستقل اڈہ تھا جو ثقافتی اور ادبی لحاظ سے محافل کا انعقاد کرتے تھے پاک ٹی ہاؤس ادیبوں اور شاعروں کا دوسرا گھر تھا اور دیگر کی طرح حشمت زیدی کو بھی اس سے جدائی گوارا نہیں تھی وہ ٹی ہاؤس کے عروج کا زمانہ تھا ان دنوں لاہور میں دو بڑی ادبی تنظیمیں حلقہٴ ارباب ذوق اور انجمن ترقی پسند مصنفین ہوتی تھیں حشمت زیدی انجمن ترقی پسند مصنفین کے سینئر لیڈر ہوا کرتے تھے۔ صبح سے لیکر رات تک ادبی محافل جمی رہتی تھیں اور یہاں پر ملک بھر سے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ان شخصیات سے ملنے کے لیے آیا کرتی تھیں اور اتوار کے دن تو اس قدر رش ہوتا کہ تل دھرنے کو بھی جگہ نہیں ملا کرتی تھی مگر دلوں میں بہت وسیع جگہ تھی جو کوئی آتا اگر اسے بیٹھنے کے لیے کرسی نہ بھی ملتی تو وہ کسی دوست کے ساتھ کرسی شیر کر لیتا تھا یہاں شعر اور ادب بہت بحثیں ہوتی تھیں پاک ٹی ہاؤس میں بیٹھنے والے ادیبوں اور شاعروں میں سوائے چند ایک کے باقی کسی کا بھی مستقل ذریعہ معاش نہیں تھا کسی ادبی رسالے میں کوئی غزل، نظم یا کوئی افسانہ لکھ دیا تو پندرہ، بیس روپے مل جاتے تھے لیکن کبھی بھی کسی کے لب پر تنگی معاشی کا شکوہ کبھی نہیں آیا حشمت زیدی خوش نصیب تھے ان کے پاس ماں اپ کے بنائے تر کے میں دو دکانیں تھیں جن کا کرایہ اچھا خاصہ تھا، اعزازیہ کی رقم وہ پاک ٹی وی ہاؤس میں اپنے دوستوں کو سپر بیٹ چائے اور کیک سگریٹ پلانے میں صرف کر دیا کرتے جس روز ان کے ہاتھ میں اعزازیہ کی رقم آتی اس دن ان کے احباب کی فرمائشی پروگرام شروع ہو جاتے کسی کو قبوہ پینا ہوتا کسی کو چائے کے ساتھ فروٹ کیک کی طلب ہوتی اور کیکٹ سگریٹ تو پھر سبھی کو مرغوب تھی سبھی کو چاہیے ہوتی تھی وہ دل اور ہاتھ کے بے حد کھلے انسان تھے تبھی تو ان کے ہاتھ میں پیسہ ٹک نہیں پاتا تھا احباب میں واہ واہ ہو جایا کرتی اور ان کی گردن مزید تن جاتی ایسا تو کبھی بھی نہیں ہوا کہ کسی دوست کی جیب خالی ہے تو وہ ٹی ہاؤس کی چائے اور سگریٹوں سے محروم رہے جن کے پاس پیسے ہوتے تھے وہ نکال کر میز پر رکھ دیتے تھے جس کی جیب خالی ہوتی علیم الدین (مالک) صاحب اس کے ساتھ بڑی فراخ دلی سے پیش آتے تھے اور یاروں کے یا حشمت زیدہ صاحب تو پھر تھے ہی !.....

سن 1940ء میں ایک سکھ بونا سنگھ نے انڈیائی ہاؤس کے نام سے چائے خانہ شروع کیا۔ بونا سنگھ نے

1940ء سے 1944ء تک اس چائے خانے وہاں کو چلایا مگر اس کا کام کچھ اچھے طریقے سے چل نہیں سکا بوناسنگھ کے چائے خانے پر دوسکھ بھائی سرتج سنگھ بھلا اور کیر سنگھ بھلا جو گورنمنٹ کالج کے اسٹوڈنٹ تھے اپنے دوستوں کے ساتھ اکثر چائے پینے کیلئے آیا کرتے تھے۔ 1940ء میں یہ دونوں بھائی گورنمنٹ کالج سے گریجوایشن کر چکے تھے اور کسی کاروبار کے متعلق سوچ رہے تھے کہ ایک روز چائے خانے پر بیٹھے اس کے مالک بوناسنگھ سے بات چل نکلی اور بوناسنگھ نے یہ چائے خانہ ان کے حوالے کر دیا قیام پاکستان کے بعد حافظ رحیم بخش جالندھر سے ہجرت کر کے لاہور آئے تو انہیں پاک ٹی ہاؤس میں قیام کا موقع ملا۔ اس کے شر پر قیام پاکستان کے بعد انڈیا کاٹ کر پاک لکھ دیا گیا تھا۔ رحیم بخش کو اس میں ایک روپے ماہوار کرائے پر ایک کمرہ رہنے کو ملا تھا ان کا بلا پتلا بدن، دراز قد آنکھوں میں ذہانت کی چمک سادہ لباس کم سن حافظ رحیم بخش کی شخصیت کو دیکھ کر دی ولکھنؤ کے قدیم وضع دار بزرگوں کی یاد تازہ ہو جاتی سرتج سنگھ بھلا اور کیر سنگھ بھلا کے بعد حافظ رحیم بخش کے دونوں بیٹوں علیم الدین اور سراج الدین نے بعد میں پاک ٹی ہاؤس کی گدی سنبھالی تھی۔

پاک ٹی ہاؤس کا ماحول بہت دلکش تھا نائیلون والا چمکیلا فرش جو کہ کڑی محنت و مگرانی کے باعث ہمہ وقت چمکتا دمکتا رہتا تھا وسیع و عریض ہال میں پتھری چوکور سفید میز بنی تھیں۔ دیواروں پر مگی قائد اعظم کی تصاویر..... ایک طرف گیلری کو سیڑھیاں جاتی تھیں اور بازار کے رخ پر لمبی کھڑکیاں نصب تھیں جنہیں گرمی کے دنوں میں شام کو کھول دیا جاتا تھا۔ باہر لگے درختوں کی ٹھنڈی مسرت آمیز اور فرحت بخش ہوا اندر بیٹھے لوگوں کو مسحور کر دیا کرتی دو پہر کو جب دھوپ ان کھڑکیوں کے اوپر پڑتی تو گلابی روشنی سفید پتھری چوکور میزوں پر چھن چھن کر پڑتی۔ پاک ٹی ہاؤس کے اندر کونے والے کاؤنٹر پر علیم الدین صاحب کا مسکراتا ہوا سانولا چہرہ ابھرتا..... ان کے پیچھے دھیمے سروں میں ریڈیو ہمہ وقت بج رہا ہوتا اور وہ کلاسک غزلوں پر ہنستے بڑے مگن انداز میں بل کاٹنے ان کی دھیمی اور ٹھٹھٹھ مسکراہٹ ان کے سانولے چہرے کو عجیب طرح کی جلا بخشی تھی ان کے چمکیلے ہموار دانت موتیوں کی طرح سے چمکتے ان کی شخصیت میں سحر بھر دیا کرتی..... پاک ٹی ہاؤس کی فضا میں سگریٹ اور سگار کا دھواں چکراتا پھرتا..... سنہری چائے، قہوہ اور فروٹ کییک کی خوشبو اندر داخل ہونے والوں کو بھانے لگتی صبح آٹھ بجے پاک ٹی ہاؤس میں کم کم لوگ آتے تھے شمت زیدی سگریٹ کو انگلیوں میں دبائے سگریٹ والا ہاتھ منہ کے ذرا قریب رکھے ٹی ہاؤس میں داخل ہوتے تھے یہ ان کا روزانہ کا معمول تھا اور مشہور و معروف انداز تھا کہ نوجوانوں نے ان کے اس انداز کو ان کی نقل کرتے اپنایا تھا چونکہ صبح کے وقت ہجوم ذرا کم ہوتا اسی لیے کم دودھ والی تیز پتی کی چائے کا کپ ہاتھ میں تھام کر وہ اپنا تخلیقی کام کرنے میں مگن ہو جایا کرتے۔ پاک ٹی ہاؤس میں جب داخل ہوتے تو دائیں جانب شیشے کی دیوار کے ساتھ ایک صوفہ لگا ہوا تھا سامنے ایک لمبی میز تھی میز کی تینوں جانب کرسیاں تھیں شام کی وقت ناصر کاظمی، انتظار حسین، باقر رضوی، احمد مشتاق، مبارک احمد جیسی بڑی ادبی شخصیات کی محفل اسی جگہ جما کرتی تھی مگر صبح کے وقت زیدی صاحب اپنا کاغذ قدم سنبھالے وہاں بیٹھے دکھائی دیا کرتے تھے اپنا تخلیقی کام وہ وہیں بیٹھ کر انجام دیا کرتے تھے..... ایسے میں وقفے وقفے سے انہیں چائے کی طلب ہو کرتی وہ کاغذوں کے پلندے سے سر اٹھاتے اور ذرا کی ذرا علیم الدین کی جانب نگاہ بلند کرتے وہ تو جیسے ان کی نگاہ کے منتظر ہوا کرتے فوراً سے پیشتر ان کے لیے چائے لے

آتے ٹی ہاؤس میں اسپرٹ چائے پیش کی جاتی تھی لیکن علیم الدین کو اپنے پرانے اور مستقل گاہکوں کی پسند ناپسند گویا ازبر تھی وہ فوری طور پر ان کے لیے تیرتھوے والے الگ تیار کر کے لے آیا کرتے..... زیدی صاحب ایک خوش شکل طویل قامت اور مضبوط ذیل ڈول رکھنے والے انسان تھے ٹراؤزر پینٹ کے ساتھ بڑے کالر والی شرٹ آنکھوں پر رنگین بڑے فریم کا چشمہ لگائے وہ اس زمانے کے بہرہ نگار تھے..... جب سے ان کی تصویر شائع ہوئی تھی اتوار کے روز اس ناول نگاری کے اسرار و رموز سمجھانے کے حوالے سے جو محفل وہ سجایا کرتے اس میں اضافہ ہو گیا..... آٹو گراف لینے والی لڑکیوں کا جمگھٹا انہیں اس روز گھیرے رکھتا پاک ٹی ہاؤس کے کاؤنٹر پر رکھا ایس ٹی ڈی فون جو کبھی کبھار بچتا تھا اب کثرت سے بچنے لگا تھا مگر زیدی صاحب اس سب سے بے نیاز اپنے کام میں مگن رہتے یہاں تک کہ علیم الدین کو گلا کھنکھار کے کہنا پڑتا۔

”حضور..... آپ کے لیے فون ہے انبالے سے“

”کہہ دو کہ میں باہر ہوں، وہ مسودے سے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر کہہ دیتے علم الدین کا سانولا چہرہ شرارت کی سرفی سے دیکھنے لگتا“

”کہہ چکے ہیں حضور..... مگر محترمہ بعقد ہیں کہ آپ ادھر ہی تشریف فرما ہیں..... وہ ریسور پر ہاتھ رکھے سرگوشیا نہ انداز میں بے چارگی سے جواب دیا کرتے لامحالی انہیں اٹھ کے ٹیلی فون سیٹ کے قریب آنا پڑتا دوسری جانب منتظر محترمہ کی بے ربط پر جوش آواز انداز میں کی جانے والی مدح سرائی سننے کے بعد وہ اکثر علیم الدین کو تنبیہ کرنا نہ بھولتے

”حکرتوں سے باز آجائے محترم..... ہماری مخبری مت کیا کیجیے“ وہ شگفتہ سے انداز میں کہتے انہیں جیسے متنبہ کرنے کی کوشش کرتے جواباً وہ کان پکڑ لیتے۔

”ہماری ایسی کیا مجال حضور..... آپ کے چاہنے والے ہمیں جواباً ڈانٹ ہی ایسی پلاتے ہیں کہ آپ کو بلانے کے سوا ہمارے پاس چارہ ہی کوئی نہیں بچتا..... وہ سانولے چہرے کو اور لٹکا کے گویا ایسی بے بسی کا اظہار کرتے زیدی صاحب بس ہنکارا بھر کر خاموش ہو جاتے پنل لبوں میں داب لیتے“

”سگریٹ پیئیں گے حضور.....“ وہ سگریٹ کی ڈبیال ان کے پاس لے آتے۔

”نہیں سگریٹ رہنے دیجیے سگاری طلب محسوس ہو رہی ہے ہمیں“ وہ فوراً سگار سلگلاتے زیدی صاحب ایک لمبا کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑ دیتے..... علم الدین پاس ہی ٹک جایا کرتے چہرے پر سنجیدگی کی گہری چھاپ پڑی ہوتی مگر آنکھوں میں شرارت رقصاں رہتی تھی۔

”آپ نے جھوٹ کیوں بولا کہ فون انبالے سے تھا علیم الدین صاحب! زیدی صاحب ایک نظر علیم الدین کے بظاہر سنجیدگی کے مظہر چہرے کو دیکھ کر سگاری راکھ جھاڑتے تو استفسار کرتے“

”آپ لکھنے میں حد درجہ مصروف تھے اور فون والی محترمہ ہمیں ڈانٹے جا رہی تھیں تنگ آ کر ہمیں یہ جھوٹ بولنا پڑا آپ سے.....“ ان کے چہرے پر شرمندگی نہیں ہوتی بے چارگی ہوا کرتی۔

”یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہمیں آپ کے جھوٹ کی خبر ہو جائے گی پھر بھی..... آپ نے جھوٹ بولا..... علیم الدین صاحب ابھی ہم اتنے معروف نہیں ہوئے کہ بھارت سے فون آنے لگیں“ وہ اس کی کبھی بات دہراتے تنبیہ کرتے

”انشاء اللہ وہ دن دور نہیں حضور جب بھارت کیا پوری دنیا سے آپ کے لیے فون آیا کریں گے“ ان کے لہجے میں یقین ہوتا زیدی صاحب خاموش ہو جایا کرتے کبھی کبھی مسکرا بھی دیا کرتے۔

”حضور..... ایک بات کہیں اگر برانہ مانیں تو.....“

”کیسے محترم ایک آپ ہی تو ہیں جو ہماری ذاتی زندگی میں دلچسپی رکھتے ہیں ہمارے لیے پریشان ہوتے ہیں..... ورنہ کون ہے جو ہمارے لیے اس قدر سوچے“ ان کے لہجے میں حسرتوں کی چنگاریاں سلگنے لگ گئیں۔

”اسی لیے تو کہتے ہیں حضور کی شادی کر لیجیے..... آپ کی تنہائی بڑے گی تو پریشان کن سوچیں آپ کو مضطرب نہیں ہونے دیں گی“ وہ ہمیشہ کا کہا مشورہ دہراتے۔

”سوچیں گے فی الحال تو فرصت نہیں اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا“ وہ ہولے سے گنگناتے۔

”آپ کو فرصت ہی فرصت ہے حضور..... آپ کے لیے راوی چین کی ہنسی بجاتا ہے آپ کو فکر معاش کا غم نہیں ستاتا اوروں کی طرح“

”یہاں مسئلہ فکر معاش کا نہیں راوی ہونے کا ہے علیم الدین صاحب..... وہ ہمیشہ ہی ہر ایک کو بہت عزت و احترام کے ساتھ مخاطب کیا کرتے تھے۔ راوی ہونے کے ناطے ہمیں فرصت ہی نہیں اپنے لیے سوچنے کی نفسا نفسی کے اس دور میں جہاں اقدار کا خون نہایت سفاکی اور بے دردی سے ہو رہا ہے ہمیں چین کہاں سے ملے گا۔ انہوں نے مضطرب سے انداز میں کہہ کے سگار کی راکھ جھاڑی ان کے چہرے پر اس راکھ جیسی جلتی بجھتی کیفیت تھی جو ان کے اندر کے غم کو عیاں کر رہی تھی اور جسے انہوں نے چھپانے کی کوشش بھی نہیں کی تھی علیم الدین بس ان کی شکل دیکھ کر رہ گئے اس سے آگے وہ کبھی پوچھ ہی نہیں پاتے اپنی شخصیت کے سارے روز یہاں پر آ کر وہ ہمیشہ کی طرح فضل آلود کر لیا کرتے تھے..... انداز یکسر اجنبیت میں بدل جایا کرتا تھا..... بلکہ وہ اجنبی ہی بن جاتے جسے کبھی کوئی جان نہیں پایا تھا“

☆☆☆

Till death do us part..... والسن کی پرسوز دھن پر اس نے اپنے قدموں کو ہمیشہ کی طرح منجھد ہوتا محسوس کیا تھا وہ اکثر و بیشتر اس جگہ آ کر ٹھہر جایا کرتی تھی والسن کی پرسوز دھن اور پھر ایسی باکمال شاعری وہ کبھی نہیں فیصلہ کر پاتی کہ اسے روکنے اور ٹھہرنے پر کیا چیز مجبور کرتی ہے..... وہ چند قدموں کا درمیانی فاصلہ عبور کرتے اس تک پہنچ آئی جو ہجوم میں گھرا ہوا تھا مگر آنکھوں موندے ان کی موجودگی سے بے نیاز وہ والسن کے بکھرتے سروں میں اپنی دنیا میں تم تھا اس نے اس کی آنکھیں کبھی کھلی نہیں دیکھیں مگر پھر بھی اس کا ان آنکھوں کے بارے میں یہ قوی خیال تھا کہ اس کی آنکھیں بہت سحر انگیز ہیں اس کے لرزیدہ پونے والسن کے سروں کے ساتھ ہولے ہولے ٹھرتے تھے وہ ان پلکوں کی لرزیدہ جنبش پہ

نگاہ پڑتے تھم جاتی..... وہ ان کے کالج کا سب سے حسین اور ہونہار سنوڈنٹ نہیں تھا وہ کسی بگڑی ہوئی برگر فمیلی کا خرد بھی معلوم نہیں ہوتا تھا نہ ہی اس کی سوچ اور افعال اسے انقلابی اور افعال اسے انقلابی ذہنیت رکھنے والا جوشیلا نوجوان ظاہر کرتے تھے مگر اس کے والکن کے بکھرتے سر اس کے اندر کے اضطراب کو عیاں کر دیا کرتے تھے۔ وہ کیمپس میں نیا آیا تھا مگر اس سے سینئر تھا..... وہ سفید یونیفارم میں کاندھے پر لمبی امیر لیس والا بیگ ڈالے بالوں کی اونچی پونی بنائے اس کے سامنے ساکت کھڑی تھی روز ہی کھڑی ہوتی اس کا دل چاہتا وہ یونہی ساری زندگی والکن بجاتا رہے اور وہ دم سادھے کھڑی سنتی رہے۔

اس قدر خوبصورت نظم و انضباط لائن بینڈ نے بھی نہیں گائی ہوگی جتنی دل آویز وہ اس کے والکن پر محسوس ہو رہی تھی جس دن اس نے پہلی بار اس نظم کو سنا تھا اسی دن سے وہ اس نظم میں قید ہو کے رہ گئی تھی اس نے گھر آ کے ابامیاں کی اسٹڈی کھنگال کے تمام مغربی شاعروں کے شاعری کی مجموعے کھنگالے تھے ابامیاں کو ادب سے عشق تھا مغربی و مشرقی کلاسیک ادب کی ان کے پاس ایک بڑی کلیکشن موجود تھی۔ اس نے وائٹ لائن بینڈ کی اس نظم جو گانے کی سورت گائی گئی تھی کو اس روز ڈھونڈ کے کوئی سومرتہ پڑھا تھا..... وہ اس گانے کو پہلے بھی کتنی ہی مرتبہ سن چکی تھی مگر آج سے پہلے وہ اس کے لیے صرف ایک رومینگ ساگ تھا مگر اس روز اس نے اس میں زندگی کو سانس لیتا محسوس کیا تھا..... اس نے اس گانا کا حرف حرف یاد کیا تھا ہر بار وہ اپنے والکن پر اس طویل گانے کا ایک حصہ بجایا کرتا تھا بعد ازاں وہ اس قدر پختہ ہو گئی کہ والکن کے ردھم اور ساز سے پہچان جایا کرتی کہ آج وہ گانے کا کون سا اور کتنا حصہ بجا رہا ہے بلاشبہ وہ اس کے ان چاہنے والوں میں سے تھے جو روزانہ صرف اس کا والکن سننے کے لیے اپنا پوائنٹ مس کر دیا کرتے تھے ہرگز رتا دن اس کے ارد گرد جہوم میں اضافہ کرتا گیا مگر وہ شاید اس سب سے بے نیاز تھا تبھی تو دھن مکمل ہوتے ہی اپنا بیگ کاندھے پر ڈالتا والکن کو ایک بیگ میں بند کرتا اور بغیر کسی کانوٹس لیے آگے بڑھ جاتا..... جہوم میں اس کے بارے میں چہ گوئیاں ہونے لگتیں مگر اس کے جانے کے بعد وہ بھی وہاں رکتی نہیں تھی نہ جہوم کا حصہ بنتی نہ ہی گفتگو میں شامل ہوتی اس کے ارد گرد خاموشی اور ویرانی ذریعہ ڈال لیتی..... وہ اس کے قدموں کے نشان پر اپنے قدم رکھتے واپس پلٹ جاتی..... اور اپنی اس حرکت سے وہ خود بھی بے خبر تھی۔



بازار کے رخ پر لگی شیشے دار لمبی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں گرمیوں کی ایک سرمی شام تھی وہ اپنا کاغذ قلم تھامے کھڑکی کے قریب رکھے صوفے پر آ کے بیٹھ گئے تھے۔ انہوں نے لان کا سفید رنگ کا کرتا شلوار پہن رکھا تھا گھنے بالوں کو پیچھے کی طرف کر کے کشادہ پیشانی واضح کر رکھی تھی ان کی گندمی رنگت گرمیوں میں کچھ اور نکھر جایا کرتی..... سفیدی مائل گندمی رنگت پہ پسینہ میرے کی کپوں کی مانند چمکتا دکھائی دے رہا تھا۔ بلاشبہ وہ ایک وجیہ شخصیت کے حامل تھے اور اپنی اس خوبی سے بے نیاز وہ بس ادب تخلیق کرنے میں مگن تھے۔

”چائے پیس گے حضور.....“ علیم الدین نے انہیں بازار کی جانب نگاہ مرکز کیے دیکھا تو پوچھے بنا رہا نہیں پائے

..... وہ کافی دیر سے لکھنا چھوڑے بازار میں چلتے پھرتے لوگوں کی طرف متوجہ تھے یوں جیسے وہ کسی گہرے خیال میں ہوں۔
”حضور، علیم الدین ان کے پاس آ کر ہولے سے کھٹکھارے تو وہ متوجہ ہوئے۔“

”چائے“ انہوں نے کی لفظی سوال کیا مگر انہوں نے انکار کر دیا تھا۔

”نہیں محترم..... پہلے ہی اندر آگ کاالاؤدھک رہا ہے مزید تباہی کا سامان کیوں کر کیا جائے..... انہوں نے

نگاہیں اٹھا کر ان کی طرف لحظہ بھر کو دیکھا ان کی آنکھیں لالہ ڈوروں سے دھک رہی تھیں۔ وہ ان کی کیفیت پر لمحہ بھر کو چپ رہ گئے..... نجانے ان کے اندر کیا غم پل رہا تھا جو وہ اس قدر مضطرب و پریشان ہو جایا کرتے تھے وہ ہمیشہ کی طرح پوچھ پائے نہیں ہی وہ خود بتا پائے ابھی ابھی انہوں نے بازار میں ایک عورت اور اس کے بچے کو دیکھا تھا وہ بچہ چلتے چلتے گر گیا تھا اس کی ماں نے اسے لپک کر اٹھایا تھا وہ روتے ہوئے بچے کو بے تابی سے چوم رہی تھی اگر بھیڑ میں اس بچے کا ہاتھ اپنی ماں کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا اور وہ اس سے بچھڑ جاتا تو..... اس ”تو“ اور ”اگر“ کا خوف ماں کی ممتاز بھرے چہرے سے ہو دیا تھا بچہ ماں کی آغوش میں سہم کر دبا ہوا تھا انہیں اس ماں کی آغوش میں دیکھے ہوئے بچے میں اپنا آپ نظر آیا، کالی سیاہ گھنگور راتیں ان کے ذہن کے پردے پر روشن ہو گئیں جو وہ برسات کے موسم میں ڈرے سہم اکیلے گزارا کرتے تھے اور اس وقت تک ان کی والدہ کام سے واپس نہیں لوٹا کرتی تھیں وہ جب وہ ماہ کے تھے تبھی ان کی بد قسمتی کہ ان کے والد کی حادثاتی موت ہو گئی تھی وہ مزدور پیشہ آدمی تھے بلڈنگز میں ساتھی راج گیر کے طور پر کام کیا کرتے تھے ایک روز تیسری منزل تک گارے اور اینٹیں پہنچاتے وقت سیڑھیوں سے ان کا پاؤں پھسل گیا تھا اینٹوں کا بھرا تسلا ان کے سر پر گرا تھا وہ تیسری منزل سے گرے تھے اس زمانے میں لیول پول وغیرہ کی سہولیات میسر نہیں ہوا کرتی تھیں وہ بڑی شدت سے تیسری منزل سے گرے تھے اور ان کے سر پر شدید اور گہری چھوٹ آئی تھی بے تحاشہ خون بہنے اور بروقت طبی امداد نہ ملنے کی وجہ سے ان کی فوری موت واقع ہو گئی تھی گھر میں جمع جتنا تو کچھ تھا نہیں..... مگر پانی پیٹ کی آگ بجھانے کیلئے ان کی والدہ کو گھر سے باہر نکلنا پڑا تھا ان کے علاوہ ان کا ایک بھائی اور تھا جو ان سے بڑا تھا تاہم اتنا بڑا نہیں کہ ماں کو گھر بٹھا کے خود کما کر باپ کی کمی پوری کرنے کو ان کا شجر سایہ دار بن پاتا..... انہیں بچپن میں وہ توجہ و محبت نہیں مل سکی جو ایک بچے کو ماں سے چاہیے ہوتی ہے باپ تقدیر نے چھین لیا اور ماں کو ظالم دنیا کی سفاکی نے..... وہ سارا دن اپنے بڑے بھائی کے پاس رہا کرتے ان کی والدہ دن بھر مختلف قسم کے کئی کام کیا کرتی تھیں مگر پھر بھی ذریعہ معاش کا آمدنی انھنی خرچہ روپیہ والا حساب ہی رہ جایا کرتا ماں کی عدم دلچسپی و توجہ اور تنگدستی نے انہیں حد درجہ خود سوارضدی بنا دیا تھا کچھ فطرتاً وہ ٹیلے مزاج کے تھے مزاج جلدی برہم ہو جایا کرتا اور اس برہمی نے گزرتے وقت کے ساتھ حساسیت بخشی تھی اور ایک اور چیز بھی تھی جو ان کے اندر کوٹ کوٹ کے بھری تھی اور ان کی شخصیت کا تضاد دیکھنے والوں کو محسوس تو نہیں ہوتا تھا مگر..... اسی چیز نے انہیں تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا تھا“



خالق زیدی نے اس مرتبہ رمضان کے سارے روزے رکھے تھے..... وہ فطرتاً بہت نیک اور صابر بچہ تھا بہت

چھوٹی سی عمر میں اس نے ماں کی مجبوریاں سمجھتے ہوئے ان کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا تھا اسی لیے ماں کو بھی اس کا بہت خیال

رہتا تھا اور پھر اس قدر گرمی اور تنگدستی میں اس نے اکثر ہی خالی پیٹ روزے کی نیت باندھ کے بھی سارا دن روزہ بھایا تھا خالدہ بیگم کو اپنے بیٹے پر جتنا بھی فخر ہوتا کم تھا..... بجلی ابھی ان کے علاقے میں نہیں آئی تھی اور گرمی کے روز نہایت صبر آزما تھے وہ اکثر ہی شام کو اس کے لیے کچھ نہ کچھ ٹھنڈا لے آیا کرتی تھیں وہ ایک دکان پر سیل گرل کے طور پر کام کرتی تھیں روزانہ پیدل چل چل کے گھر گھر جا کے سرف اور دوسری گھریلو اشیاء بیچنے کے بعد وہ بس اتنا ہی کرسکتیں کہ مغرب سے پہلے گھر لوٹتے وقت وہ ایک گلاس ربڑی دودھ یا کوئی تربوز ہی خرید لاتی تیں..... اور وہ اکثر ہی ایسا کرتی بھی تھیں مگر پہلے ہی دن خالق کے لیے ربڑی دودھ کا گلاس لاتے انہیں اندازہ نہیں تھا کہ انہیں اس جرم کا جواہدہ اپنے دس سالہ چھوٹے بیٹے کے سامنے ہونا پڑے گا۔

”تو میرے لیے دودھ کیوں نہیں لائی ماں..... کیا میں تیری اولاد نہیں ہوں کیا، کرخت وغصیلے لہجے میں چیختا وہ اپنے اس سوال سے ماں کو ساکت کر گیا تھا..... وہ ان سے کس انداز میں بات کر رہا تھا۔“

”یا خالق تیرا زیادہ لاڈلا اور سگا ہے مجھے کیا کوڑے کے ڈھیر سے اٹھالائی تھی، وہ بہت چھوٹی سے عمر میں بہت بڑے سوال پوچھ رہا تھا اور وہ خود سادہ لوح خاتون تھیں انہیں اندازہ نہیں تھا ان کا بیٹا کس قدر حساس اور جینٹل ہے۔“

”تو میرے سے زیادہ خالق سے پیار کرتی ہے تبھی تو اس کے لیے اکثر چھپا چھپا کے چیزیں لاتی ہے..... میں تیرا کچھ نہیں لگتا، اتنا کہہ کے وہ زور زور سے رونے لگا تھا سادہ لوح ماں حیرت میں گھری رہی جواب نہیں دے پائی ورنہ پوچھتی تو سہی کہ کوئی چیزیں وہ کب لاتی رہی ہے ایسا امتیازی سلوک کرنے کی وہ کب گنہگار بھری تھی ان کو تو فکر غم معاش نے اتنا جین لینے ہی نہ دیا تھا کہ وہ جان پاتیں کہ ان کا بیٹا ان سے کس قدر متفر ہو چکا ہے۔“

”حاشو..... مت رو حاشو..... خالق فوراً سے پیشتر اٹھ کے اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔“

”تم یہ دودھ پی لو حاشو..... میں نہیں پی رہا“ اس نے پیتل کا گلاس اس کے ہاتھ میں تھما دیا تھا مگر اس نے دودھ کے گلاس کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔

”میں تمہارا حق نہیں لوں گا بھیا..... اگر ماں کو مجھ سے پیار ہوتا تو وہ میرے لیے علیحدہ سے لے کر آتیں..... اسی اثناء میں مغرب کی اذانیں ہونے لگی تھیں خالق نے بسم اللہ پڑھ کے نمک کی چٹکی اور پانی کے ساتھ روزہ افطار کیا تھا اس نے دودھ اپنے بھائی کیلئے رکھ دیا تھا مگر اس نے بھی اس دودھ کو نہیں پیا تھا۔“

”حاشو..... میری جان“ خالدہ بیگم بہت دیر ساکت رہنے کے بعد اس کے پاس آئی تھیں انہوں نے محبت سے اس کے بال سہلانے کی کوشش کی تھی مگر اس نے ان کے ہاتھ جھٹک دیے تھے یہ اس کی ناراضگی کا اظہار تھا اور خالدہ بیگم جانتی تھیں وہ اگر ایک بار ناراض ہو جاتا تو بڑی مشکل سے مانتا تھا وہ بہت ضدی تھا۔

”حاشو بیٹا“ انہوں نے پھر پکارا تھا مگر اب کی بار اس نے ماں کا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔

”میں تیرا بیٹا نہیں ہوں..... خالق تیرا بیٹا ہے، وہ روٹھے پن سے بول رہا تھا رو رو کے اس کی آنکھیں متورم ہو گئی تھیں“ ابازندہ تھا تب بھی اسی کے لاڈ اٹھائے جاتے تھے وہ مر گیا تو بھی اسی کے لاڈ اٹھا رہی ہے تو..... مجھے بتا مجھے

کیوں پیدا کیا پھر..... وہ کیسے کیسے حساب مانگ رہا تھا ان سے..... وہ اپنے اس بھائی سے تقابل کر رہا تھا جس نے چھوٹی سی عمر میں اسے ماں بن کے پالا تھا اپنے حصے کی چیز ہمیشہ اسے کھانے کو دی تھی اور آج ہی ماں اس کے لیے الگ سے افطاری کا سامان لائی اور اس سے برداشت نہیں ہو پایا، وہ کتنا تنگ دل اور تنگ نظر تھا۔

اس ساری رات وہ جاگتا رہا ماں کافی دیر اسے چکارتی رہی مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ ماں کے سامنے آنکھیں موند کے سوتا بن گیا مگر لاشعوری طور پر ساری رات جاگا اور کڑھتا رہا..... احساس کمتری اسے کوڑے مارتی رہی..... اس کی ماں اس سے نہیں اس کے بھائی سے پیار کرتی ہے وہ اس کے لیے نہیں اس کے بڑے بھائی کے لیے چیزیں لاتا ہے اور بڑا بھائی محبت سے نہیں رحم سے اپنے حصے کی چیز اسے دے دیتا ہے..... اس کا باپ مر گیا اس کی بد قسمتی..... ورنہ وہ بھی لاڈلا ہوتا اپنے باپ کا..... وہ بھی اپنے باپ سے فرمائش کیا کرتا جیسے قالو (محلے کا دوست) اپنے باپ سے کیا کرتا تھا روزانہ اس کے کام پر جاتے تھے..... وہ کتنے فخر اور یقین سے اسے بتایا کرتا تھا کہ آج ابا میرے لیے میری پسند کی گیند خرید کر لائیں گے پھر وہ اس کے ساتھ گیند بیٹ کھیلا کرے گا..... اسی شام اس کے لیے گیند بیٹ آ جاتا..... حاشو کے دل میں حسرت سر ابھارنے لگتی اس نے بھی اماں سے اپنے لیے گیند بلالانے کو کہا..... اس نے اس روز شام تک دروازے کے چکر کاٹ کاٹ کر ماں کی واپسی کا انتظار کیا مگر ماں واپس ضرور آئی مگر خالی ہاتھ.....

”تو میرے لیے گیند نہیں لائی اماں؟“ حیرت و دکھ کی زیادتی کے باعث اس کی آواز پھٹ سی گئی تھی ماں دن بھر کی تھکی ہاری اپنی دھن میں بولی تھی اس نے بیٹے کا تاریک پڑتا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔

”آج پیسے نہیں ملے حاشو..... صبح کا وعدہ کیا ہے صاحب نے وہ کمپنی کے مالک کو صاحب کہا کرتی تھیں“

”صبح لازمی لے آؤں گی تیرے لیے گیند بلا.....“ مگر وہ ان کی بات کو نہیں سمجھا اسے بس یہ سمجھ میں آیا کہ اس کی ماں جان بوجھ کر اس کے لیے نہیں لائی اگر خالق کہتا تو وہ اس کے لیے لازمی لے کر آتیں اس وقت تو وہ خاموش ہو گیا مگر شام کو جب گھر سے باہر کھیلنے گیا تو قالو نے اس کے ہاتھ میں گیند بلاندیکھ کر خوب مذاق اڑایا تھا وہ اسے خالی ہاتھ دیکھ کر پیٹ پر ہاتھ رکھ کر خوب ہنسا تھا۔

”ہنس کیوں رہے ہو.....“ وہ اس کے پاس جا کے ڈھٹائی سے قدرے سخت لہجے میں بولا تھا جواباً وہ اور بھی زور

سے ہنسا تھا۔

”تمہارا بیٹ اور بلا تو بہت پیارا ہے حاشو.....“ وہ اس پر طنز کر رہا تھا حاشو کے جڑے بھینچ گئے۔

”صبح میرا گیند اور بلا آ جائے گا اماں نے وعدہ کیا ہے.....“ اس کے لہجے میں واضح شکستگی تھی۔

”اور وہ صبح کبھی نہیں آئے گی بابا..... پچھلی مرتبہ بھی تو نے کہا تھا کہ فٹ بال صبح آ جائے گا میں اس کے ساتھ

کے تین منگوا کے کھیل چکا ہوں اس آس پہ کہ تمہارا آئے گا تو تو بھی مجھے کھلائے گا مگر..... مان لے حاشو تیری ماں تیرے

سے پیار نہیں کرتی اور تو میری چیزوں سے ہی کھیلا کرے گا،“ قالو کے لہجے میں اپنے کھلونوں کے حوالے سے تکبر اور مان تھا

کچھ غلط بھی نہیں تھا، اپنے محلے کے سبھی ساتھ کے لڑکوں میں سب سے زیادہ کھلونے اسی کے پاس ہوتے تھے اور فرمائش

بھی زیادہ اسی کی پوری کی جاتی تھیں سواں لحاظ سے اس کا اترا نہ تھا۔

”یہی بات اگر خالق کہتا تو اسے خالہ ضرور دلا دیتی..... اس کے پاس تو ہمیشہ ہی کھلونے رہتے ہیں اس کے پاس تو لکڑی والا بڑا بیٹ ہے اسے بھی تو خالہ نے ہی لاکے دیا تھا.....“ قالو کا اتنا ہی کہنا تھا اس کا دکھ پھر سے تازہ ہو گیا ویسے بھی اس کا شمار ان بچوں میں ہوتا تھا جو دوسروں کے کہے میں جلدی آنے والے ہوتے ہیں اپنی عقل اور سمجھ بوجھ جن کے پاس ہوتی تو ہے مگر وہ اسے استعمال کرنا گناہ سمجھتے ہیں وہ غصے سے پھر کر گھر پہنچا رات کا کھانا بھی نہیں کھایا ماں کا دکھی دل مزید دکھی ہو گیا..... وہ کل سے ان سے ناراض تھا بات چیت مکمل طور پر بند کر رکھی تھی خالق سے وہ پھر بھی بات کر لیتا تھا کیونکہ ماں کی بجائے وہ اس سے ہی زیادہ ہلا ہوا تھا بلکہ باپ کی وفات کے بعد اسے تو ماں کی آغوش نصیب ہی نہیں ہوئی تھی خالق ہی تھا جس نے اسے ماں اور باپ بن کے پالا تھا وہ اس کی بات مان جایا کرتا تھا مگر اب کی بار اس نے خالق کی بات بھی نہیں مانی تھی جب وہ اس کے لیے کھانا لے کر آیا تھا۔ وہ بہت زیادہ حساس بچہ تھا، ضد اور ہٹ دھرمی اس میں کوٹ کوٹ کے بھری تھی اس کے اندر احساس کمتری کا خود رو پودا نمو پار ہا تھا اور کسی کو خبر نہیں ہو رہی تھی اور جب خبر ہوئی اس وقت تک صرف پچھتاوے ہی تھے جو ان کے دامن سے لپٹ گئے تھے۔

”حاشو..... کیا ابھی تک ناراض ہے یا.....“ اٹھارہ سالہ خالق ہاتھ میں پلاسٹک کی چٹکیر میں تھی سے سنی چنپاتی اور دال کی کنوری رکھی تھی پاس آ کر محبت سے بولا تھا۔ وہ جو آنکھیں موندے بازو آنکھوں پر رکھے بظاہر سوراہا تھا خالق کے استفسار پر بس لمحہ بھر کے لیے آنکھوں سے بازو ہٹا کر دیکھا۔

”بھائی..... مجھے کھانا نہیں کھانا“ اس نے سوال کا جواب نہیں دیا تھا بس اپنی بات ان تک پہنچادی تھی اور بازو پھر سے آنکھوں پر رکھ کر اجنبی بن گیا تھا۔

”کھانے سے کیسی ناراضگی حاشو..... رزق کی ناقدری نہیں کرتے اللہ گناہ دیتا ہے“ وہ عمر رسیدہ بان والی چھلنگا چار پائی پر اس کے پاس بیٹھ کر اس کے بازو کو آنکھوں سے ہٹاتے فہم و تفہیم سے اسے سمجھا رہا تھا۔

”مجھے اس وقت کچھ نہیں سننا..... مجھے نیند آ رہی ہے مجھے سونا ہے“ وہ کروٹ کے بل لیٹ گیا تھا۔

”حاشو..... میری جان میری طرف دیکھو بیٹا“ خالق نے اسے پیار سے چمکارتے ہوئے کہا تھا وہ عمر میں اس سے آٹھ برس بڑا تھا لیکن اسے اکثر بیٹا کہا کرتا وہ اس کے لیے ایک بچہ ہی تھا ذمہ داری نہیں جسے وہ بیک وقت سکول کی پڑھائی کے ساتھ بھار ہا تھا وہ خود بچپن سے ہی بہت سمجھدار بچہ تھا بن کہے ہی اس نے اپنی ماں کے دکھ اور کام ہاٹ لیے تھے..... اس نے گھر کے ساتھ بھائی کی پرورش کی ذمہ داری اپنے سر پر ڈال لی تھی۔ اس نے اپنی خواہشات کو اپنے دل کے قبرستان میں دفن کر لیا تھا کیونکہ اس کا بھائی بہت چھوٹا تھا اور اکثر بیمار رہتا تھا اسی لیے اسے ماں کا احساس ہوتا تھا وہ اتنا کماتی نہیں تھی جتنا ان کا خرچ ہو جاتا تھا سو دھنطا ہو گیا تھا وہ اسکول نہیں جاتا تھا گھر پر ہی تھوڑا بہت یاد رے کے مولوی صاحب سے سبق پڑھ کر تھوڑا پڑھنا لکھنا سیکھ رہا تھا اس کے سکول نہ جانے سے اس کی کتابوں اور فیس کا خرچہ چنچ گیا اس نے ماں سے کبھی کوئی فرمائش نہیں کی مگر ماں تو ماں تھی اسے خبر ہو جایا کرتی تھی کبھی کبھار عید وغیرہ پر بونس ملنے پر یا کبھی زیادہ

جیزیں بیچنے پر اسے اضافی رقم ملتی تو وہ اکثر ہی اپنے بچوں کے لیے کھلونے یا کھانے پینے کی اشیاء لے آیا کرتی تھی وہ ان کو سنبھال کر سینت سینت کر رکھتا کہ بڑا ہونے پر حاشوان سے کھلیا کرے گا ماں کو دوبارہ پیسے خرچ نہیں کرنا پڑیں گے اسی لیے وقتاً فوقتاً آنے جانے والے کھلونے اس کے پاس اچھی خاصی تعداد میں جمع ہو گئے تھے جو حاشو کے دوسرے ہی روز یا تو گم ہو جاتے یا وہ خود توڑ دیا کرتا تھا اور انہی کھلونوں کو دیکھ کر حاشو سمیت باقی سب کو بھی یہی لگتا تھا کہ اس کی ماں خالق کی ہر ضرورت اور خواہش بن کہے پوری کر دیتی تھی حقیقت میں وہ بہت صابر بچہ تھا اور صبر کرنے والے لوگ اللہ کو عزیز ہوتے ہیں وہ ان کی خودی کا بھرم و درکھتا ہے وہ ان کی خواہشوں کا احترام خود کرتا ہے۔

”حاشو..... دیکھ اگر تو کھانا نہیں کھائے گا تو میں بھی نہیں کھاؤں گا“ اب کی بار اس نے دھمکی دی تھی اور وہ کارگر بھی ثابت ہوئی تھی حاشو نے کروٹ بدل کر اس کی طرف منہ موڑ لیا تھا۔

”تو کھانا نہیں کھائے گا تو اماں بھی نہیں کھائے گی اور وہ صبح کی بھوک ہے“ خالق نے اس کے کروٹ بدلنے پر دل ہی دل میں خوش ہوتے ماں کی طرف سے آیا دل میں میل بھی صاف کرنے کی کوشش کی تھی۔

”تم کھانا کھا لو بھائی..... کیونکہ اگر تو بھوکا سویا تو اماں کھانا نہیں کھائے گی حاشو کی قسمت میں ماں کا ایسا لاڈ نہیں لکھا“ اس کی آواز زندہ گئی تھی وہ دودن سے یہی سوچ سوچ کے پاگل ہو رہا تھا کہ وہ اپنی ماں کے لیے اہم نہیں وہ اسے عزیز نہیں مگر وہ یہ نہیں سوچ پایا کہ ماں مجبور ہے اور غریب بھی..... ہمیشہ اس نے یہی غلطی کی اس نے انہوں کی محبت کو نہ سمجھا نہ جانچا..... اس نے ہمیشہ جلنا اور کڑھنا ہی سیکھا تھا۔

”ایسا کیوں سوچتا ہے دیکھ..... اماں کتنی پریشان ہے وہ تجھ سے بہت پیار کرتی ہے حاشو..... اسے تیری ذات سے بہت امیدیں ہیں وہ کہتی ہے تو اپنے باپ کا نام پیدا کرے گا، تو دنیا میں اپنا نام روشن کرے گا تو اس کے لیے فخر کا باعث بنے گا تو بہت دل لگا کے پڑھتا ہے کلاس میں اول آتا ہے تو وہ کتنی خوش ہوتی ہے تجھے اندازہ نہیں اور تجھے اندازہ ہونا چاہیے اپنی ماں سے محبت کا..... اب چل اٹھ کھانا کھالے..... ٹھنڈا ہو گیا تو مزہ نہیں آئے گا“ حاشو خاموش ہی رہا خالق نے پہلا نوالہ توڑ کر اس کے منہ میں ڈالا اور اس نے خاموشی سے کھا بھی لیا یہ اس کی ناراضی ختم ہونے کا اشارہ تھا مگر ماں سے وہ ابھی بھی نہیں بول رہا تھا۔



جلدی جلدی کرنے کے باوجود بھی آج اسے اچھی خاصی دیر ہو گئی تھی کیمسٹری کے پروفیسر نے ان کو کیمسٹری کی ایک اہم اسائنمنٹ حل کرنے کو دے دی تھی جو فوراً ہی انہیں مکمل کر کے دینی تھی اسی لیے وہ جھنپی ہو جانے کے بعد بھی کلاس میں رہی تھی کچھ پریکٹیکل کرنے تھے جن کی ریڈنگز اسے اسائنمنٹ میں سب مٹ کرنی تھیں..... اس نے گھڑی پر نگاہ بٹھرا کر دیکھا تو تین بج رہے تھے آج اس نے لُچ بھی نہیں کیا تھا..... پیٹ میں چوہے اودھم مچا رہے تھے مگر اسے بھوک کی پرواہ نہیں تھی اسے بس کالج کینٹین کے اس شیف تک پہنچنے کی جلدی تھی جہاں وہ ہر روز پچھلے پندرہ روز سے کھڑا ہو کر چھٹی کے بعد واکمن بجایا کرتا تھا ایک ہی گانے کے واکمن دھن تھی جو وہ ہر روز نئے طریقے سے بجایا کرتا تھا اس قدر دلکش مترنم اور

خوبصورت پرسوز ردم سے بھرپور لے کہ من تیرے لگتا وہ اس کی خوبصورتی کے ساتھ خود کو بہتا محسوس کرتی وہ پھولی
سانسوں کو ہموار کرتی شید کے قریب پہنچی..... سارے کیسپس کی لڑکیاں اور لڑکے اس کے قریب کھڑے ہوئے تھے وہ
آنکھیں بند کیے والکن کے سر بکھیر رہا تھا جس وقت وہ پہنچی وہ ان الفاظ پر تھا

“Every hour, Every minute take my hand and let me the way!”

“All through ur life”

“I will be by ur side”

“Till death do us part”

“I will be ur friend”

“My love will never End, Till death do us part”

”اس کے ارد گرد قوس و قزاح کے رنگ بکھرنے لگے..... وہ ہواؤں میں تیرتے ہوئے اڑ رہی تھی اس قدر ہلکی
پھلکی روئی کے گالوں جیسی..... براق اور شفاف..... زندگی اس قدر حسین اور مکمل بھی ہو سکتی ہے کیا اس احساس اور الفاظ کی
طرح..... وہ اس کی مندی آنکھوں پر نگاہ جمائے لاشعوری طور پر سوچ رہی تھی..... ایک انجانی کشش، غیر شناسا اجنبی سا
احساس..... جو اسے اپنی لپیٹ میں لینے لگا تھا وہ ڈر پوک نہیں تھی مگر محبت جیسے صحرے خوفزدہ ضرور تھی..... وہ محبت نہیں کرنا
چاہتی تھی مگر محبت ہی اس کی زندگی کا حاصل تھی وہ سر تا پیر محبت کی یورش میں بھیگا تھا اس کے وجود کے انگ انگ سے محبت
نقرہ بنی کی مانند چلتی محسوس ہوتی تھی وہ اس دنیا کا بایں نہیں لگتا تھا..... وہ کسی اور راہ کا مسافر تھا محبت جس کا پیر ہن تھا اور محبت
کے پیر ہن میں اس کا لپٹنا وجود چھپا ہوا تھا۔ وہ دو قدم آگے بڑھ آئی..... کچھ اس طرح کہ ارد گرد سے بے نیاز اس نے جھوم کو
چیر دیا تھا..... وہ بے خودی کے عالم میں آگے بڑھ رہی تھی ایسے لگتا تھا جیسے اسے دنیا کی کوئی پرواہ نہ ہو وہ یک تنہا بغیر جنبش
کیے سانس روکے والکن کے دھیمے سروں میں کھوئی اس کی بند پکوں پہ نگاہ جمائے کھڑی تھی..... کالج کے اسٹوڈنٹس نے اس
کی اس اضطرابی اور بے گانہ کیفیت کو ٹھنک کے دیکھا تھا چند ایک نے آپس میں اسے دیکھ کے سرگوشیاں بھی کی تھیں دبی
دبی سے مسکراہٹیں، ہلکی ہلکی سی سرگوشیاں..... مگر اس کا ارتکا نہیں ٹوٹا کوئی بیرونی طاقت کوئی غیر مرئی شے اس کا ارتکا نہیں
توڑ پاتی تھی تب تک جب تک والکن بچنا بند نہ ہو جاتا..... وہ اس کے اونچے لمبے وجیہہ سر آپے پر نگاہ جمائے کھڑی رہتی اور
وہ شان بے نیازی سے والکن بیک میں رکھ کر بند کر کے ادھر ادھر دیکھنے بنا آگے بڑھ جاتا جب وہ والکن بجانا بند کرتا تو جھوم
پر جوش انداز میں تالیاں بجا کر اسے خراج تحسین پیش کیا کرتا تھا مگر واحد ایک وہ تھی جو تالیاں نہیں بجاتی تھی وہ اسے نگاہوں
سے داد و تحسین پیش کیا کرتی تھی۔ وہ اسے سانسوں سے تعظیم بخشی تھی وہ اس کے ہر اٹھتے قدم پر اپنے قدموں کے نشان رکھ
کے اسے معتبر کرتی تھی وہ ایسا کس لیے کرتی تھی اسے آگاہی نہیں تھی اور کس کے لیے کرتی تھی یہ خبر اسے بھی نہیں تھی..... اپنی
کیفیات کو وہ کوئی نام نہیں دے سکتی تھی..... نہ سمجھ پاتی اور بغیر تجھمد عایان کرنا نہ آسان ہوتا ہے نہ ممکن..... وہ ابھی تک
اس کا نام نہیں جان پاتی تھی آگے کی معلومات تو بہت دور کی بات تھی..... چند دن گزرے وقت کے کشکول میں کھلتے ہوئے

سکول کی مانند..... وہ کالج میں ایک ہاٹ ایڈیشن مگنی اڑتی پھرتی کافی باتیں ان دونوں کے کانوں میں بھی پڑیں مگر دونوں ہی انجان رہے یوں جیسے ان دونوں کو ہی اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ لوگ ان کے بارے میں کیا رائے قائم کرتے رہے ہیں اور پرسکون زندگی وہی لوگ گزارتے ہیں جو دنیا والوں کی کہی باتوں کی پرواہ نہیں کرتے “

☆☆☆

حاشو نے سالن کی کٹوری اٹھا کر پھینکی تھی اس میں موجود واحد بوٹی اور پتلا سا شور بہ زمین پر گرتے ہی مٹی میں مل گئے تھے خالق نے روٹی کا لقمہ حیرت سے حاشو کی اس حرکت کو دیکھ کر واپس چنگیر میں رکھ دیا..... اماں نے بھی تاسف و دکھ سے گہری سانس بھری نجانے اب ایسا کیا گناہ سرزد ہو گیا تھا ان سے جو حاشو کا پارہ پھر سے چڑھ گیا تھا۔ روز بروز اس کی بدتمیزیاں بڑھتی جا رہی تھیں غصہ ہر وقت سوا نیزے پہ رہنے لگا تھا چھوٹی سے چھوٹی بات مزاج کو گراں گزرنے پر وہ ہاتھ میں آئی ہر چیز اٹھا کر ٹیخ دیا کرتا اس کی ضد اور ہٹ دھرمی میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا جو خالق اور اماں کے لیے نہایت پریشانی کا باعث تھی۔

”یہ کیا بدتمیزی کی ہے تم نے حاشو.....“ ماں کا راکھ ہوتا چہرہ دیکھ کر خالق نے ہی اس سے استفسار کیا تھا۔
 ”مجھے نہیں کھانا یہ پتلا شور بہ..... مہینوں بعد گوشت کی شکل دیکھنی نصیب ہوتی ہے اور وہ بھی اماں پکانے میں خراب کر دیتی ہے..... اس سے بہتر ہے ناں کہ میں نہ کھایا کروں یہاں کھانا.....“ ایک بات تو طے تھی کہ وہ کبھی بھی حالات سے سمجھوتہ نہیں کر پاتا تھا وہ بچپن سے ہی ایسا تھا پھر اب تو جوانی کی دہلیز پر کھڑا شباب کے رنگ چہرہ ہاتھ امتیازی نمبروں سے میٹرک پاس کیا تھا گورنمنٹ سے باقاعدہ وظیفہ ملا اور اچھے اور بہترین کالج میں داخلہ بھی..... وقت اور قدرت ایک ساتھ اس پر مہربان ہو گئے تھے مگر بچپن کی خود ساختہ محرومیوں کے دکھ ذہن کے پردے پر بہت واضح اور روشن تھے اور جب سے منہکے اور مشہور کالج میں گیا تھا وہاں کے لڑکوں کے ٹھاٹھ اور عیاشیاں مبر اور شکر کے بجائے مزید داغ خراب کر گئی تھیں وہ اپنا اور ان کا مقابل ہمہ وقت کیے رکھتا..... وہ خود کو کبھی حالات کے مطابق ڈھال پایا نہ ہی اس کی ماں اور بھائی اپنی محبت سے اسے سنبھال پائے وہ ایک نہایت مختلف مزاج کا لڑکا تھا اور اس کی بد قسمتی ہی یہی تھی کہ وہ حد سے زیادہ حساس تھا اور غریب کو حساس نہیں ہونا چاہیے۔

”تو کہاں سے لاؤں میں تیرے لیے مرغن کھانے حاشو.....“ اماں کو ایک دم ہی غصہ آیا تھا۔ ورنہ شاید خالق بات کو سنبھال ہی لیتا..... وہ تیر کی سی تیزی سے اس کی طرف آئی تھی اور غصے سے اسے تھپڑ بھی مارا تھا حاشو تو خاشو خالق بھی دم بخود رہ گیا تھا اماں نے آج تک ان دونوں بھائیوں پر کبھی ہاتھ نہیں اٹھایا تھا تبھی تو اسے مارنے کے بعد خود کچھ زمین پر گرمی روٹی اور اٹنی پڑی کٹوری کے پاس بیٹھ کر زور زور سے رونے لگ گئی تھیں خالق بے ساختہ ماں کی طرف بڑھا تھا اسے ماں کے آنسو تکلیف دے رہے تھے۔ اس نے کبھی ماں کو یوں بے اختیار روتے اور بلکتے نہیں دیکھا تھا وہ بہت مضبوط اعصاب کی مالک خاتون تھیں اپنے غم اپنے دکھ اور ان دکھوں کی تسکین چھپانے میں وہ دن بھر مردوں کی طرح کمایا کرتی تھیں پاؤں میں پلاسٹک کی جوتی کھس کر ایڑیاں پھاڑنے لگتی مگر وہ اپنے لیے جوتا نہ خریدتیں..... سردی گرمی وہ کالی لیلین کی

چادر میں گزاردیتیں مگر سردی کے سیزن کے مطابق نئے جوڑے تو انہیں کبھی نصیب ہی نہیں ہوئے تھے وہ تو انہی دو جوڑوں کی پیوند کاری کر کے انہیں استعمال کے قابل بنائے رکھتیں۔

”بتا اسے خالق..... اس کا باپ مرنے سے پہلے کوئی خزانہ نہیں چھوڑ کے گیا تھا ہمارے لیے..... نہ ہی میں کسی بکس کی بیٹی تھی جو اس کے ناز و نخرے ہی اٹھاتی ساری زندگی دن رات گدھوں کی طرح بار و دھو ڈھوکے کے یہ کرپائی ہوں تم دونوں کے لیے اس سے زیادہ نہیں کر سکتی..... کہاں سے لاؤں میں اس کے لیے وہ آسائشیں جن کی یہ توقع کرتا ہے مجھ سے..... وہ بری طرح رو رہی تھیں سالوں کا غبار تھا جو اس دن نکلا تھا حاشو نے آگے بڑھ کر ماں سے معافی مانگی نہ ہی اسے چپ کرایا بلکہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا گھر سے ہی نکل گیا.....“ خالق نے ٹھنڈی سانس بھر کے ماں کو تسلی دی جو اس کے اس طرح سے جانے پر اور بھی شدت سے رونے لگی تھیں۔

”تو رومت ماں..... میں اسے سمجھا دوں گا بچہ ہے ابھی، دیکھا تو نے..... ابھی دیکھا تو نے خالق..... وہ کیسے نکلا ہے گھر سے جس رزق کے لیے میں سارا دن دھکے کھاتی ہوں اس کی وہ ایسے بے حرمتی کرتا ہے۔ مجھے اس کی ان عادات سے ڈر لگتا ہے خالق یہ کس ڈگر پہ چل نکلا ہے، وہ خالق کے سینے میں منہ چھپا کے روئی تھیں۔“

”ٹھیک ہو جائے گا وہ اماں..... بس لاؤ میں ایسی غلطیاں کر جاتا ہے اور کچھ وہ غلط بھی نہیں ہے اس نے باہر کی رنگین اور چمکتی دنیا دیکھی ہے ہمیشہ..... روپے پیسے کی ریل پیل..... دیکھنا جب پڑھ لکھ کے کسی قابل بنے گا تو خود ہی قدر کرے گا اپنی محنت کی کمائی کی..... ہم نے ہمیشہ ہی اسے اچھے سے اچھے سکول میں پڑھا ہے تاکہ وہ کسی قابل بن سکے اور وہ ضرور بنے گا وہ کتنا ذہین ہے ہمیشہ ہر کلاس میں اول آتا ہے تو پھر ایسا چھوٹا موٹا نخرہ تو اس کا حق بنتا ہے ناں اماں، وہ ماں کے آنسو صاف کرتے اپنے کہے کی تائید چاہ رہا تھا، سادہ لوح ماں مانتا کے جذبے سے مجبور سرکوا ثبات میں جنبش دینے پر مجبور ہو گئی..... یہ مانتا بھی ناں عجیب ہی جذبہ ہے اولاد کو کبھی غلط سمجھنے ہی نہیں دیتا.....“

گھر سے وہ بہت دُکھی ہو کے نکلا تھا اسے دکھ اس بات کا نہیں تھا کہ اس نے ماں کا دل دکھایا ہے بلکہ دکھ اس تپھر کا تھا جو ماں نے اسے مارا تھا یعنی ماں نے اس کے ساتھ زیادتی کی تھی اپنی غلطی کا ادراک اسے کبھی نہیں ہوا تھا دوسروں کی زیادتی کا احساس اسے بہت جلدی ہو جایا کرتا تھا۔ اسے غصہ آتا تھا تو وہ اتنا پہ جا کے سوچتا تھا مگر دوسروں کو اس کا رد عمل ظاہر کرنے کا حق بھی دینا وہ پسند نہیں کرتا تھا کبھی بستی سے دور گندے نالے کے پاس..... وہ اکثر ہی ناراض ہو کر روٹھ کر وہاں بیٹھ جایا کرتا تھا..... روتے کڑھتے اس نے وہیں پر اپنے لیے ایک خیالی دنیا بسائی تھی..... وہ جب بھی ناراض ہوتا وہاں جا کر اپنی حسین سوچوں سے تخلیق کردہ دنیا میں قدم دھر لیتا..... وہ دنیا جو مکمل اور حسین تھی خوبصورت پر سکون اور پر آسائش تھی..... جہاں وہ ایک بڑے سے گھر میں اپنے ماں باپ اور بھائی کے ساتھ ایک بہترین خوشگوار زندگی گزارتا تھا جہاں نوکروں کی فوج اس کے نخرے اٹھانے کو ہمہ وقت تیار مودب انداز میں کھڑی رہتی تھی اور ماں تک سک سے تیار اس کے ناز اور لاڈ اٹھانے میں مصروف رہتی تھی اس نے اپنے سکول و کالج میں کبھی نہیں بتایا کہ وہ مزدور کا بیٹا ہے لڑ بھگڑ کر ہی سہی مگر اس نے ہمیشہ اچھا اور بہترین لباس پہنا تھا دوستوں پر پیسہ ویسے ہی لٹایا تھا جیسے موٹر گاڑی میں بیٹھ کر آنے والے

بچے اور لڑکے لگایا کرتے تھے..... اسے لگتا تھا اپنی بنائی جھوٹی شان و شوکت کو قائم رکھنے کے لیے وہ ماں اور بھائی سے لڑ کر اپنا حق وصول کرتا ہے بس یہ وہ ایک بات کبھی نہیں سمجھ پایا کہ ماں اور بھائی اس کی محبت میں اس کی کڑوی کیلی سہہ جاتے ہیں وہ اس سے ذرتے نہیں پیار کرتے ہیں وہ ان کی محبت کو کبھی سمجھ نہیں پایا یا شاید ان دونوں کو کبھی سمجھنا ہی نہیں آیا مگر آج تو حد ہی ہو گئی تھی آج تو ماں نے اس پر ہاتھ اٹھا دیا تھا ماں نے کبھی اسے بھرپور محبت اور توجہ نہیں دی تھی مگر اسے کبھی یوں مارا بھی نہیں تھا..... اس نے کتنی مرتبہ اس بات کو محسوس کیا تھا کہ وہ خالق سے زیادہ پیار کرتی ہے وہ حاسد نہیں تھا اسے اپنے بھائی سے جلن بھی محسوس نہیں ہوتی تھی مگر اسے ماں کی عدم دلچسپی اور بے زاری بھی تکلیف دیتی تھی وہ سارا دن خالق کے پاس رہتا تھا مگر شام کو جب ماں گھر واپس آتی تو اس کا دل چاہتا ماں اس کے لاڈ اٹھائے اسے محبت سے اٹھا کے گھر کے سارے کام کرے اسے اپنی گود میں بٹھائے رکھے مگر وہ گھر آتے ہی اسے کھانے کی کوئی چیز دے کے چکار کر ایک طرف بیٹھ جانے کو کہتی اور خود گھر کی صفائی ستھرائی اور کپڑوں وغیرہ کی دھلائی میں مصروف ہو جایا کرتی اسے کبھی ماں کی ذمہ داریوں کا احساس نہیں ہوا اسے ہمیشہ لگا کہ ماں اس کے ساتھ زیادتی کرتی ہے..... اگر وہ خالق کو زیادہ اہمیت دیتی بھی تھی تو خالق نے بھی تو اس کا ساتھ ویسے ہی دیا تھا جیسا کوئی بھی اچھا بیٹا اپنی ماں کا دیتا ہے..... وہ کبھی اسکول نہیں گیا کہ ماں کما نہیں پائے گی چھوٹا بھائی رل جائے گا گھر میں فاقوں کی نوبت آجائے گی اس سوچ ہمیشہ اپنے ذات کے گرد ہی محسوس رہی تھی اس نے ہمیشہ میں سے میں تکہ کا سہہ کیا تھا اور یہ خود غرضی نہیں تو کیا تھا یا فائدہ پس حسدیت کا جو صرف اپنی ذات کی محرومیوں کا ہی ادراک بخشنے۔ اس روز گندے نالے کے پاس بیٹھ کر پہلی مرتبہ اس نے اپنی تخلیق کردہ دنیا کو صفحہ قرطاس پر موتیوں کی مانند اتارا تھا..... کمال حیرت کی بات اس کہ اندر سکون کے جھرنے پہنے لگے تھے..... اس نے ایک ہی نشست میں ساری کہانی لکھ ڈالی تھی یہ وہ کردار تھے جن کے درمیان وہ رہتا تھا یہ وہ دنیا تھی جس کا وہ باسی تھا یہ اس کے وہ خواب تھے جن کو شرمندہ تعبیر کرنے کی اس کی خواہش تھی پہلی بار اس نے کہانی لکھی تھی اور اس کے لیے وہ ایک کہانی نہیں تھی اپنی محرومیوں تشنگی اور اذیتوں کے بعد کے دیکھے جانے والے حسین خواب تھے خوش امید تھی اس کی پہلی ہی کہانی نے تہلکہ مچا دیا تھا اس کا انداز تحریر اسلوب بیان بہت منفرد اور سادہ تھا اور وہ ہٹ کر لکھتا تھا وہ چونکا دینے والی بات کہتا تھا وہ کہانی نہیں لکھتا تھا وہ پڑھنے والوں کی آنکھوں میں خواب بناتا تھا اور کیا کمال بناتا تھا۔



پاک ٹی ہاؤس ایک ادبی، تہذیبی اور ثقافتی علامت تھا مشاعروں، ادیبوں اور نقاد کا مستقل اڈہ..... ادیبوں و شاعروں کا دوسرا گھر بھی کہا جاتا تھا۔ حشمت زیدی نے بہت جلد یہاں کے لوگوں کے دلوں میں جگہ بنائی تھی وہ پاک ٹی ہاؤس کے ایک خوش گفتار بے حد قابل اور نفیس طبیعت کے حامل ایک پڑھے لکھے وجیہ نوجوان تھے ایک زمانہ ان کی ذہانت، وجاہت اور گفتگو کا شیدائی تھا وہ اپنی تحریر میں پور پور ڈوبے نظر آتے تھے۔ بہت محبت کرنے والے باادفا، باکردار، ایثار پسند، کشادہ ذہن..... دیکھنے میں بھی ویسے ہی دیکھتے، اپنی کہانیوں اور تحریروں کا سین جو بھی ایک بار ملتا گرویدہ ہو جاتا انہیں بے پناہ ایسے خطوط بھی ملے جن میں ان کے کسی افسانے کسی ناول کے مختصری انجام کی وجہ سے حاصل ہونے والے

سبق سے کسی کی زندگی تباہ ہونے سے بچ گئی کئی ایک نے یہ بھی لکھا کہ ان کی زندگی کا اہم ترین فیصلہ جو کہ غلط ہونے جارہا تھا صرف ان کی تحریر میں چھپے پیغام اور مشورے کی وجہ سے درست ہو گیا..... ٹی ہاؤس کے عروج کا زمانہ ان کے لکھنے کا آغاز اور وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے سینئر لیڈر جن لیے گئے..... مصنفین کے لیے سہولیات زندگی ادبی محافل کے امور کا انتظام سب ان کے نازک کندھوں پر آ گیا جسے انہوں نے ہمیشہ احسن طریقے سے نبھایا وہ بہت ویل آرگنائزڈ تھے اپنی شخصی خامیوں کو انہوں نے ہمیشہ اپنی خوبیوں کی عظمت اور بڑائی کے پردے میں چھپایا تھا اور بہت زیادہ کامیاب رہے تھے۔ اب وہ بہت مشہور ہو چکے تھے سوانہوں نے کچی بستی کے ساتھ ستر گز کے مکان کو خیر آباد کہہ کے نیلے گنبد کے پاس ایک کمرہ کرائے پر لے لیا..... ویسے بھی اپنے تخلیقی کام کے لیے انہیں یکسوئی کی ضرورت تھی اتوار یا جمعے کے دن وہ کھڑے کھڑے بھائی اور ماں سے مل آتے..... ویسے بھی ماں اب زیادہ تر بیمار ہی رہنے لگی تھی خالق بھائی کی محلے کی ہی لڑکی سے شادی ہو گئی تھی اماں کی ساری زندگی کی محنت کا جمع جتنا ان دو دکانوں کا حاصل تھا جنہیں خالق بھائی بیک وقت احسن طریقے سے چلا رہے تھے ایک دکان کی آمدنی خود رکھ لیتے اور دوسری کی اماں لا کر حاشو کی ہتھیلی پر دھر دیتے جس نے کبھی جھوٹے منہ بھی ماں کے لیے پچاس یا سو روپے نہیں پکڑائے تھے خالق نے کبھی مانگے بھی نہیں اس کی نوبت بھی نہیں آئی کیونکہ حاشو کبھی مطمئن ہوا ہی نہیں تھا دکان کی آمدنی اسے ہمیشہ ہی کم لگتی تھی حالانکہ اس میں حاشو کی محنت، توجہ یا وقت صرف نہیں ہوتا تھا پھر بھی اسے مفت کے پیسے بھی کم لگتے تھے۔



اس روز وہ بہت جلدی میں تھے انہیں الحراء آرٹ کونسل میں منعقد ایک مشاعرے میں جانا تھا۔ چائے اور کیسیٹ سگریٹ کی طلب انہیں پاک ٹی ہاؤس میں سمیٹ کر لائی تھی مگر علیم الدین صاحب وہاں موجود نہیں تھے وہ بار بار اپنی گھڑی کی جانب دیکھ رہے تھے انہیں وہاں جلدی پہنچنا تھا اسی اثناء میں کاؤنٹر پر رکھے ایس ٹی ڈی کی مخصوص چنگھارٹی کانوں کے پردے پھاڑتی بیل بجی تھی..... انہوں نے کوفت و بے زاری سے پاک ٹی ہاؤس کے داخلی دروازے کی جانب دیکھا جہاں سے علیم الدین ابھی تھوڑی دیر پہلے کیسیٹ خریدنے کے لیے باہر گئے تھے اور ان کی واپسی کے آثار ہی الوقت دکھائی نہیں دے رہے تھے فون کی مسلسل چنگھاڑ نے ان کا موڈ ویسے بھی برگشتہ کر دیا تھا انہوں نے بے ذلی سے فون اٹھایا تھا اور بڑے بے زارے انداز میں ہیلو کہا تھا۔

”السلام علیکم..... کیا میں شمت زیدی صاحب سے بات کر سکتی ہوں، بے حد نرم رولہجہ ان کے سماعتوں میں پھول بکھیر گیا تھا اس قدر خوبصورت دلکش اور دل آواز آواز انہوں نے آج تک نہیں سنی تھی انہیں اعتراف کرنا پڑا تھا۔“

”جی..... آپ کو کیا بات کرنا ہے ان سے..... کوئی پیغام ہو تو بتا دیجیے ان تک پہنچ جائے گا“ کچھ دیر پہلے والی بے زاری بھاپ بن کے یکدم اڑ گئی تھی انہوں نے اپنے شائستہ انداز میں اس خوبصورت آواز والی لڑکی کو جواب دیا تھا۔

”پیغام نہیں..... مجھے ان سے خود بات کرنی ہے اور بہت اہم بات کرنی ہے..... میں ان کا شکریہ خود ادا کرنا چاہتی ہوں انجانے میں جو احسان انہوں نے میری ناتواں ذات پر کیا ہے اس کے لیے میں چاہ کر بھی ان کا شکریہ صحیح

معنوں میں ادا نہیں کر سکتی، دوسری جانب وہ لڑکی بہت دھیمے نرم لہجے میں ہلکے ہلکے جوش سے کہہ رہی تھی ایسی تعریف و توصیف کے تو وہ عادی تھے مگر پھر بھی انہیں اس لڑکی کی تفصیل سننے کو دل چاہتا مگر وہ اس لڑکی کو یہ نہیں بتا سکتے تھے کہ وہ شہمت زیدی ہی ہیں کیونکہ ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے تو وہ خود ان سے کہہ چکے تھے کہ کوئی پیغام ہو تو بتا دیجیے وہ شہمت زیدی تک پہنچ جائے گا یا یک ایک انہوں نے ایک فیصلے پر پہنچ کر مقابل لڑکی کو آگاہ کیا تھا۔

”اس وقت تو وہ ایک مشاعرہ اٹینڈ کرنے کے لیے الحمرا آرٹ کونسل میں گئے ہوئے ہیں آپ کل دوپہر ایک بجے کے بعد فون کر لیجیے گا میں کوشش کروں گا آپ کی ان سے بات کروانے کی ٹھیک ہے.....“ انہوں نے نہایت عمدگی سے جواب دیتے اسے بے پناہ خوش کر دیا تھا۔

”ذرا نوازی ہوگی آپ کی اگر آپ ایک مرتبہ میری ان سے بات کروادیں گے تو..... میرا ان سے بات کرنا بہت ضروری ہے میں کل دوپہر ایک بجے فون کروں گی..... کیا وہ وہاں خود موجود ہوں گے ناں..... وہ نجانے کس انجانے خدشے کے تحت تائیدہ چارہ رہی تھی تبھی بے ساختہ ان کے چہرے پر مسکراہٹ اٹھ آئی تھی“

”جی محترمہ..... تسلی کے لیے خود بھی تشریف لاسکتی ہیں آپ..... انہوں نے ہنستے ہوئے بس یوں ہی کہہ دیا تھا مگر انہیں اندازہ نہیں تھا کہ وہ دوسرے ہی روز سچ سچ ان کے سامنے آ کھڑی ہوگی۔“

☆☆☆

انہوں نے آنے والی دوشیزہ کو ایک نظر دیکھا تھا سفید کلیوں والے کرتے کے ساتھ سفید چوڑی دار پا جامہ پہنے ہوئے تین گز کا آتش رنگ کا لمبا دوپٹہ سپینے اور فاسٹ سے اوڑھے وہ ایک دیدہ زیب لڑکی تھی..... نزاکت، حسن اور معصومیت کا حسین امتزاج ہے۔ پیچھے کہیں دھیمے سروں میں ریڈیو بج رہا تھا، جانب شیشے کی دیوار کے ساتھ لگے ہونے پر وہ کاغذات کا پلندہ سامنے رکھے سگریٹ والا ہاتھ منہ کے قریب رکھے گہری سوچ میں متفرق تھے شیشے کی کھڑکیوں سے گلابی دھوپ چھن چھن کر اندر آ رہی تھی..... آج موسم میں شدت تھی ناصر کاظمی، انتظار حسین، سجاد باقر رضوی، قیوم منظر احمد، مبارک احمد جیسے بڑے نام اسی صوفے پر بیٹھ کر شام کے وقت محفل جمایا کرتے تھے مگر اس وقت دن کے ڈیڑھ بج رہے تھے اور وہ صوفہ اس کے سامنے پڑا میز اور کرسیاں ویران تھیں ان پر صرف شہمت زیدی صاحب کا راج تھا جہی کوئی بہت ہولے سے ان کے پاس آ کر کھٹکھٹا رہا تھا انہوں نے مسودے پر سے نظر ہٹا کر دیکھا اور پھر دیکھتے ہی رہ گئے، اے اے تھے ان کی نظر ہٹنے سے انکاری ہو گئی تھی۔ تلے والے کھسے میں مقید نرم گلابی پاؤں پر ان کی نظر پڑی اور وہیں جم گئی کیا کسی کے پاؤں اس قدر حسین اور خوبصورت بھی کھسے میں لگ سکتے ہیں..... انہوں نے لحظہ بھر کے لیے سوچا تھا۔

”آداب“ مترنم آواز میں کہا گیا تو وہ چونکے اس قدر حسین عورت انہوں نے اپنے ناولز میں بھی نہیں لکھی تھی نہ کبھی کسی کتاب میں پڑھی تھی وہ ایک ماورائی داستان کا کوئی سانس لیتا چلتا پھرتا مدہوش کرتا ہوا کردار تھی۔

”آداب..... تشریف رکھیے“ انہوں نے سگریٹ کی راکھ کو ایش ٹرے میں جھاڑ کر اس کے بیٹھنے کے انداز کو کن اٹھیں سے دیکھا اس کے ہاتھ اپنی گود میں دھرے تھے لمبی لمبی بے حد سفید انگلیاں جلد کی اوپری تہہ اس قدر باریک اور

شفاف کے ہری رگیں واضح ہو کر اپنا جلوہ دکھا رہی تھی دائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں عقیق کی لمبی نازک سی انگوٹھی میں قید تھا۔ ”شکریہ.....“ وہ انہیں دیکھ کے ہلکے سے مسکرائی تو نازک ہونٹوں میں انار کے دانوں کی مانند جڑے سفید موتیوں جیسے دانت سارے پاک ٹی ہاؤس کو اپنی جگہ گھاٹ سے روشن کر گئے تھے۔

”میرا نام ام کلثوم ہے..... حال ہی میں بی۔ اے کیا ہے لاہور کالج سے..... کل میں نے ہی فون کیا تھا آپ سے بات کرنے کے لیے..... پھر سوچا خود ہی جا کے مل آؤں شاید آپ کو بتا سکوں کہ آپ کی تحریر کی وجہ سے کس طرح سے میری زندگی بچ گئی، توقف کے بعد وہ پھر ہولے سے مسکائی حشمت زیدی کی نگاہیں خیرہ ہوتی گئیں اور من سیراب..... ہوتے ہیں کچھ لوگ ایسے بھی جن سے ملنے کے بعد آپ کو زندگی حسین لگنے لگتی ہے دھوپ میں بہار اور رعنائی محسوس ہوتی ہے یہی کیفیات اس وقت ان کی بھی تھیں وہ پہلی خوبصورت لڑکی نہیں تھی جو ان سے ملنے آئی تھی بلکہ یہ وہ پہلی خوبصورت لڑکی تھی جو ان کے دل کو اچھی لگی تھی۔“

”بہت نوازش..... مگر پہلے بتا دیجیے کہ کیا لیس گی شربت یا چائے،“ انہیں اچانک ہی آداب میزبانی نبھانے کا خیال آیا تھا۔

”چائے پلواد بیجی..... میں نے سوچا تھا کہ جب کبھی آپ سے ملی تو چائے ضرور پیوں گی آپ کے ساتھ اور میری یہ خوش نصیبی ہے کہ مجھے یہ موقع آج مل رہا ہے..... میں آپ کی تحریروں کی دیوانی ہوں آپ کی ہر تحریر میرے پاس محفوظ ہے..... پھر اس نے خود ہی وضاحت کر دی تھی، جس قدر میری خواہش تھی آپ سے ملنے کی میرے پاس الفاظ نہیں اپنی خواہش کو بیان کرنے کے لیے خوبصورت لفظوں کے تو آپ بے تاج بادشاہ ہیں.....“ بات کے اختتام پر وہ پھر مسکرائی تھی اس کا انداز بیاں بہت شائستہ اور دلکش تھا حشمت زیدی بے ساختہ مسکرائے تھے تعریف تو ہر کوئی کر لیا کرتا ہے مگر یہ کسی کسی کے بس کی بات ہوتی ہے کہ وہ اپنی خوبصورت تعریف کو انوکھا بنا دے..... ام کلثوم اس فن میں طاق تھیں گزرتے وقت نے ان پر اچھے سے واضح کر دیا تھا۔

”بہت نوازش محترمہ..... یہ آپ سب کی محبت اور اوپر والے کا کرم ہے کہ بات اب تک بنی ہوئی ہے آپ بتائیے کہ کس سلسلے میں ملنا چاہ رہی تھیں،“ انہوں نے چائے کا آرڈر دینے کے بعد گفتگو کو بڑھانے کی غرض سے پوچھا تھا۔

”میرے ابا ایڈیشنل جج ہیں ہائی کورٹ کے..... ہم دو بہنیں اور ایک بھائی ہیں، بہن کا نام بتول ہے اور وہ شادی شدہ ہے بھائی لندن میں کیمبرج یونیورسٹی میں پڑھ رہا ہے جبکہ میں نے ابھی ابھی بی۔ اے کیا ہے ابا کے دوست کے بیٹے کا رشتہ آیا ہوا ہے میرے لیے، پچھلے کئی دنوں سے..... ابا کا اصرار تھا کہ رشتہ وہاں طے کیا جائے اور والدہ اپنے بھائی کے ہاں مجھے بیاہنا چاہتی تھیں میں ان دونوں کے درمیان پنڈولیم بنی تھگ آگئی تھی ابا کے دوست کا بیٹا کسی بھی لحاظ سے قابل اعتبار شخص نہیں تھا میں نے کیا ہم سب نے اس کے بارے میں بہت سے قصے سن رکھے تھے دیے بھی مجھے شادی اپنی مرضی و منشا سے کرنی ہے کیونکہ زندگی میں نے گزاری ہے اور کیا فائدہ ایسی زندگی کا جس میں سکھ سکون اور من کی خوشی شامل نہ ہو.....“ اس نے لمبا توقف کیا اس دوران چائے اور کیک کی پلیٹ ان دونوں کے درمیان رکھی میز پر جگمگ ابھی تک وہ اس کی

آمد کا مطلب و مقصد نہیں سمجھ پائے تھے۔

”چند روز پہلے اماں اور ابا کے درمیان زوردار معرکہ ہوا..... میری وجہ سے..... ابا بہت جذباتی اور فطرتاً بھگڑا لو ہیں مسئلہ یہ ہے کہ اماں کا مزاج بھی کسی طور ان سے کم نہیں ہے اور میں ان دونوں جیسی تو نہیں البتہ ان دونوں سے زیادہ جذباتی ضرور ہوں..... ان دونوں کے کشیدہ تعلقات کا باعث میں تھی میرے لیے یہ بات بہت تکلیف کا باعث تھی میرا دل چاہا میں اپنے آپ کو ختم کر لوں نہ میں ہو گئی نہ میرے والدین کے درمیان اس طرح جھگڑا ہوگا..... میں سخت اذیت میں تھی شاید ایسا کر بھی لیتی اگر میں خوش کشی کرنے والی لڑکی وہ کہانی نہ پڑھ لیتی جو پچھلے ماہ سیارہ ڈائجسٹ میں چھپی تھی مجھے ایسا لگا انجانے میں آپ نے میرے حالات و جذبات کی عکاسی کر دی ہے میں نے کوئی انتہائی قدم نہیں اٹھایا بلکہ میں نے ایک اور اچھا کام یہ کیا وہ شمارہ جا کہ ابا کی اسٹڈی میں رکھ دیا..... اس بار وہ پھر ہولے سے مسکراتی تھی وہ جتنے دھیمے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولتی تھی مسکراتی بھی اسی طرح سے تھی وہ جو صم بکلم اس کی بات سن رہے تھے یکا یک جو کئے“

”ارے واہ..... پھر کیا ہوا“ کہانی یکا یک دلچسپ ہو گئی تھی۔

”پھر..... ابانے وہ کہانی پڑھی اور اس رشتے سے خود ہی انکار کر دیا وہ جان گئے تھے کہ زور بردستی سے کیے جانے والے رشتے پائیدار اور دیر پا ثابت نہیں ہوتے نہ ہی وہ سودمند رہتے ہیں اور وہ یہ بھی جان گئے تھے کہ میرے دل کی خوشی کیا ہے..... حشمت صاحب آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ میں دن رات کس قدر ٹینشن اور ذہنی اذیت میں تھی میرے پاس تیسرا کوئی راستہ نہیں بچا تھا آگ کا کنواں میرے آگے اور پیچھے تھا نہ تو میں اپنے ماموں زاد سے بیاہ کرنا چاہتی ہوں نہ ہی ابا کے دوست کے اوباش بیٹے سے..... اور جس وقت میں ناامید ہو چکی تھی اس وقت انجانے میں آپ میرے سیمبا بنے میں اکثر سوچتی ہوں اگر اس روز میں آپ کی کہانی نہ پڑھتی ٹینشن سے چھٹکارا پانے کے لیے تو آج گناہ کبیرہ کی مرتکب ہو چکی تھی..... آپ کا بہت بہت شکریہ آپ اپنے قلم سے معاشرے کی اصلاح کر رہے ہیں آپ واقعی قلم کا حق ادا کرنا جانتے ہیں..... چلتی ہوں انشاء اللہ زندگی نے موقع دیا تو دوبارہ ملاقات ہوگی“ وہ اچانک ہی اٹھ کھڑی ہوئی تھی اس کی چائے کی آدھی پیالی ویسے ہی رکھی تھی۔

”ارے آپ ایسے نہیں جاسکتیں ام کلثوم..... چائے کی پیالی تو ابھی آپ نے خالی کی ہی نہیں اور کیک کو تو چکھا تک نہیں..... اور مجھے شکریہ ادا کرنے کا موقع بھی نہیں دیا آپ نے..... وہ اسے دوبارہ بیٹھنے کا اشارہ کرتے مسکرائے تھے ام کلثوم نے استفہامیہ لگا ہوں سے انہیں دیکھا وہ کیا کہنا چاہ رہے تھے وہ سمجھ رہی تھی۔“

”ایک قلم کار کی تحریر سے اگر کوئی مثبت اور روشن پہلو سیکھ کر اسے اپنی زندگی میں شامل کر لیتا ہے تو اس بے بڑی بات کسی بھی قلم کار کے لیے ہو ہی نہیں سکتی اور اگر کسی قلم کار کی تحریر کسی کی جان اور زندگی بچانے کے کام آسکے تو یقیناً یہ اس سے بھی زیادہ بڑی بات ہوگی کیونکہ روزن اور مثبت سوچ بھی کوئی کوئی ہی سیکھتا ہے اور میرے لیے آج خوشی کا دن ہے کہ میری سوچ کسی کے کام آسکی.....“ انہیں حقیقتاً خوشی ہوئی تھی ام کلثوم جیسی خوبصورت سلمیٰ ہوئی لڑکی کی جان صرف ان کی وجہ سے بچی تھی وہ جو بہت زیادہ جذباتی تھی اگر جذبات میں آکے کوئی ایسا انتہائی قدم اٹھا لیتی تو اس نقصان کی بھرپائی کون

کر پاتا بدنامی و رسوائی الگ ہوتی اور ہمارے معاشرے کے رائج کردہ اصول ایسی جذباتی غلطیوں کی معافی نہیں دیا کرتا بلکہ ایسی غلطیوں کی سزا سلسلوں تک چلتی ہے۔

”ام کلثوم آپ نے آج کے دن مجھے بے پناہ خوشی دی ہے..... میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا کہ آپ نے میرے لکھے ہوئے لفظوں کو عزت بخشی ان پر عمل کر کے آپ نے مجھے معتبر کیا ہے میں یقیناً بہت خوش نصیب ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے میرے لکھے لفظوں میں اتنا اثر رکھا ہے..... انہوں نے نہایت عاجزی و انکساری سے کہتے ام کلثوم کو متحیر کیا تھا اتنا نامور لکھاری اور غرور نام کو بھی نہیں تھا محبت و اخلاص کی چاشنی جس کی پور پور سے چمکتی محسوس ہو رہی تھی اس بات کا اظہار ام کلثوم نے فوراً کر بھی دیا تھا اس کی بات سن کے وہ ہولے سے مسکرائے تھے سامنے ٹیبل پر دھری کیسیٹ کی ڈبیہ اٹھائی اور ایک سگریٹ نکال کر عنابی لبوں میں دبایا.....“

”غور و کس بات کا کروں..... میرے پاس ایسا کیا ہے جو رب تعالیٰ کی رحمت کے بغیر میں نے حاصل کیا ہو..... یہ سب نام عزت پیارا اور شہرت میرے رب تعالیٰ کی عطا ہے جس کو غرور پسند نہیں اور میں اس ذات واحد کا شکر ادا کروں یہ بری بات ہے“ ام کلثوم نے ان کے جواب سے متاثر ہو کر انہیں اپنی پسندیدگی کی سنجیدگی بخش دی تھی۔

”پہلے میں صرف آپ کی تحریروں سے متاثر تھی مگر آج آپ سے ملکر یہ احساس ہو رہا ہے کہ آپ خود اپنی تحریروں سے بھی زیادہ اچھے ہیں بہت پیارے دل کے مالک ہیں میں آپ سے بہت متاثر ہوئی ہوں اگر زندگی نے موقع دیا تو ہم دوبارہ ضرور ملیں گے.....“ اٹھتے سے تقریباً ان کے ساتھ ڈھائی گھنٹے گزارنے کے بعد اس نے اعتراف کیا تھا وہ ابھی تو شہمت زیدی بھی اس کی تعظیم میں اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

”مجھے بھی بہت اچھا لگا ام کلثوم اور میں چاہوں گا کہ ایسا موقع زندگی ہمیں بار بار دے.....“ انہوں نے بھی دل کی بات کہنے میں تامل سے کام نہیں لیا تھا ام کلثوم نے لیکھت اپنی بے پناہ حسین نگاہیں ستفاسیمہ انداز میں ان کے چہرے پر جمائیں اور وہ بس ایک لمحہ جس میں وہ قید ہو گئے تھے ام کلثوم کی نگاہوں کا کیو پڈ ان پر اس انداز میں گرا کہ وہ چاروں شانے چت ہو گئے محبت نے انہیں گھائل کر دیا تھا۔



اس کی زندگی محرومیوں اور تشنگی کا حاصل جمع تھی..... شعور کی آنکھ کھولتے ہی اس نے اپنی نانی ماں کا چہرہ دیکھا تھا واحد ایک وہ رشتہ تھا جس نے اس کے ہمیشہ ہی لاڈ اٹھائے تھے..... اس نے اپنے باپ کو کبھی نہیں دیکھا..... مگر ماں کے پاس ہوتے ہوئے بھی اس کے ساتھ رہنے کے باوجود اسے ماں کی ممتا اور اس کی گرم آغوش کبھی نصیب نہیں ہو پائی کس قدر دکھ کی بات تھی اسے ماں کا پیار کبھی نہیں ملا کس قدر دلخراش بات تھی اسے باپ کا ذکر تک نہیں کرنے دیا گیا کبھی اس کا نام پتہ نہیں بتایا گیا اس نے اپنے ماں کو اکثر ہی اکیلے بیٹھے روتے اور چلاتے دیکھا تھا..... وہ ہدائی کی کیفیت میں چیخنے چلانے لگتی تھیں..... اس کی ماں ایک بے حد حسین عورت تھی مگر اس نے کبھی بھی اپنی ماں کو خوبصورت اور سجا سنورا نہیں دیکھا تھا وہ جوان تھی، خوبصورت اور حسین بھی مگر اپنے حسن سے کسی قدر بے پرواہ بھی جبکہ اس کی نانی ماں سانولی سلونی مگر

پرکشش خاتون تھیں اور کچھ انہیں پہننے اور ہنسنے کا سلیقہ بھی خوب آتا تھا وہ ہر وقت خوب بھی سنوری رہا کرتی تھیں سفید موتیوں کی مالا ان کے گلے میں ہمہ وقت ڈالی ہوئی ہوتی تھی بالوں کا اونچا جوڑا جس میں وہ باقاعدگی سے چنبیلی اور موتیے کے پھول گوندھا کرتی تھیں ان کی شخصیت بہت متوازن اور دلفریب سی تھی نانی کی آغوش میں رہ کر اسے ہمیشہ ہی ایک سکون اور معطر سا احساس اپنے حصار میں گھیرے رکھتا تھا وہ خود کو محسوس کر سکتی تھی۔

اس نے شعور کی آنکھ کھولی تو خود کو اسی بڑے سے گھر میں بالکل تنہا پایا تھا وہ کنال کا خوبصورت اور بڑا گھر جس میں گنتی کے تین نفوس اس کے علاوہ رہتے تھے اس کے ابا میاں، نانی ماں اور اس کی اپنی وہ ماں جس نے اسے جنم دیا تھا..... ابا میاں تو اس کی ماں کی طرح سے کم گو سے ہی تھے اور ماں کو بولتے اور ہنستے اس نے کبھی دیکھا نہیں حالانکہ اس کی اچھی خاصی حسرت بن گئی تھی کہ وہ ماں کو ہنستا بولتا یا زندگی کے جھیلوں میں دلچسپی لینا دیکھے..... مگر اس کی یہ حسرت ہمیشہ حسرت ہی رہی تھی۔ وقت نے اس کی محرومی پر مہم نہیں رکھے بلکہ اس کے دکھوں کو ناسور بنا دیا تھا..... ابا میاں کا وجود دم غنیمت اس کے لیے اس وقت بنا جس وقت وہ چار برس کی تھی..... ایک روز وہ آفس سے واپس آئے تھے گرمی زوروں پر تھی اور گھر میں کوئی بھی نہیں تھا وہ آتے ہی صوفے پر بے دم ہو کے لیٹ گئے تھے..... وہ اب ان سے ڈرنے اور بدکنے لگی تھی جب اس نے پاؤں پاؤں چلنا شروع کیا تھا وہ ان کے قدموں سے اکثر ہی آکے لپٹ جایا کرتی تھی مگر ابا میاں بہت غصے سے اسے جھٹک دیا کرتے ان کا انداز اس کے معصوم فہم سے بالاتر تھا نانی البتہ چپکے چپکے آنسو ضرور پونچھا کرتی تھیں مگر وہ ڈیڑھ برس کی پھول بھر معصوم بچی اکثر ہی ان کی توجہ حاصل کرنے کو ان کی طرف لپکتی وپسے بھی بچوں کی یہ فطرت ہوتی ہے جس چیز سے انہیں روک اجائے وہ اسی کی جانب بار بار لپکتے ہیں تجسس کے مارے وہ بار بار اسے چھونے اور جانچنے کی تگ و دو کرتے ہیں بالکل اسی طرح جو لوگ ان سے پیار نہیں کرتے وہ ان کی توجہ حاصل کرنے کو ان کی طرف از خود بڑھتے ہیں اور بار بار بڑھتے ہیں مگر اس روز اس کی قسمت نے کروٹ لی تھی ابا میاں شدید گرمی میں لاؤنج کے صوفے پر لیٹے تھے اور آنکھوں کی بند پتلیوں کو داہنے شہادت کی انگلی اور انگوٹھے سے ہولے ہولے دبا کر سہلا رہے تھے انہوں نے دتین بار ملازم کو آوازیں دی تھیں مگر شاید وہ اپنے کوارٹر میں تھا نانی ماں گھر سے باہر تھیں اور اس کی ماں تو کمرے سے نکلا ہی نہ کرتی وہ تو باہری دنیا سے اس قدر غافل تھیں کہ انہیں خبر ہی نہیں ہوتی تھی کہ گھر میں کیا چل رہا ہے..... ابا میاں کو شدید پیاس لگی تھی اور وہ اس قدر تھکے ہوئے تھے کہ ان میں اٹھ کر کچن سے پانی پینے کی سکت تک نہیں تھی.....

”شرف..... پانی لاؤ..... کہاں مر گئے ہو سارے، آخری بار انہوں نے خشک حلق کو تر کرتے قدرے چلا کر کہا تھا مگر کوئی نہیں آیا تھا مگر اتنا سا چلانے سے ہی ان کا حلق مزید سوکھ گیا تھا گرمی کی وجہ سے ان کا بی پی بہت گر گیا تھا انہیں اس وقت طوری طور پر گلوکز کی ضرورت تھی مگر انہیں تو پانی پلانے والا بھی کوئی نہیں تھا ان کی آنکھیں غنودگی سے بند ہو رہی تھیں وہ بلڈ شوگر کے مریض تھے اکثر ہی ان کا بلڈ شوگر لیول گرا رہتا ایسے میں ان کی آنکھیں انجانے وزن سے بند ہونے لگتی بی پی خطرناک حد تک گر جایا کرتا انہیں فوری طور پر کسی میٹھی چیز یا گلوکز کی ضرورت پڑا کرتی انہیں لگا وہ مر رہے ہیں ان کا آخری وقت بس قریب ہی تھا جبھی ان کے گھٹنے کو کسی نے بہت نرمی اور آہستگی سے چھوا تھا ان کی آنکھیں کھل نہیں پار ہی تھیں مگر

انہوں نے بنا جنش کے اپنے ہونٹوں کو ہلا کر پانی مانگا تھا۔

”نانا..... پانی“ چار سالہ وہ ننھی بچی فریح سے پانی کی بوتل نکال کر لائی تھی اس کے قد سے کچن کاؤنٹر کہیں اونچا تھا اسی لیے وہ گلاس نہیں اٹھا پانی گروہ پانی لے آئی تھی وہ بچی جس کی طرف وہ دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے تھے..... وہ بچی جو انہیں اپنی اور اپنی بیٹی کی دشمن محسوس ہوتی تھی وہ بچی جس کا بے ضرر وجود وہ اپنے گھر میں بمشکل تمام برداشت کیے ہوئے تھے جس کی بے ضرر ذات کو وہ نفرت و تحقیر کا نشانہ بنا کر اپنی انا کو تسکین پہنچایا کرتے تھے وہ بچی انہیں پانی پلا رہی تھی اس وقت جب انہیں محسوس ہوا کہ ان کی موت بس ہوا ہی چاہتی ہے کوئی اور وقت ہوتا تو شاید وہ قطعاً اس کے ہاتھ سے پانی لے کر نہ پیتے مگر اس وقت انہوں نے ساری بے زاری، بے اعتنائی و نفرت پرے دھکیلتے بوتل تھام کر پانی کے بڑے بڑے گھونٹ حلق کو تر کرنے کے لیے منہ میں انڈیلے تھے انہوں نے وہ ساری بوتل تین سانس میں خالی کرنے کے بعد باقی بچا پانی منہ اور گردن پر ڈال لیا تھا اور پھر بے دم ہو کے صوفے پر نائی کی ٹاٹ ڈھیلی کرتے لیٹ گئے تھے..... وہ ان کے پاس ہی کھڑی رہی تھی اور تفکر سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

”نانا..... آپ ٹھیک ہو، بہت دیر بعد اس نے ان سے پوچھا تھا وہ بہت حساس بچی تھی اور سمجھ دار بھی ابھی دو ماہ پہلے ہی اس نے مونہٹوری سکول جانا شروع کیا تھا اس نے اپنی ذہانت اور سمجھ داری سے اس بات کو محسوس کر لیا تھا کہ اس کے نانا کی طبیعت خراب ہو رہی ہے انہوں نے اس کے سوال پر نمبر، اس کے اندازِ مخاطب پر آنکھیں کھولی تھیں یہ لفظ اور یہ رشتہ ان کے لیے اسجانا نہیں تھا لیکن اس بچی کے پاس اس رشتے کا حق جتانے کی ضرورت ان کی طرف سے ابھی درکار نہیں تھی.....“

”دبا دوس“ وہ اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے ان کی پنڈلیوں کی طرف بڑھی اپنے پھول جیسے وجود کا سارا بوجھ ڈال کر وہ انہیں دبانے لگی انہوں نے سکون سے آنکھیں موند لی تھیں اس نے از خود ہی ان کے بغیر تسوں والے بوٹ اتارے تھے اس کا معصوم بے ضرر لمس ان کے وجود میں سکون بھرتا جا رہا تھا انہیں یوں لگ رہا تھا گویا کوئی ان کے منہ سے مے کے جام لگا رہا ہے ان کے اندر سکون ہی سکون تھا اطمینان ہی اطمینان فرحت بخش، دل آویز اطمینان.....

بے زاری، نفرت، بے اعتنائی غصہ کوئی دکھ اس وقت اس احساس پر حاوی نہیں ہو سکا تھا بس ایک احساس ان سب پر غالب تھا کہ اگر آج یہ بچی انہیں بروقت پانی نہ پلاتی تو شاید وہ مر چکے ہوتے پیاس کی شدت نے انہیں نڈھال کر دیا تھا وہ صحیح معنوں میں بے بس ہو گئے تھے.....

”بس کرو بیٹا..... تھک جاؤ گی“ پندرہ منٹ وہ انہیں مسلسل دبا رہی تھی اور وہ آنکھیں موندے لیے رہے تھے یکا یک انہیں احساس ہوا کہ وہ تھک گئی ہوگی وہ معصوم سی بچی انہیں اپنی ہمت و طاقت سے بڑھ کے دبا رہی تھی ان کے دل میں پہلے اس کے لیے ہمدردی کا جذبہ بیدار ہوا جو آنے والے دنوں میں محبت کے سوتے میں بدل گیا۔

”میں اچھی بچی ہوں میں نہیں تھکتی“ اس نے اپنے معصوم سے انداز میں شرما کر مسکرا کر کہا تھا اس کی آواز اور لہجہ بہت صاف اور دھیمہ تھا انہیں بے ساختہ اس پر پیار آیا۔

”اچھا..... کیا اچھے بچے تھکتے نہیں“ انہوں نے بس ویسے ہی پوچھ لیا تھا اس وقت انہیں اس بات کا احساس نہیں ہوسکا کہ انہیں اس کے جواب نے متاثر کیا تھا۔

”نہیں..... اس نے فوراً تردید کی تھی، نانی اماں کہتی ہیں جو بڑوں کا کہنا مانتے ہیں وہ ہمیشہ خوش رہتے ہیں وہ کبھی بیمار نہیں پرتے وہ کبھی نہیں تھکتے“ ان کے چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ آگئی تھی وہ اکثر اپنی نصف بہتر کے منہ سے سننے آرہے تھے کہ وہ بہت ذہین بچی ہے باتیں ہمیشہ یاد رکھتی ہے تبھی اچانک انہیں یاد آیا یہ بات تو سکول کا ہوم ورک کرواتے اس کی نانی اسے اکثر سمجھایا کرتی ہے۔

”آپ واقعی میں بہت اچھی بچی ہو“ انہوں نے اعتراف کرنے میں مزید تاخیر نہیں کی تھی کیونکہ پہلے ہی کافی تاخیر ہو چکی تھی..... اس کے بعد اس گھر کی فضا میں واضح طور پر تبدیلی آئی تھی اب نانی اماں کے ساتھ ساتھ نانا بھی اس کے لاڈ اٹھانے لگے تھے وہ ان کی فرمائش پر انہیں ابامیاں کہنے لگی تھی وہ ابامیاں کی چیمٹی تھی نانی کی لاڈلی تھی مگر ماں نے ساری زندگی اس کے وجود سے لاپرواہی برتی تھی وہ اپنے غموں میں اس قدر ابھی رہی ساری زندگی کہ اپنی عمر اریگاں کردی پھر اپنی بچی کی کیا پرواہ کرتی..... اس کے اندر ضد ہٹ دھرمی اور غصہ تھا مگر وہ صابر تھی اس میں اس قدر خوبیاں تھیں کہ اس کی خامیاں معنی ہی نہ رکھتی تھیں وہ ایک مثبت سوچ کی حامل ایثار پسند لڑکی تھی جو خود سے زیادہ دوسروں کی خوشی کا خیال کرتی تھی اور کیسی عجیب لڑکی تھی۔ کم از کم آج کے دور میں تو نایاب ہی تھی۔



اس کا پوائنٹ مس ہو گیا تھا..... بلیک جینز کی پاکٹ میں ہاتھ ڈال کر اس نے بٹوہ نکالا تو وہ خالی تھا..... اسے اپنے لاپرواہی پر جی بھر کر غصہ آیا والدت میں اے۔ ٹی۔ ایم اور کریڈٹ کارڈ رکھ کر وہ یہ بھول جاتا تھا کہ پاکستان میں ہر جگہ کریڈٹ کارڈ اور اے ٹی ایم کی سہولیات میسر نہیں ہیں کافی جگہ پر کیش کی ضرورت بھی ہوتی ہے..... اب وہ کسی ٹیکسی یا ریکشے کو نہیں روک سکتا تھا اور اس کا کالج اس کی کالونی سے بہت دور تھا..... وہ پریشان سا خود کو کھڑا کوس رہا تھا اس کے علاوہ وہ اور کربھی کیا کر سکتا تھا..... وہ کالج سے باہر نکل آیا فٹ پاتھ چکیلی دھوپ سے چمک رہی تھی مگر وہ اس ک تپش کا اندازہ دور سے ہی لگا سکتا تھا سو وہ کالج کے باہر جو کالج کیمپس زیادہ تھا برگد کے درخت یک پاس کھڑا ہو گیا تھا ابھی وہ اپنے کسی دوست کو فون کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اسے دور سے ایک لڑکی اپنی طرف آتی دکھائی دی تھی اسے کچھ امید بندھی..... وہ ایک سرو قد، نازک سراپے والی خوبصورت لڑکی تھی اس کے بال بے تحاشہ چمکدار اور کالے تھے سیاہ..... جسے اس نے ہلکی ڈھیلی پونی سے باندھ رکھا تھا..... وہ اسے دیکھ کر یکنخت مسکرایا..... یہ وہی لڑکی تھی جو بلاناغہ نواتر کے ساتھ اس کا واکن سننے آتی تھی مگر وہ اسے آج غور سے دیکھ رہا تھا بلاشبہ وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی۔

”کیا میں آپ کی کچھ مدد کر سکتی ہوں“ وہ خوبصورت چہرے پر مسکراہٹ سجائے بہت اچانکیت سے پوچھ رہی تھی دور سڑک پر اس کی گاڑی کھڑی تھی اور شاید وہ اسے یہاں کھڑا دیکھ کر ہی آئی تھی یوں جیسے وہ اس کی مجبوری سمجھ گئی ہو۔

”آپ میری کیا مدد کر سکتی ہیں“ اس کے سوال پر وہ سیدھا کھڑا ہو گیا تھا ابھی ان کے درمیان جان پہچان نہیں

تمہی وہ دونوں ایک دوسرے کا نام تک نہیں جانتے تھے پھر بھی وہ اس کی مدد کر رہی تھی اسی لیے اس نے اس سے پوچھا تھا وہ متانت سے اس کے سوال پر مسکرائی تھی۔

”آج شہر بھر میں ٹریفک کی ہڑتال ہے..... جو ہمارے کیسپس کے چند ایک پوائنٹس تھے وہ بھی کب کے کل گئے ہیں نے بھی گھر سے ڈرائیور کو بلوایا ہے..... اور شاید آپکا بھی پوائنٹ مس ہو گیا ہے اور کسی رکشے یا ٹیکسی کے منتظر ہیں میں اسی لیے یہاں آئی ہوں کہ اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو ڈراپ کر سکتی ہوں“ اس نے اپنی بات ختم کی تو اسے یاد آیا کہ وہ کب کہہ رہی ہے سڑک اس وقت غیر معمولی رش سے خالی تھی وہ کیش کے چکر میں اس قدر الجھا ہوا تھا کہ خالی سڑک کی طرف دھماکا ہی نہ کیا تھا اسے بے ساختہ اس لڑکی کی اچھائی دل کو بھائی.....

”جھینکس مس..... مگر ہو سکتا ہے میرا اور آپ کا روٹ الگ الگ ہو.....“ وہ نیم رضا مند سا تامل سے کہہ رہا تھا کیونکہ اگر شہر میں ہڑتال تھی تو پھر وہ شام تک کھڑا رہتا اسے کوئی سواری نہیں ملتی تھی۔

”اس کی فکر آپ بالکل بھی مت کریں مجھے اس سے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا..... اتنا کہہ کہ وہ فٹ پاتھ کی سمت بڑھ گئی تھی سوائے بھی اس کے پیچھے چلنا پڑا تھا۔“

”آپ والکن بہت اچھا بجاتے ہیں کہاں سے سیکھا آپ نے“ گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا تھا اس کی بات سن کے وہ دلکشی سے مسکرا دیا تھا۔

”والکن بجانا میرا شوق ہے اور میں نے اسے کہیں سے باقاعدہ نہیں سیکھا وہاں ابتدائی ٹریننگ فیوژن بینڈ سے کی تھی وہ بھی تھوڑی بہت..... زیادہ نہیں“ وہ بھی اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر مسکرایا تھا جس کے چہرے کی کوئلتا اسے بہت دلکش بنا رہی تھی۔

”مجھے والکن سننا بہت پسند ہے انفیکٹ آپ بہت اچھا بجاتے ہیں میں ہر روز سنتی ہوں آ کے جب آپ کینٹین کے پاس والے شیڈ کے نیچے بجاتے ہیں کیا یہ ساگ آپ کا بہت پسندیدہ ہے جسے آپ والکن پر بجاتے ہیں“

”جی..... مجھے یہ بہت زیادہ پسند ہے یہ ہے ہی اتنا اچھا اور جتنے بھی سنگرز نے وائٹ لائن بینڈ کے علاوہ نہ گایا ہے ان سب کے ورژن میرے پاس ہیں اور میڈونا نے بھی تو اس کو بہت اچھا گایا ہے کیا آپ کو یہ گانا پسند نہیں، وہ جو بہت غور سے اس کی بات سن رہی تھی یکدم چونگی اور پھر مسکرا دی“

”یہ گانا مجھے والکن پر بہت پسند ہے اب..... مجھے نہیں پتہ تھا کہ کوئی والکن اس قدر خوبصورت بجا سکتا ہے اور کوئی گانا اس قدر خوبصورت بھی ہو سکتا ہے پتہ نہیں اب اس میں کمال کس کا ہے والکن کا یا اس گانے کی شاعری کا.....“ وہ یہ نہیں کہہ سکی کہ والکن بجانے کا کمال بھی ہو سکتا ہے۔

”کیا آپ والکن سیکھیں گی“ اچانک ہی اس نے کسی انجانے خیال کے تحت پوچھا وہ خود بھی نہیں جان سکا کہ وہ ایسی آفر کیوں دے رہا ہے ابھی چند منٹ پہلے جس لڑکی سے اس کی شناسائی ہوئی ہے اور تاحال جس کا وہ نام بھی نہیں جان پایا وہ اسے والکن سکھانے کی پیش کش کیوں کر رہا تھا۔

”آپ مجھے سکھائیں گے“ وہ بھی اتنا ہی حیران ہوئی تھی..... کیا ایسا ممکن تھا کہ اسے اس شخص کے قریب رہنے کا موقع ملے..... وہ دم بخود ہو گئی جب اس نے سرکرا ثبات میں جنبش دی تھی۔

☆☆☆

وہ جلدی جلدی تیار ہو کے باہر نکل رہی تھی کہ اسے امی جان کی آواز نے رک جانے پر مجبور کر دیا تھا۔
 ”کہاں جا رہی ہو ام کلثوم..... کاندھے پر موجود بیک پراس کی گرفت مضبوط ہو گئی بے ساختہ اسے پلٹنا پڑا“
 ”ماڑہ کے گھرائی جان“ اسنے نگاہیں جھکا لیں تھیں مبادا آنکھوں میں تحریر غلط بیانی کی خواہاں پانہ لے.....
 ”ماڑہ کے ہاں تمہارے چکر بہت بڑھ گئے ہیں..... خیر تو ہے نا؟“ وہ اسے جانچ رہی تھیں کڑی نگاہوں سے..... ام کلثوم کی ہتھیلیاں پانی سے نم ہو گئیں۔

”سب خیر ہے امی جان..... بس آج کل امتحانات سے فارغ ہیں تو اس کی والدہ سلائی کڑھائی سکھا رہی ہیں میں بھی جا کر وہاں تھوڑا بہت سیکھ لیتی ہوں“ بروقت اسے بہانہ بالا خر سو جھ ہی گیا تھا۔
 ”تمہیں کب سے شوق ہو گیا ان سب چیزوں کا تمہیں تو یہ سب خرافات لگتی تھیں..... وہ ہلکا سا مسکرائی تھیں تو اس کی بھی جان میں جان آئی تھی۔“

”ماڑہ کی امی کہتی ہیں کہ لڑکیوں کے پاس ہر قسم کا ہنر ہونا چاہیے تاکہ وقت پڑنے پر انہیں کسی معجزے کا انتظار نہ کرنا پڑے وہ خود اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکیں وہ ماڑہ کے ساتھ ساتھ مجھے بھی سکھا دیتی ہیں..... وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے جھوٹ بول رہی تھی اور کس قدر مہارت سے بول رہی تھی بیٹی پر اندھا اعتماد رکھنے والی ماں کو اندازہ ہی نہیں ہو سکا کہ بیٹی کی آنکھوں میں دیدہ دلیری واضح دکھنے لگی ہے وہ کسی اور راہ کی مسافر بن گئی ہے جہاں سے ایک الگ مگرمی کا آغاز ہوتا ہے اور خس کا راستہ جھوٹ کی راہ سے گزرنے کے بعد ملتا ہے“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے ام کلثوم..... ماڑہ کی امی کا میری طرف سے بھی شکریہ ادا کرنا..... وہ بیٹی کو امور خانہ داری میں حصہ لیتا دیکھ کے آسودگی سے مسکرائی تھیں“

”جی..... جی ضرور امی جان.....“ ماں کو یقین دلاتی وہ تیزی سے باہر نکلی تھی، پاک ٹی ہاؤس پہنچتے پہنچتے اسے کافی دیر ہو گئی تھی اور شہمت زیدی اس کے انتظار میں کھڑکی سے باہر جھانک جھانک کر دیکھتے اب تھک گئے تھے..... اتنی دیر پہلے تو کبھی بھی ام کلثوم کو نہیں ہوئی تھی جتنی دیر اسے آج ہو گئی تھی..... اپنی بے چینی پر انہیں خود بھی حیرت ہوئی وہ کس قدر مضطرب ہو گئے تھے وہ بے ساختہ مسکرائے..... وہ تو خود کو بہت مضبوط سمجھتے تھے انہیں لگتا تھا کہ کوئی لڑکی انہیں متاثر نہیں کر سکتی مگر ان کی یہ بھول تھی ام کلثوم نے سیدھا ان کے دل پر وار کرتے انہیں گھائل کر دیا تھا بہت جلدی وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے۔

”کہاں رہ گئی تھیں ام کلثوم.....“ اسے پاک ٹی ہاؤس کے کشادہ مرکزی دروازے سے اندر داخل ہوتے دیکھ کر وہ بے چینی سے اس کی جانب بڑھے تھے ام کلثوم نے رک کر سانسوں کی ترتیب درست کی اور مسکرائی۔

”کچھ نہ پوچھیں..... آج تو آ می جان نے پوچھ لیا کہ کہاں جا رہی ہو..... بمشکل انہیں مطمئن کر کے آئی ہوں.....“ وہ پسینہ پونچھتے ہوئے بولی تو حشمت زیدی ٹھٹھک کر رک گئے

”ایسا کب تک چلے گا.....“ کچھ دیر بعد چائے کی پیالی اس کے سامنے رکھتے انہوں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا یہ سوال کمال حیرت کہ بہت جلدی ان دونوں کے درمیان آ گیا تھا ام کلثوم پانی پی رہی تھی اور پانی کا گھونٹ حلق سے اتارتے اس نے منہ کو بائیں ہاتھ کی پشت سے عادی صاف کیا۔

”مطلب“ اس نے گلاس سفید پتھر کی چوکور میز پر رکھ دیا اور ابرو اچکائے۔

”ام کلثوم..... کیا ہمارے درمیان ابھی کچھ کہنے سننے کو رہ گیا ہے..... مجھے تو یہ لگتا تھا کہ تم میرے جذبات کو نہ صرف سمجھتی ہو بلکہ ان کی قدر بھی کرتی ہو“ ان کے لہجے سے ان دیکھا سادھ جھلکنے لگا۔

”حشمت..... آپ کیا کہہ رہے ہیں..... جتنی محبت آپ مجھ سے کرتے ہیں میں اس سے کہیں زیادہ کرتی ہوں کیسے یقین دلاؤں آپ کو..... کیا دل کاٹ کے رکھ دوں اس میز پر آپ کے سامنے.....“ حشمت زیدہ کے دل پر پھواری برسی اقرار کا شمار ہی ایسا تھا اور ان کا بے ساختہ دل چاہا کہ سامنے براجمان کو کبھی زوال نہ ہو۔

”مجھے تمہارے خون جگر کے ٹکرے ٹکرے نہیں چاہئیں ام کلثوم..... مجھے تمہارا ساتھ چاہیے“ انہوں نے اچانک بالکل اچانک اپنے دل کی بات کہہ دی تھی۔ ام کلثوم کے گرد زندگی قوس و قزح کے رنگ برسانے لگی رنگوں کی بارش ہونے لگی جس میں پور پور وہ بھینکنے لگی تھی۔

”تو آپ کو ابھی بھی شک ہے کہ ہم ایک نہیں ہوں گے“ وہ محبت کے رنگوں میں بھینکنے کے بعد دلفریب انداز میں مسکرائی تھی۔

”مجھے اپنے نصیب سے ڈر لگتا ہے ٹومی..... میں تمہیں کھونے سے ڈرتا ہوں..... مجھے نہیں لگتا کہ تمہارے والدین مجھ جیسے کنگلے کا رشتہ قبول کریں گے اور وہ واقعی جھوٹ نہیں کہہ رہے تھے انہیں سچ میں یہ خوف دن رات ستائے رکھتا تھا کہ وہ کسی بھی لحاظ سے ام کلثوم کے خاندانی معیار پر پورا نہیں اترے تھے“ وہ لوگ خاندانی رئیس تھے اور اس کے والد ہائی کورٹ کے ایڈیشنل جج تھے روپے پیسے، نوکر چاکر اور دیگر مراعات کی ریل پیل تھی ام کلثوم بہت لاڈ اور ناز خڑے سے پلی بڑھی تھی انہیں ڈر تھا کہ کہیں ام کلثوم خود ہی انہیں چھوڑ نہ دے کیونکہ سوائے محبت کے ان کے پاس اس کے لیے کچھ قابل ذکر تھا بھی نہیں.....

”ایسا کیوں کہہ رہے ہیں آپ.....“ وہ تو جیسے ایک دم تڑپ اٹھی تھی مجھے یقین ہے ابا جان آپ کی قابلیت اور شہرت کو دیکھتے ہماری شادی پر راضی ہو جائیں گے اور پھر ان کے لیے میری خوشی زیادہ مقدم ہوگی میں انہیں منالوں گی اسے تو جیسے یقین کامل تھا اور وہ جسے اس کی سادگی پر مسکرائے تھے اس طرح جیسے کوئی بچے کی سادہ معصومیت بھری کسی بات پر مسکراتا ہے۔

”ایک معمولی لکھاری ان کی بیٹی کے شایان شان نہیں ہوگا ٹومی جان..... جو چاندی کے برتنوں میں کھانے کی

عادی ہو..... وہ کسی طور پر بھی میرے دل کے نہاں خانوں میں گڑی تمہاری محبت کے شجر نہیں دیکھیں گے ایسی بصارت سے وہ محروم ہوں گے جس سے محبت کو جانچا یا ناپا جائے..... ان کی نظر میں صرف دولت کا پیمانہ فٹ ہے..... اور کچھ ایسا غلط بھی نہیں ہے پیسہ اس زندگی کی تلخ اور کڑی سچائی ہے، وہ آزرہ سے کہتے دلگرفتہ تھے“

”ایسا کچھ نہیں ہوگا حشمت..... وہ میرے والد ہیں اور میری خوشی ان کے لیے اہم ہونی چاہیے میں کسی بھی طرح انہیں منالوں گی.....“ ام کلثوم خود بھی دل ہی دل میں پریشان ہو گئی تھی محبت کی جادوگری میں قدم رکھتے اس نے ان تلخ حقیقتوں سے پہلو تہی کیونکر برتی تھی وہ تو سمجھ ہی نہیں پائی اسے تو اندازہ ہی نہیں تھا کہ انہیں یہ مسائل بھی درپیش آ سکتے ہیں۔

”خدا کرے کہ تمہارا مان نہ ٹوٹے ٹومی جان..... مگر نہ مجھے تو دن رات چین و سکون نہیں ملتا.....“ یہ خیال ہی سوہان روح ہے کہ تم اگر مجھے نہ ملیں تو کیا ہوگا اور اگر سچ میں نہ ملیں تو مجھے نہیں لگتا کہ میں زندہ بھی رہ پاؤں گا اور میں سچ کہہ رہا ہوں ٹومی..... اگر مجھے تم نہ ملیں تو زندگی بالکل میرے لیے بے معنی ہو کے رہ جائے گی۔

”اللہ نے کرے حشمت..... آپ ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں اللہ آپ کو میری عمر بھی لگا دے..... میں آپ کے ساتھ ہوں اور وعدہ کرتی ہوں کہ آپ کا ساتھ کبھی کسی حال میں نہیں چھوڑوں گی..... چاہے جتنے بھی طوفان آئیں آپ ہمیشہ مجھے اپنے ہمقدم کھڑا پائیں گے آزما کے دیکھ لیں.....“ ام کلثوم جی جان سے ان پر فریفتہ حد درجہ جذباتی ہو رہی تھی۔ حشمت زیدی نے آنسوؤں سے مسکرا کر اس کے بھولے خوبصورت چہرے کو دیکھا وہ بہت جذباتی لڑکی تھی ذرا سی محبت ملنے پر دل و جان دارنے کو قربان ہو جانے والی پھر اب تو مقابل حشمت زیدی تھے جو ان کی زندگی تھے..... اسی لیے تو اتنا بڑا وعدہ کر رہی تھی..... پاک ٹی ہاؤس کی بلند اور روشن عمارت نے ام کلثوم کا دعویٰ سنا اور محفوظ کر لیا ٹی ہاؤس کی عمارت ہمیشہ کے لیے ان کی محبت کی گواہ بن گئی تھی۔



ملاقاتیں بڑھیں تو ایک دوسرے کے ساتھ کا اصرار اور وجاحت و خواہش بھی.....

ہر ملاقات ام کلثوم کی محبت میں اگر اضافہ کرتی تو اضافہ حشمت زیدی کے جنون میں بھی ہوتا..... بلاشبہ صحیح معنوں میں وہ ام کلثوم کی زلفوں کے اسیر ہوئے تھے وہ ایک ایسی ساحرہ تھی جس نے انہیں ہر طرح سے اپنے بس میں کر لیا تھا کہ وہ بے بس ہو کر رہ گئے تھے اس کے ساتھ کی چاہ کے علاوہ انہیں اپنی زندگی کا جیسے کوئی اور مقصد ہی نظر نہیں آتا تھا ام کلثوم کے زندگی میں آتے ہی ان کی زندگی کا نصب العین ہی بدل گیا تھا..... ہر چیز اپنے مقام پر تھی مگر پھر بھی سب کچھ بدل گیا تھا۔

علیم الدین اکثر انہی خیالوں میں گم بیٹھا دیکھ کر معنی خیز انداز میں کھنکھارتے..... حشمت زیدی چھپ کر مسودے پر جھک کر یکسوئی سے لکھنے کی کوشش کرنے لگتے..... ایک واضح تبدیلی جو ان کی تحریروں میں آئی تھی ان کی تحریروں میں پہلے سے زیادہ شدت، طوفانی جذبے اور رومان پیدا ہو گیا تھا..... وہ سراپا محبت بن گئے تھے محبت کی بارش میں جب وہ

پور پور بھیگے ان کے کردار سنسنی خیز اور ہیجان سے پر ہو گئے..... تحریر مہکتی لگی سب پڑھنے والوں کے دلوں میں جذبات و محبت کے حصول کے لیے سنگن کا جذبہ بیدار ہو کے بھڑکنے لگا۔

ان کی تحریر کا انتساب ام کلثوم کے نام ہونے لگا اور ام کلثوم محبت کی فضا میں تنہا بن کے اڑتی رہتی۔

”بتائیں ناں..... آپ کب ملنے آئیں گے ابا جان کو.....“ ام کلثوم اس روز ملنے آئیں تو زیادہ اصرار اسی بات پر تھا وہ اس کے بے تابی دیکھ کر مسکرا دیے اپنی جلد باز طبیعت کے پیش نظر وہ ہر کام وقت سے پہلے کر لینا چاہتی تھی صبر کا مادہ تو اس میں تھا ہی نہیں.....

”ابھی کچھ وقت دو جان..... خود کو تمہارے ابا جان کے سامنے لانے کے لائق تو بنالوں“

”کیا کی ہے آپ میں..... جو آپ ایسی باتیں سوچتے ہیں فضول میں خود کو پریشان کرنے کا فائدہ۔ حتیٰ فیصلہ تو میرا ہی ہو گا ناں، اس کا دوسرا بڑا مسئلہ بغیر سوچے سمجھے بولنا بھی تھا اور بلند و بانگ دعوے کرتے بھی وہی ہیں جو حقیقت کو سمجھتے نہ ہوں۔“

”اچھا..... وہ دل کھول کے منے..... اگر تمہارے ابا نہ مانے تو..... تم مجھ سے پھر بھی شادی کر لو گی کیا.....“ انہوں نے بس ویسے ہی اسے چھیڑنے کی غرض سے کہہ دیا تھا۔

”ہاں..... کر لوں گی“ ترنت جواب ملا تھا۔

”میرے حالات تمہارے ابا جیسے نہیں میں ایک سفید پوش بندہ ہوں جس کے پاس کوئی نوکری اور اپنا مکان تک نہیں..... اعزازے کی رقم پر گزارہ کرتا ہوں اور کرایے کے مکان میں رہتا ہوں.....“ انہوں نے سچائی بتائی مگر ام کلثوم ان حقائق سے پیچھے ہٹنے والی نہیں تھی اب..... وہ عشق کی راہ پر بہت آگے بڑھ چکی تھی۔

”میں گزارہ کر لوں گی اور ایک کمرے کے مکان میں بھی رہ لوں گی میرے لیے اہم صرف آپ کا ساتھ ہونا چاہیے۔ اس کا لہجہ رعب دار اور قطع تھا“

”بتائیں ناں..... کب بھیج رہے ہیں اپنے گھر والوں کو.....“ وہ بہت لاڈ سے ٹھنک کے پوچھ رہی تھی۔

”بہت جلد..... مگر اگر انہوں نے انکار کر دیا یا میرے ماں اور بھائی کو برا بھلا کہا تو..... وہ نکھاری تھی ان کا مشاہدہ سمجھ بوجھ انہیں احساس دلاتی تھی کہ معاملہ اتنا سیدھا ہرگز نہیں جتنا ام کلثوم اسے سمجھے ہوئے ہے اور یہ کوئی کہانی بھی نہیں تھی جہاں وہ فرضی واقعات اور معجزات کا سہارا لے پاتے..... حقیقی زندگی میں معجزات بہت کم ہوا کرتے ہیں اور وہ بھی دلیوں کے ساتھ ہی رونما ہوتے ہیں اگر ہوں بھی تو.....“

”کیوں ڈر رہے ہیں مجھے..... زندگی مجھے تو اپنی مرضی سے گزارنی ہے اور ابا میرے ساتھ کبھی برا نہیں ہونے دیں گے پہلے بھی تو نہیں ہونے دیا تھا.....“ ام کلثوم کے لہجے میں باپ کے لیے مان اور پیار تھا حشمت زیدی دل ہی دل میں ان کا مان سلامت رکھنے کی دعا کرنے لگے۔

”حاشو..... اماں نے جیسے ہی دروازہ کھولا تو سامنے حشمت زیدی کو خوشبوؤں میں مہکتا ہوا کھڑے دیکھا وہ بہت عرصے کے بعد وہاں آیا تھا غالباً یہی کوئی آٹھ نو ماہ پہلے وہ خالق کی شادی پر آیا تھا ماں اور بھائی نے ساری زندگی محنت کر کے تین دکانیں اور ایک چھوٹا سا مکان تعمیر کر لیا تھا حالات پہلے سے اچھے ہو گئے تھے لیکن انہوں نے کچی بستی کو نہیں چھوڑا تھا اور حشمت زیدی کو جی بھر کر کوفت ہوا کرتی وہ تو اب یہاں اس جگہ آنا پسند بھی نہیں کرتے تھے انہیں تو یہاں گندگی ہی گندگی نظر آتی تھی پورا علاقہ بدبودار محسوس ہوتا اپنی سانسیں متعفن زدہ محسوس ہوتیں“

”کیسی ہو ماں.....“ خالدہ نے اس کا سر ماتھا بہت محبت سے چوما تو حشمت زیدی کو بھی نحیف و زار ماں کی مامتا دل پر پڑتی محسوس ہوتی تھی انہوں نے بھی ماں کا حال احوال پوچھا تھا۔

”اب تجھے دیکھنے کے بعد بالکل بھلی چنگی ہو گئی ہوں“ وہ آنکھوں میں آنی نمی کو بے ساختہ چھلکاتے محبت سے چور لہجے میں بولیں حشمت زیدی کا دل یکدم اس ماحول سے کھڑے کھڑے مکدر ہو گیا..... اسے ماں کے آنسو ڈھکوسلے لگے۔

”بہت یاد کرتی ہوں اور تیرا انتظار تو دن رات رہتا ہے مجھے..... اور تو تو اب بہت بڑا آدمی بن گیا ہے حاشو..... ہر روز تیرا اخبار میں چھپا نوٹ دیکھتی ہوں.....“ حشمت زیدی کے لبوں پر ایک بے دم مسکراہٹ نے دم توڑا وہ مسکرا بھی نہیں سکے۔

”جب میں نے کہا تھا کہ میرے ساتھ چل کے رہو تو پھر آئی کیوں نہیں تھیں اماں.....“ بہت پرانا مگر جان لیوا شکوہ لبوں پر پھیل رہا تھا خالدہ بی بی نے سر جھٹکا وہ ابھی تک ان سے ناراض تھا خالق کی شادی کے بعد اس نے ماں کو اپنے ساتھ لے جانے کی بات کی تھی بلکہ عادت کے برخلاف خاصا اصرار بھی کیا تھا مگر انہوں نے ساتھ چلنے سے انکار کر دیا تھا ساری زندگی خالق نے ان کے ساتھ محنت کی تھی حاشو تو صرف اپنی تعلیم پوری کرنے میں جتا رہا تھا اور اب اس وقت جب خالق نئی زندگی کا آغاز کر رہا تھا تو ماں ہونے کے ناطے وہ اپنے بیٹے اور بہو کے کچھ لاڈ اٹھانا چاہتی تھیں سو انہوں نے قصداً اسے منع کر دیا تھا اور وہ ناراض ہو کے چلے گیا تھا اور اتنے عرصے کے بعد وہ آج آیا تھا..... ناراض اور روٹھا روٹھا سا۔

انہیں اس وجہ یہ نوجوان میں وہی بچپن کا معصوم غصیلا اور ضدی حاشو نظر آیا جو چھوٹی چھوٹی بات پر کئی کئی دن تک ان سے ناراض رہا کرتا تھا اور تب تک نہ مانتا جب تک اس کا اپنا غصہ ختم نہ ہو جاتا اور اس کا اپنی جی صلح کرنے کو نہ چاہتا تو..... اور آج وہ اتنے عرصے بعد آیا تھا تو وہ بھی اپنی مرضی سے.....

”آؤں گی تیرے پاس رہنے کو..... جب تو گھر میں بہو لے آئے گا تو.....“ ماں کے کہنے پر حاشو بے ساختہ مسکرا دیا بالکل ویسے جیسے بچپن میں ماں اسے پسندیدہ کھلونا دلانے کے بعد اس کے چہرے کی مسکراہٹ دیکھا کرتی تھی ام کلثوم کا خیال ہی ان کا موڈ خوشگوار کر گیا تھا۔

”تو پھر تیاری کر اماں..... تمہارا بیٹا بہت جلد بیاہ کر رہا ہے اور تمہاری بہو مکھن ملائی سے بنی ہوئی ہے اتنی خوبصورت ہے کہ چاند بھی بادلوں کی اوٹ سے اکثر اسے چھپ چھپ کے دیکھتا ہے شاید اسے بھی یہ ڈر ہے کہ ام کلثوم کو

دیکھنے کے بعد کہیں وہ خود پرنا کرنا چھوڑ نہ دے.....“ وہ بے ساختہ مسکرائے تھے اماں کو باقی استعاروں کی زبان تو کیا سمجھ آتی تھی وہ تو بس اتنا ہی جان پائیں کہ لڑکی کا ام کلثوم ہے اور وہ بہت حسین ہے۔

”اچھا تو اسکا نام ام کلثوم ہے..... بیٹے کے چہرے پر پھیلی مسرت دیکھ کر انہوں نے اسے چھیڑا تھا وہ تو ان کا بہت لاڈلی بیٹا تھا مگر اکثر ہی ان سے نالاں رہتا تھا مگر وہ اس کی ناراضگی اور بدگمانی کبھی دور بھی نہیں کر پائی تھی شاید انہیں سلیقہ ہی نہیں آتا تھا یا شاید حشمت زیدی ہی بہت مشکل انسان تھا“

”کب جاؤں تمہارا رشتہ مانگنے پھر.....“ وہ بیٹے کو محبت سے دیکھتے ہوئے چھیڑ رہی تھیں اسی اثناء میں خالق کی بیوی شربت کا جگ بنالائی تھی سانولی سلونی وہ ایک چھوٹے قد کی قدرے فربہ مائل عام سے نقوش کی مالک لڑکی تھی..... حشمت زیدی نے بے ساختہ ہی ام کلثوم کے ساتھ اپنی بھابھی کا موازنہ کیا..... ایک چودھویں کا چاند تھی جبکہ دوسری اماں کی رات..... خالق بھی عام نقوش کا چھوٹے قد کا مالک ہی تھا جبکہ حشمت زیدی قد کاٹھی اور اونچی اور مضبوط تھی..... انہیں بے ساختہ برتری کا احساس ہوا..... جو کہ کہیں نہ کہیں ہمیشہ سے ہی ان کے وجود میں رہتی تھی۔

”ابھی کچھ دن ٹھہر جاؤ اماں..... تمہاری بہو بہت اونچے شملے والی ہے ایسے کیسے چلیں ان کے گھر رشتہ مانگنے“ اماں نے تو بیٹے کی بات پر بے ساختہ دل پر ہاتھ رکھا تھا۔

”حاشو..... اتنے بڑے گھر کی لڑکی ہماری بہو بننے پر راضی ہو جائے گی بھلا.....“ انہیں حیرت سے زیادہ صدمہ ہوا تھا اپنی مالی حیثیت سے خوب واقفیت رکھتی تھیں وہ بھی.....

”وہ اگر بڑے گھر کی ہے تو تمہارا بیٹا بھی کسی سے کم نہیں ہے اماں..... مہینے کے ڈھائی سے تین سو کمالیتا ہوں ایک کہانی کے..... زیادہ لکھوں تو پانچ سات سو آسانی سے مل جایا کرتے ہیں“ انہیں ماں کی حیرت سے کبھی گئی بات برہم کر گئی تھی۔

”وہ تو ٹھیک ہے بیٹا..... مگر دنیا داری کے بھی تو کچھ تقاضے ہوتے ہیں کہ نہیں..... اور لڑکی کو چھوڑو اس کے والدین کو جو تسلی کرانی ہوگی ناں اور بڑے لوگ ہمیشہ اپنی بیٹیوں کو خود سے اونچے اور بڑے گھرانوں میں بیاہنا پسند کرتے ہیں اور میں یہ تو نہیں کہتی کہ تمہارے جیسے لڑکے کو وہ رشتہ نہیں دیں گے مگر بیٹا..... ان کے خاندان میں تو تمہارے سے زیادہ قابل لڑکے ہوں گے..... ماں نے دنیا دیکھی تھی ساری زندگی اس نے دنیا ریت رواج کی چکی میں پستے ہی تو گزاری تھی اس کا فہم اس کی سوچ ہر حال حشمت زیدی کے علم و مشاہدے سے زیادہ پختہ تھی حشمت زیدی وہاں سے بڑے بھاری دل کے ساتھ لوٹے..... ماں نے کڑوی سچائی کا ایک نیا وار کیا تھا ان کے لیے..... مگر یہ بھی طے تھا کہ انہیں ہار نہیں ماننی تھی نہ دنیا والوں سے نہ اپنے حالات سے..... انہیں ام کلثوم کو حاصل کرنا تھا کسی بھی حال میں..... اسی لیے تو انہوں نے وہ فول پروف پلان بنایا تھا تاکہ سانپ بھی مر جائے اور لاشی بھی نہ ٹوٹے“

☆☆☆

دوسرے ہی دن وہ اس کا شکریہ ادا کرنے آیا تھا..... وہ کیمسٹری کی کلاس لے کر نکل رہی تھی اسے سیڑھیوں کے

قریب کھڑے دیکھ کر بے ساختہ ٹھٹک کے رکی.....

”السلام علیکم کیسے ہیں آپ.....“ وہ بے ساختہ خود ہی اس کی طرف بڑھی تھی۔

”علیکم السلام..... میں ٹھیک ہوں کیا میں آپ کا تھوڑا وقت لے سکتا ہوں“ اس نے نہایت مودب سے انداز میں اس کی کول وزل چہرے کی طرف دیکھتے پوچھا تھا تو وہ بے ساختہ مسکرا کر رہ گئی تھی پھر اثبات میں سر ہلا کر اس کے ساتھ کینٹین والے ایریے کی طرف بڑھنے لگی تھی۔

”جی بتائیے..... کیوں ملنا چاہتے تھے آپ مجھ سے..... کینٹین کی کونے والی میز پر بیٹھے ہی اس نے پوچھا تھا اس وقت کینٹین میں غیر معمولی خاموشی تھی کیونکہ چٹھی کا وقت تھا اور سب اسٹوڈنٹس گھروں کو لوٹ رہے تھے“

”میں اصل میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا کل والی فیور کے لیے..... کل اگر آپ مجھے ڈراپ نہ کرتیں تو نجانے کیا ہوتا..... میرے انکل کی طبیعت اچانک بہت زیادہ خراب ہو گئی تھی..... کل جب میں گھر پہنچا تو وہ بے ہوش پڑے ہوئے تھے..... مگر صد شکر کے میں بروقت پہنچ گیا..... میں کل ساری رات آپ کے بارے میں سوچتا رہا اگر آپ اس وقت میری مدد کو نہ آتیں تو میں گھر کس قدر دیر سے پہنچتا اور نجانے اس وقت کیا..... خدا نخواستہ میرے منہ میں خاک..... گھبراہٹ کے مارے وہ بات مکمل نہیں کر پایا تھا“

”اُس اوکے..... آپ بالکل بھی پریشان نہ ہوں آپ کے انکل ٹھیک ہو جائیں گے اور میں نے آپ پر کوئی احسان نہیں کیا جو آپ میرا شکریہ ادا کر رہے ہیں میں نے جو کچھ بھی کیا وہ انسانیت کے ناطے میرا فرض تھا“ وہ مبہم سا مسکرائی تو اس نے اس کے گالوں میں پڑے ڈسپل کی گہرائی کو محبت سے دیکھا، پھر اس کی بے پناہ خوبصورت آنکھوں کو۔

”کیا ہم اچھے دوست بن سکتے ہیں.....“ اچانک ہی اس نے پوچھا تھا لڑکی مدہم سا مسکرائی۔

”میرے خیال سے تو ہم دوست بن چکے ہیں.....“ مسکراہٹ نے ابھی بھی اس کے چہرے کا احاطہ کر رکھا تھا ہونٹوں میں شرارت چمک رہی تھی۔

”میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں“ وہ جھج گیا تھا۔ مگر لڑکی بے ساختہ مسکرا دی تھی سب سے پہلے پوچھے جانے والا سوال وہ اب پوچھ رہا تھا۔

”میرا نام ارسلہ ہے.....“ لڑکی نے بالا خراپنا نام بتا ہی دیا تھا۔

☆☆☆

ان دونوں کے درمیان دوستی کا رشتہ بہت خوبصورتی سے پروان چڑھا تھا دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہو گئے تھے وہ اب بھی والکن بجاتا اور مد سادھے سانس روکے اب بھی سنتی مگر اب ایک فرق پیدا ہوا تھا وہ اب والکن صرف ارسلہ کیلئے بجاتا تھا۔

When I wake up everyday
with you lying in my arms

I wonder if i'm dreaming
 when I look into ur eyes
 I just can beleive its true
 That my heart belongs to you
 baby u can have it all
 Take my hend and let me lead the way
 All through your life
 I ill be ur side
 Till death do us part

وہ اکثر ہی ارسہ کو دیکھتے یہ مصرعے گنگنا نے لگتا..... ارسہ کو یقین ہو گیا کہ اس کی آواز کا صحر اس دنیا کی رنگینی و لطافت سے زیادہ خوبصورت ہے..... وہ صرف واکمن ہی اچھا نہیں بجاتا تھا وہ گانا بھی بہت اچھا گاتا تھا وہ حوا کی بیٹی تھی جو آدم کے بچھائے محبت کے جال میں ہمیشہ کی طرح پھنس رہی تھی..... مگر محبت کے دام میں الجھنے پر وہ بہت خوش مطمئن اور آسودہ تھی۔ محبت کا خوش رنگ جال ہوتا ہی اس قدر حسین اور مکمل ہے کہ دل خود بخود اس جال میں پھنسنے کو چاہنے لگتا ہے ارسہ بھی دام کی پکڑ میں آ کر خوش تھی..... پورے کیمپس میں وہ ہاٹ ٹاپک بن گئے اکثر سٹوڈنٹس تو ارسہ کا بے تابی سے اس کے واکمن سننے کے وقت سے ہی یہ جانتے تھے کہ ان دونوں کی باؤنڈنگ ہو جائے گی اب وہی سٹوڈنٹس اپنے اندازے کی درستگی پر شاداں و فرحاں تھے جنہوں نے شرطیں لگائی ہوئی تھیں وہ شرط جیتنے پر ٹریٹس مانگ رہے تھے مگر وہ دونوں اس بات سے بے نیاز بس ایک دوسرے کی سنگت میں محمور تھے ان کے لیے ایک دوسرے کی ذات اہم تھی ارسہ اس سے جو نیز تھی مگر اس کا آخری سال تھا ارسہ کو ابھی سے لگتا کیمپس جب وہ چلا گیا تب وہ کیا کرے گے..... اس کے بغیر اس کے واکمن کے بغیر اس کا دل اس کالج میں نہیں لگے گا اور پوری زندگی کی جدائی کا تو اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا ہر محبت کرنے والے کی طرح اسے بھی اپنے اور اس کے وصال کا جیسے یقین تھا اور یہ یقین تقدیر پر نہیں اسے اپنے محبت پر تھا جو وہ اس سے بے تحاشہ اور بے حد و حساب کرتی تھی ارسہ نے اپنے بارے میں اسے سب کچھ سچ بتا دیا تھا پہلی بار وہ اپنے دکھ کسی سے کہہ رہی تھی وہ تمام محرومیاں وہ تمام تشکیاں جو اس نے ابا میاں اور نانی اماں کی بے پناہ محبت کے باوجود بھی محسوس کی تھیں ماں کی بے رخی بے انتائی اور باپ کی کمی کا دکھ..... یہ سب پھوڑے کی مانند دکھتے دکھ..... اس نے پیپل کی گھنی شاخوں کے نیچے بیٹھ کر اسے کہہ سنائے تھے..... اپنے دکھ اسے سنا کر وہ روئی کے گالوں کی مانند ہلکی پھلکی ہو گئی تھی مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ مقابل اس کے دکھوں کا بار اٹھاپائے گا کہ نہیں وہ ایسی لڑکی کو اپنا سکے گا یا نہیں جس کا باپ اس کی ماں کو اس کی پیدائش سے بھی پہلے چھوڑ گیا تھا اور جس کی ماں نے بعد کی ساری زندگی نیم دیوانی حالت میں گزاری تھی اور اس کی پرورش اس کے نانا اور نانی نے کی تھی مگر اس کے باپ کے متعلق اسے کبھی کچھ نہیں بتایا گیا تھا ارسہ جانتی تھی یہ کوئی چھوٹی بات نہیں تھی یہ ایک

بہت بڑی بات تھی مگر اسے جیسے یہ امید سی تھی کہ وہ اس حقیقت کا بار اٹھالے گا اور امید والی جگہ اکثر خالی ہوا کرتی ہے مگر دنیا کے سارے نظام ممکنات اور ناممکنات پر ہی نکلے رہتے ہیں۔

☆☆☆

ام کلثوم یہ نہیں جانتی تھیں کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوا کرتے..... غلط بیانی کرتے سے اسے بھی خبر نہیں تھی کہ اس کا جھوٹ صرف ایک ڈیڑھ ماہ بعد ہی پکڑا جائے گا..... اس روز بہت دنوں کے بعد مائرہ کی امی ان سے ملنے کیلئے آئی تھیں..... مائرہ البتہ ساتھ نہیں تھی ورنہ وہ ہی شاید بات کو سنبھال لیتی..... باتوں ہی باتوں میں انہوں نے ام کلثوم کے بارے میں پوچھا تھا کہ کافی دن ہو گئے وہ ان کے گھر مائرہ سے ملنے نہیں آئی تھی تبھی ام کلثوم کی والدہ نے کسی قدر حیرت سے انہیں دیکھا تھا۔

”کیسی باتیں کر رہی ہیں..... وہ تو روز شام کو آپ سے سلامی کڑھائی سیکھنے کیلئے جاتی ہے.....“

”میری طرف“ مائرہ کی والدہ کو از حد اچنکھا ہوا تھا۔

”نہیں..... نہیں بہن..... آپ کو یقیناً غلط فہمی ہوئی ہے..... میری طرف آئے تو اسے بہت دن ہو گئے ہیں اور پھر میری تو نظر کا مسئلہ ہی بہت خراب ہے میری تو آنکھوں میں موتیا اتر آیا ہے میں تو سلامی کڑھائی کر ہی نہیں سکتی پھر سکھاؤں گی کیسے“ انہوں نے تفصیل سے بتاتے امی جان کو شرمندہ کرنے کیساتھ ساتھ از حد پریشان بھی کر دیا تھا جو ان اور خوبصورت بیٹی اگر جھوٹ بولنے لگے تو اس کے معنی و مطالب بہت واضح ہوتے ہیں کہ وہ کسی غلط یا قابل مذمت راہ گزر کی مسافر بن گئی ہے..... ان کے اندر بھی خدشات کے کالے ناگ پھن پھیلانے لگے وحشیتیں ان کے اندر بے راہ کرنے لگیں جیسے تیسے انہوں نے اس وقت بات کو سنبھالا دیا مگر رات کو وہ ام کلثوم کے کمرے میں بہت طیش کے عالم میں آئی تھیں..... وہ اس وقت ایس ٹی ڈی فون سیٹ اپنے کمرے میں چپکے سے لے آتی تھی اور رات گئے تک وہ حشمت زیدی سے باتوں میں مجبور ہا کرتی..... ابھی بھی وہ ان سے بات کر رہی تھی جبھی اس کی والدہ کمرے میں غیض و غضب کا نمونہ بنے داخل ہوئی تھیں.....

”جی امی..... آپ اس وقت خیریت؟“ اس نے ریسپور کے پسپکر پر ہاتھ رکھ کر آہستگی سے پوچھا تھا۔

”کس سے بات کر رہی ہو اس وقت“ انہوں نے کڑی نگاہوں سے دیکھتے اس سے سخت لہجے میں پوچھا تھا۔ ام

کلثوم گڑبگڑائی..... فی الفور کوئی بہانہ نہیں سوچا اسی لیے فوراً مائرہ کا نام جڑ دیا۔

”مائرہ ہے امی جان..... اس کی طبیعت خراب تھی تو اس نے مجھے فون کر دیا“

”اچھا..... امی جان کا لہجہ طنزیہ ہو گیا آج شام کو انہی کے گھر سے تو آئی ہو..... پھر اتنی جلدی اس کی یاد کیوں

آگئی وہ جتنا قی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں خیر..... مائرہ سے میری بھی بات کروادو..... میں بھی اس کی طبیعت کا پوچھ لوں ذرا.....“ وہ آگے بڑھ کر اس سے فون لینے کے لیے آئیں تو مارے گھبراہٹ کے ام کلثوم نے فون کریڈل پر منبج دیا تھا سب کچھ واضح ہوتا گیا امی جان نے بیٹی کو نظریں چراتے دیکھا تو انہوں نے کس کے ایک تھپڑ اس کے گال پر جڑا۔

”بے شرم..... ماں سے جھوٹ بولتے شرم نہیں آئی تھے..... کہاں کی رہ گئی تیری تربیت میں مورکھ“

”پلیز امی جان..... میری بات تو سنیں“ ام کلثوم خود کو ان کے تھپڑوں سے بچانے کی کوشش میں تھی مگر وہ غصے و طیش کے عالم میں اسے پیٹے جارہی تھیں ان کے اعتماد کا جو خون اس نے کیا تھا اس کا دکھ ساری زندگی کیلئے کم نہیں ہونے والا تھا۔

”کیا سنوں میں تمہاری..... کیا پھر کوئی نیا جھوٹ نیا کوئی ڈرامہ“ وہ غصے سے چلائیں ام کلثوم کا سر جھک گیا ماں کو دکھی کرنے کا اسکا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

”مجھے معاف کر دیں امی جان..... میں آپ کو سب کچھ سچ سچ بتانے ہی والی تھی.....“ ام کلثوم نے ان کے ہاتھ پکڑ لیے..... اب موقع آ گیا تھا اور چھپانے کا کوئی فائدہ تھا ہی نہیں اس کے نزدیک..... امی جان کے ہاتھ تھم گئے بیٹی کس سچائی کی بات کر رہی تھی ایسی کون سی حقیقت تھی جس پر سے وہ پردہ چاک کرنا چاہ رہی تھی جوانی کی دہلیز پر کھڑی اپنی بے حد حسین بیٹی پر اندھا اعتماد کر کے کیا انہوں نے کوئی غلطی کر دی تھی.....

”امی جان..... حشمت زیدی بہت اچھے انسان ہیں“ وہ ان کے پیروں میں آ کے بیٹھ گئی تھی۔

”آپ لوگ ان سے پلیز ایک دفعہ مل لیں..... پلیز امی جان.....“ امی جان تو جوان و خوبصورت بیٹی کے منہ سے ایک غیر مرد کا نام سن کر ہی ساکت رہ گئی تھیں کجا اس کا وکالت کرنا..... وہ لوگ جتنے بھی آزاد خیال سہی مگر بہت اقدار والے لوگ تھے ان کے گھرانے کے بھی کچھ اصول تھے اور اپنے اصول و روایات میں وہ لوگ بہت کڑے تھے مگر وہ اپنی ہی دھن میں بول رہی تھی۔

”امی جان..... مجھے دولت کا انبار نہیں چاہیے..... مجھے زندگی میں صرف دلی خوشی اور اطمینان چاہیے اور وہ صرف مجھے حشمت دے سکتے ہیں“

”تم جانتی ہو ام کلثوم..... تم کیا کہہ رہی ہو تمہارے ابا کو پتا چل گیا تو کس قدر برگشتہ ہوں گے وہ تم پر..... تم نے تو ہماری ساری زندگی کی بنی بنائی مٹی میں رول دی..... وہ تو کچھ کہنے کے قابل ہی نہ رہی تھیں بڑی مشکل سے اتنا بول پائی تھیں“

”پلیز امی..... میں مرجاؤں گی حشمت زیدی کے بغیر..... امی آپ اس سے ایک دفعہ مل کر تو دیکھیں..... وہ اس قدر خوبصورت دل کا مالک انسان ہیں امی کہ ان کی گفتگو کے دوران پھول جھڑتے ہیں وہ اس قدر تہذیب یافتہ اور سلجھے ہوئے ہیں کہ اس دنیا کے محسوس ہی نہیں ہوتے..... اس قدر محبت و احترام سے بات کرتے ہیں کہ.....“

”جتنا عزت دار انسان وہ ہے..... اسکا اندازہ مجھے تمہاری ان باتوں کو سن کے اچھی طرح سے ہو رہا ہے ام کلثوم..... ایک شخص جو اس قدر عزت دار و شریف ہے جو کسی بھی لڑکی کو محبت کے دام میں پھنسا کے والدین کے سامنے محبت کی جنگ لڑنے کو کھڑا کر دیتا ہے وہ بہت عزت دار اور مہذب ہے ام کلثوم..... وہ واقعی میں بہت با کردار اور شریف انسان ہے.....“ ان کے طفر پر ام کلثوم کا سر جھک گیا وہ بتا نہیں سکی کہ اس میں تصور حشمت زیدی کا نہیں خود اس کے اپنے دل کا ہے جو

انہیں پہلی نظر دیکھ کر ہی بے اختیار ہو گیا تھا۔

”امی جان..... وہ کوئی عام انسان نہیں ہے بہت سلجھے ہوئے انسان اور نامور شخصیت ہے ان کی..... ان کی تحریروں میں معاشرے کے لیے سکون اور لوگوں کے لیے جو درد ہے وہ کسی میں نظر آنا بہت مشکل ہے خصوصاً آج کے دور میں جب سب کو اپنی اپنی پڑی رہتی ہے ان کی تحریر ان کی سوچ اور دل کی عکاسی کرتی ہے..... کیونکہ ان کے اپنے دل میں درد ہے احساس ہے اسی لیے وہ تحریر میں بھی نظر آتا ہے“

”ام کلثوم..... کسی شخص کو پہچاننے کیلئے ضروری نہیں کہ ہر دفعہ اس کی سوچ کے پیمانے سے جانچا جائے کبھی کبھی عمل سے پہچانا بھی زیادہ ضروری ہو جاتا ہے..... اسکا کردار..... خاندانی پس منظر مالی حیثیت سب باتیں دیکھنی پڑتی ہیں..... اور میرا نہیں خیال وہ کسی بھی لحاظ سے ہمارے خاندان، وقار اور حیثیت سے میل کھاتا ہو..... اس لیے اس بات کو دل سے نکال دو تمہارے ابا کبھی نہیں مانیں گے“

”امی جان.....“ ام کلثوم کو لگا اس کی گردن پر کسی نے برچھی رکھ کر بے دردی سے چلا دی ہو۔
 ”ایسا مت کہیں امی جان..... حشمت زیدی میری زندگی بن گئے ہیں“ بے ساختہ وہ تڑپ اٹھی امی جان نے بیٹی کی تڑپ کو دیکھا اور محسوس کیا ان کی اپنی لاڈلی، پیاری بیٹی کسی کی خاطر رو رہی تھی اور وہ کسی کوئی اونہیں ایک بے حد عام سالکھاری تھا جس کا معاشرے میں مالی لحاظ سے کوئی مقام نہیں تھا نہ ہی ایسی قابل فخر شجرہ نسب..... جو کسی بھی لحاظ سے ان کے ہم پلہ ہوتا اور بیٹی محبت کر بیٹھی تھی۔

”اتنی خود سری اچھی نہیں ہوتی ام کلثوم..... تم تو میری بہت فرمانبردار اور اچھی بیٹی تھیں.....“ مسز حسینہ انوار نے خود کو لمحوں میں بوڑھا محسوس کیا تھا جن ماؤں کی بیٹیاں خود سر ہو جاتیں وہ یونہی بوڑھی ہو جایا کرتی ہیں لمحوں میں صدیوں کا سفر طے کر لیتی ہیں وہ غموں کی داواؤں کے منہ کو جامد خاموشی کے قفل لگا لیتی ہیں..... آہ یہ مائیں بھی کس قدر مجبور ہوتی ہیں مسز حسینہ انوار بھی مجبور ہو گئی تھیں بیٹی کے آنسو دیکھ کر..... مگر وہ اپنے مجازی خد سے بھی بہت ڈرتی تھیں جو بے حد سخت مزاج کے نہیں تھے نہ ہی انہوں نے کبھی بچوں پر زندگی تنگ کی تھی مگر اس کے باوجود بھی وہ کھلاؤ سونے کا نوالہ اور دیکھو شیر کی نگاہ والے مقولے پر سختی سے عمل پیرا رہنے والے انسان تھے اپنے اصولوں میں سخت اور قطعی.....

”امی جان پلیز..... میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں..... مجھ سے میرے خواب نہ چھینیں..... میں زندگی میں اور کبھی کچھ نہیں مانگوں کی حشمت کے ساتھ کے سوا.....“ وہ ان کے قدموں میں کسی داسی کی مانند بیٹھی تھی متورم آنکھیں..... سرک ناک کپکپاتے ہوئے..... وہ ان کی بیٹی تو نہیں تھی وہ تو محبت کی پجارت تھی جو دیوتا کے جزیبوں میں برسوں سے بیٹھی معلوم ہو رہی تھی ان کا دل گزار ہو کر پھیلا ماما کا دل تھا ناں..... بالآخر انہیں کہنا پڑا نہ کہیں تو قیامت آ جاتی اور انہیں قیامت سے بڑا ڈر لگتا تھا قیامت آ جائے تو ہر چیز تہس نہس ہو جایا کرتی ہے اور اگر بیٹی ضد پکڑ کر کھڑی ہو جائے تو وہ قیامت سے بھی بڑی قیامت ہوتی ہے جس میں نسلوں کا غرور اور فخر نیست و نابود ہو جایا کرتا ہے..... لہذا وہ بھی ڈر گئی تھیں بیٹی کی جوانی اور رو پہلے عشق سے خوف زدہ ہو گئی تھیں انہوں نے ہار مان لی تھی شکست تسلیم کر لی تھی انہوں نے بیٹی کا ساتھ دینے کا

فیصلہ کر لیا تھا۔

”میں بات کروں گی تمہارے ابا جان سے..... انہیں قائل کرنے کی بھی پوری کوشش کروں گی آگے جو تمہارا نصیب..... مگر پھر تم مجھے مجبور نہیں کرو گی“ انہوں نے اس کے آنسو صاف کرتے اسے وعدے کی ڈور میں باندھنے کی کوشش کی، وہ توڑنے آئی تھیں اس سے..... اسے اس کی غلطی کا احساس دلانے کیا خبر تھی کہ واپسی پر..... بیٹی کی محبت کی راز دارہ امین بن ک یلونا پڑے گا ایک ماں ہونے کے ناطے بیٹی کی عزت اور اپنے خاندان کی عزت بچانے کے لیے وہ اس کے علاوہ کیا کر سکتی تھیں۔

☆☆☆

اب کیا ہوگا..... یہ وہ سوالیہ نشان تھا جن سے ہمیشہ ہی محبت کرنے والے خوف کھاتے ہیں محبت لکھنا اس کی باتیں کرنا آسان جبکہ محبت کرنا اس کے مسائل بھگتنا کہیں زیادہ مشکل امر تھا شہمت زیدی کیلئے..... کیا کریں کیا نہ کریں کے درمیان پنڈولیم کی مانند جھولتے وہ دونوں ٹھنڈی آہیں بھرتے ہوئے آنے والے وقت پر کسی غیر مرنی نقطے کی طرح لگا ہیں جمائے دبیز خاموش کی لہر میں چھپی محبت کی سسکیاں..... پورے ماحول کو بوجھل کیے ہوئے تھیں الفاظ دم توڑ گئے تھے ہمت جواب دے رہے تھی اور سانس..... بھی رک رک کر آنے لگی تھی جدائی کا سوچا بھی نہیں جا رہا تھا کجا جدا ہو کر زندگی بتانا..... اس عفریت نما سوال پر ہی دل بند ہو جائے سانس تھم جائے..... ام کلثوم تو لگتا تھا جیتے جی مر گئی ہے شہمت زیدی نے خود کو سنبھالتے ہوئے اس کی دگرگوں حالت کو پریشانی کی نظر سے دیکھا..... تسلی و تسفی کے روایتی الفاظ جوام کلثوم کا حوصلہ بندھا پاتے ان کی ڈکٹری میں ناپید ہو گئے..... انہوں نے خود کو اس وقت خالی ذہن اور خالی دل محسوس کیا بہت کرہناک لمحہ تھا وہ..... ام کلثوم کی آنکھوں میں تیرتے گلابی ڈورے دیکھنا اور برداشت کرنا..... وہ بے بسی سے بیٹھی لب کاٹ رہی تھی.....

”بس کر دو ٹومی..... اور کتنا روؤ گی تم..... بالآخر ان کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو وہ اسے ٹوک بیٹھے“

”مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے شہمت..... اگر ابا جان نہ مانیں تو“ خوفناک اثر دھے ان کے لہجے میں پھنک رہے

تھے۔

”تمہیں اپنی محبت پر یقین ہے نا تو..... ادھر دیکھو میری طرف، انہوں نے اس کے جھکے چہرے کو ٹھوڑی سے

پکڑ کر اٹھایا اور پھر اپنا سوال دہرایا ام کلثوم نے روتی نظر دیکھ کر سرکرا ثبات میں جھنک دی۔“

”تو بس پھر بے فکر رہے کوئی ہمیں جدا نہیں کر سکتا انہوں نے اس کا بے حد سفید گلابی ناخنوں والا ہاتھ اپنے

چوڑے بھاری گداز ہاتھوں میں لے کر دبا یا“

”نہیں شہمت..... ابا جان نہیں مانیں گے..... میں ان کی ضد کو اچھے سے جانتی ہوں اگر وہ ایک بار انکار کر دیں

تو پھر دنیا بدل جائے وہ اپنا فیصلہ نہیں بدلتے.....“ ام کلثوم ان کے جذبات سے مزین گداز ہاتھوں کی حدت سے بھی مطمئن

نہیں ہو پائی اس کے اپنے خدشات تھے اور کچھ غلط بھی نہیں تھے۔

”اچھا سوچو ثوابان..... خود کو ٹینشن سے کیا حاصل..... ایسے مسئلے مسائل ختم تو نہیں ہوں گے.....“ وہ اپنی پریشانی چھپاتے اسے تسلی دے رہے تھے مگر ام کلثوم سنبھلی تو خاک النامزید بکھر گئی پھوٹ پھوٹ کے روتے وہ اظہار کی تمام حدیں پار کر گئی۔

”میں نہیں رہ سکتی آپ کے بغیر حشمت..... مر جاؤں گی میں اور میں ایسا محاورہ نہیں کہہ رہی ہوں وہ بے دم ہو کے چلائی حشمت زیدی نے سر جھٹکا پل صراط پہ کھڑے انہوں نے خود کو دار پہ چڑھنے کی اذیت میں گھر محسوس کیا۔“

”ابا جان نے صاف صاف انکار کر دیا ہے..... وہ سسکی اسے امید بھی کہاں تھی کہ ایک کہانی پڑھ کے بیٹی کی زندگی کا فیصلہ بدلنے والا شخص اس کی بیٹی کی مرضی سی شادی کرنے کے خلاف ہو جائے گا“

”میں ملوں جا کر تمہارے ابا جان سے..... شاید میں انہیں یقین دلا سکوں کہ میں تمہارا ہر طرح سے خیال رکھوں گا اور تمہیں ہمیشہ خوش رکھنے کی کوشش کرتا رہوں گا کم از کم انہیں مجھ سے مل کر اندازہ تو ہو جائے گا اور شاید فیصلہ ہمارے حق میں ہو ام کلثوم نے ان کی اس بات پر انہیں چونک کے دیکھا اور بے ساختہ اپنے آنسو پونچھے امید کا جگنو ان کے آس پاس جگمگایا..... حشمت زیدی ان کے ابا جان کو سمجھا سکتے تھے قائل کر سکتے تھے اس کے اندر سکون اتر آیا“

”اور اگر وہ پھر بھی نہ مانے تو..... مگر اس کا اضطراب وقتی کم ہوا تھا مکمل طور پر نہیں تھی دوبارہ پوچھنے لگی“

”میں اپنی پوری کوشش کروں گا اور اگر میں پھر بھی ناکام رہا تو..... پھر بھی میرا یہ وعدہ ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت ہمیں جدا نہیں کر پائے گی اور تم نے ہمیشہ میرا ساتھ دینے کا فیصلہ کر رکھا ہے..... تمہیں یاد ہے ناں.....“ اس نے بے ساختہ سر ہلا کر تائید کی تو وہ مسکرا دیے۔

”آؤ میرے ساتھ..... انہوں نے اچانک ہی اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا تھا..... ام کلثوم جو آج بہت مشکل سے ایک آخری بار ان سے ملنے آئی تھی ان کے ساتھ گھسٹتی چلی گئی وہ انہیں کہہ نہیں پائی کہ اسے دیر ہو جائے گی امی جان کی خالہ کے گھر واپسی سے پہلے اسے واپس جانا ہے لیکن حشمت زیدی نے ان کی ایک نہیں سنی تھی وہ اسے کورٹ لے جا رہے تھے۔“



وہ اپنے باپ کی عدالت میں سر جھکائے کھڑی تھی مگر وہ نام نہیں تھی اور شرمندہ تو بالکل بھی نہیں انہوں نے اسے سرتاپہ ایک غصیلی نگاہ سے دیکھا تھا اور لب بھیج لیے تھے وہ ان کی کس قدر پیاری اور لاڈلی بیٹی تھی انہوں نے تو کبھی خواب میں بھی گمان نہیں کیا تھا کہ وہ یوں ان کی توقعات کو چکنا چور کر دے گی۔

”کیا کر رہی تھیں تم کچہری میں.....“ انہوں نے دبنگ لہجے میں پوچھا تھا..... ان کے نشی نے ام کلثوم کو وہاں ایک لڑکے کے ساتھ دیکھا تھا جو اکثر ہی ان کے گھر آتا رہتا تھا اس نے ہی پہچان کر اطلاع دی تھی ام کلثوم محبت میں سرخروئی کے چکر میں باپ کی پگڑی کو سر بازار رول آئی تھی حشمت زیدی نے صرف اپنے اندر کے احساس کتری اور ٹھکرائے جانے کے خوف سے اتنا بڑا قدم اٹھایا تھا انکار کی سہی جانے والی ذلت سے بچنے کو انہوں نے پہلے ہی ایسا قدم اٹھا

کے اپنے تئیں انگار کے سارے جواز مسترد کر دیے تھے جگر ایسا کرنے سے وہ اپنی عزت تو بچا گئے تھے مگر اپنی محبت کو سربازار
نیلام کر دیا تھا یہ محبت نہیں ان کا گھٹیا پن تھا محبت کو رسوا نہیں کیا جاتا اسے امر کیا جاتا ہے اور جن سے محبت کی جاتی ہے اس کی
عزت و آبرو کو اپنی عزت و آبرو ہی سمجھا جانا چاہیے اور ان کے بڑوں کی عزت کو یوں پامال نہیں کرتے..... یہ بات ام کلثوم
کے علاوہ سبھی نے سمجھ لی تھی..... ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ ان کے گھر کی عزت یوں پکھری میں جائے ان کی بڑی بیٹی بتول
نے لاء پڑھنے کی خواہش کا اظہار کیا تو مسٹر انوار نے اسے پہلے ہی وضاحت کر دی تھی۔

لاء پڑھنا تمہارا شوق ہے ضرور پڑھو مگر یہ بات ذہن میں رکھنا کہ میں تمہیں پرنیکس کی اجازت ہرگز نہیں دوں گا..... وہ بہت روایتی سوچ کے حامل شخص تھے عزت دار اور نام والے اونچا حسب نسب رکھنے والے خاندانی نواب تھے بہو بیٹیوں کو چار دیواری میں رکھنے والے گو کہ ان پر کوئی دباؤ یا روک ٹوک نہیں تھا مگر پھر بھی ان کے خاندان کی کچھ حدود و قیود تھیں جن کو کاٹنا وہ کسی طور بھی پسند کرتے تھے نہ ہی اس کی اجازت دیتے تھے..... اور اب ان کی بیٹی ام کلثوم کچہری میں کیا گل کھلا آئی تھی..... ساری زندگی کی بنی بنائی و لہجوں میں خاستر گر گئی تھی وہ سر اٹھا کر چلنے کی قابل بھی نہیں رہے تھے ان کا جی چاہا وہ کھڑے کھڑے اس کے وجود پر مٹی کا تیل ڈال کر اسے آگ لگا دیں تاکہ کچھ تو ان کے جلنے دل کو سکون مل سکے

”بولو..... جواب دو..... کیا کر رہی تھیں اس دو نکلے کے لکھاری کے ساتھ.....“ وہ اس کے سر پہ آ کے گرے تھے امل کلثوم دہل سہی گئی اس کے باپ کا غصہ تو زمانے میں مشہور تھا جانے وہ کیسے بھول گئی نجانے اسے اس وقت ہوا کیا تھا جو وہ بد ہوشی حشمت زیدی کے ساتھ چھپتی چلی گئی تھی۔

”اباجان..... وہ..... وہ مگر نہ اس سے جواب بن پڑا نہ ہی زبان نے ساتھ دیا کچھ مہلت بھی نہ ملی اباجان نے پوری طاقت سے اس کے پھول جیسے گال پر تھپڑ رسید کیا تھا اس کا نازک وجود اس تھپڑ کی افزیت سبہ نہیں پایا جس کی وجہ سے وہ دور صوفے کے نزدیک نیچے جا گری تھی“

”یہ دن دکھانے کو تجھے پال پوس کر جوان کیا تھا میں نے تمہیں کہ تم اٹھو اور میرے چہرے پر کالک پوت دو.....“ ان کے لہجے میں اپنے ٹوتے ہوئے مان کی کرچیاں تھیں ایک باپ کا مان ٹوٹا تھا ایک عزت دار شریف اور مہذب انسان کی گپڑی اچھلی تھی، بہت بدنصیب ہے تو ام کلثوم..... تو بہت بد بخت ہے..... تم نے خود اپنے ساتھ جو کیا سو کیا کم سے کم مجھے تو زمانے میں جینے کا جھوڑا ہوتا..... وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگے تھے مسز حسینہ انوار ان کے نزدیک آئی تھیں ام کلثوم کی طرف انہوں نے دیکھنا بھی پسند نہیں کیا تھا انہوں نے اپنے مجازی خدا کے کندھے پر تسلی آمیز دلاسہ دینے کو ہاتھ کھادو اور کھڑے گئے

”اے کہو حسینہ..... کہ یہاں سے چلی جائے..... میں اس کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتا کاش مجھ میں اتنی ہمت ہوتی کہ اس کا گلا گھونٹ سکتا.....“ ام کلثوم سن پر گئی اس کے تو سان و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اتنی جلدی سب کو خبر ہو جائے گی اور اس فعل کا ایسا گھٹا و نا انجام ہو گا وہ تو بس حشمت زیدی کی نظروں میں سرخروئی کی آرزو مند تھی یہ تو بھول ہی

گئی کہ یہاں تک پال پوس کر بڑے کرنے والے باپ کے ساتھ وہ کیا کر رہی ہے اور کاش وہ جان پاتی وہ کبھی بھی ایسا قدم نہ اٹھاتی مگر اب اس کے لیے ساری راہیں بند ہو چکی تھیں وہ معتبہ ٹھہرائی جا چکی تھی اس کا جرم سنگین تھا اور اسے بھی سزا دی جانی تھی۔

”بات ابھی تک آپ کے دوست وکیل اور آپ کے درمیان ہی ہے انوار..... ابھی بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے“
 ”نہیں..... ہرگز نہیں..... میں مزید اپنا تماشائ نہیں لگوانا چاہتا اسے کہو جس کے ساتھ منہ کالا کیا ہے اسے ابھی کے ابھی اس کے پاس چلی جائے میرے لیے یہ مرجئی ہے خاندان بھر میں منادی کرادو کہ یہ مرجئی ہے.....“ اتنا کہہ کے وہ اٹھ کے اپنے کمرے میں چلے گئے تھے مسز حسینہ بھی اپنے شوہر کے پیچھے چلی گئیں وہ اکیلی گم صم حالت میں زمین پر بیٹھی رہ گئی..... کچھ ہی دیر میں اس کا بہنوئی اور بہن بھی آگئے تھے کسی نے نہ اس کی طرف دیکھا نہ کلام کیا..... لمحوں میں اسے اپنے اوقات پتہ چل گئی..... بند کمرے میں جانے کیا میٹنگ ہوئی اسے خبر نہیں اسے وہاں بیٹھے بیٹھے دوپہر سے رات ہو گئی وہ بھوکی پیاسی وہیں بیٹھی رہی ہاں اسے اپنی غلطی کا ادراک ضرور ہو گیا تھا کچھ دیر بعد اس کی بہن اس کے پاس آئی تھی اس کو خشمگیں نگاہوں سے گھورتے ہوئے..... آج اس کی آنکھوں میں بھی اس کے لیے نفرت تھی۔

”بلاؤ اپنے شوہر کو..... ابا جان سے آ کے ملے..... اور رخصتی کی تاریخ لے جائے ویسے تو تم دونوں کو شاید اپنے بڑوں کی ضرورت نہیں ہے مگر ہمیں تو اپنی عزت بچانی ہے جو کہ تمہارے معاشقے کی وجہ سے بچی تو پہلے بھی نہیں مگر..... بچی کبھی عزت کا جنازہ نکالنے کیلئے اس سے پہلے کہ تم مزید کوئی سامان کرو..... تمہارا اس گھر سے عزت سے چلے جانا ہی بہتر ہے.....“

”آپی..... آپی پلیز میری بات تو سنیں مجھے کچھ کہنے کا موقع تو دیں پلیز..... وہ اٹھ کر ان کے ہاتھ تھام کر بولی مگر بتول آپ نے اس کے ہاتھ جھٹک دیے اس نے بھی خاموشی اختیار کر لی جو کچھ وہ کر چکی تھی اسے اچھے سے ادراک ہو گیا تھا کہ اب اس کی اس گھر میں کوئی جگہ نہیں بچی..... اس نے ایک غلط قدم اٹھایا تھا مگر اب مزید کوئی غلطی نہیں دہرانا چاہتی تھی سو اس نے شمت زیدی کو فون کر کے ساری صورتحال کہہ سنائی تھی وہ تو پہلے سے ہی تیار بیٹھا تھا فوراً چلا آیا..... پہلی بار وہ اپنے سسرال آ رہا تھا بے حد شان و شوکت سے کھڑی ان کی حویلی میں قدم رکھتے وہ تقاریر سے مسکرائے آج وہ اس قابل تھے کہ سرائے کے چل سکتے کیونکہ آج اس گھر کے مکیمنوں کی نظریں ان کے لیے جھکی ہوئی تھیں اور انہوں نے اسی دن کیلئے تو اتنا بڑا کھیل کھیلا تھا..... محبت اپنی جگہ مگر محبت میں وہ ذلیل ہونے کے قائل بالکل بھی نہیں تھے..... انہوں نے ہمیشہ ہی امیروں کو غریب لوگوں کو من کی عزت نفس روندتے دیکھا تھا وہ محبت کے ہاتھوں ان امیروں کو من کے پیروں میں نہیں لوٹنا چاہتے تھے ان کی خودداری، اناء اور عزت نفس انہیں اس بات کی اجازت نہیں دیتی تھی ان کی خود غرضی انہیں ہمیشہ اپنے لیے اچھا سوچنے کی ترغیب دیتی رہی تھی اسی لیے وہ خود کو ہمیشہ سرفہرست رکھتے سرفہرست گنا کرتے۔ وہ ڈرائنگ روم میں بڑی شان کے ساتھ ٹانگ پر ٹانگ جمائے سگار سلگا کے بیٹھے تھے وہ کورین سگار تھا جو چند دن پہلے ان کے کسی فین نے انہیں بھجوا یا تھا اور جس کا ذائقہ انہیں بہت پسند آیا تھا آج کل اکثر ہی پیتے رہتے اور آج تو سگار پینے کا انہیں جس قدر لطف

آ رہا تھا پہلے کبھی نہیں آیا..... انہوں نے شہر کے معزز ترین شخصیت ایڈیشنل جج مسٹر انوار حسین کو دیکھا..... جو لچوں میں بوڑھے اور کمزور ہو چکے تھے لمحے بھر کو حشمت زیدی کو ان پر ترس آیا مگر وہ مجبور تھے کیونکہ انوار حسین کو حشمت زیدی پر ترس نہیں آتا تھا..... ام کلثوم انہیں پل پل کی خبر دیا کرتی تھی کس قدر ہنک آمیز اور قابل نفرت لہجہ ہوتا تھا ان کے لیے انوار حسین کا..... وہ اس ک نام لینا بھی گوارا نہیں کرتے تھے وہ اسے دو نکلے کا لکھاری کہا کرتے تھے اور آج وہی دو نکلے کا لکھاری..... ان کے سامنے نظر اور سر اٹھا کر فخر سے بیٹھا تھا.....“

”جو حرکت تم نے کی ہے برخودار..... وہ کسی شریف خاندان کے اطوار میں شامل نہیں ہوتی تمہاری اس حرکت نے تمہاری اوقات کو واضح کر دیا ہے..... بہر حال..... جو تم نے ہمارے ساتھ کیا ہماری بیٹی کو ورغلا کے..... اس کے لیے ہم تمہیں معاف نہیں کر سکتے مگر اپنی عزت بچانے کیلئے ہم تمہیں اپنی بیٹی کو رخصت کر کے ضرور دیں گے اب..... حشمت زیدی کے منہ پر زور دار طمانچہ پڑا تھا وہ جو یہ سمجھ کر آئے تھے کہ انہوں نے اپنی اس حرکت سے اپنی سسرال کو اپنے سامنے زیر کر لیا ہے تو وہ غلط تھے اس کے سسرال والے زخمی حصے کو ناسور بنا کر ساتھ لے کر چلنے والوں میں سے نہیں تھے بلکہ اس زخمی حصے کو کاٹ کر جسم سے علیحدہ کرنے والوں میں سے تھے“

”مجھے کو چار معزز لوگوں کو لے کر آ جانا اگر خاندان میں وہ موجود ہوں تو..... ہم تمہیں رخصتی کر دیں گے اور ہاں جہیز کے نام پر ام کلثوم کو یہاں سے ایک تنکا بھی نہیں ملے گا تم اتنا تو کما ہی سکتے ہو کہ اسے بہترین معیار زندگی فراہم کر سکو..... انہوں نے بس نہیں کی تھی بلکہ ان پر جو توں کی بوچھاڑ کر دی تھی وہ لال بھبھو کا چہرہ لیے وہاں سے اٹھ آئے تھے جس متوقع ہنک، بے عزتی سے انہوں نے بچنے کی کوشش کی تھی وہ ہو کر ہی رہی تھی حشمت زیدی کے دل میں اپنی سسرال والوں کے لیے ایک گرہ سی پڑ گئی آغاز زندگی کچھ اچھے انداز میں نہیں ہوا تھا ان کی جانب سے مگر وہ یہ بھول گئے تھے کہ پہل ان کی طرف سے ہوئی ہے اور وہ بھی کچھ اچھے انداز میں نہیں ہوئی تھی..... انہوں نے اچانک ہی ماں کو کچھ پیسے دے کر ایک سونے کی انگوٹھی اور چار جوڑے دو جوڑے خریدنے کو کہا تھا..... اگر ام کلثوم کو جہیز مل رہا ہوتا شاید وہ یہ تردد بھی نہ کرتے مگر اب وہ ان لوگوں کی طرح بھوکے ننگے طریقے سے اپنی بیوی کو گھر نہیں لاسکتے تھے..... یہ ان کی غیرت پر تازیانہ تھا..... ماں اور بھائی اس اچانک کی شادی پر حیران رہ گئے تھے مگر کچھ بھی پوچھنے کی جرات انہیں حشمت زیدی کے قطعی رویے نے نہیں دی تھی..... ویسے بھی وہ اب بڑے لوگوں میں اٹھتا بیٹھتا تھا اور بڑے لوگ کیسے شادیاں کرتے ہیں یا ان کے کیسی ریتی رواج تھے اس کی خبر بہر حال وہ نہیں رکھتے تھے موصدا خاموش ہو گئے تھے اس کی ماں اور بھائی بازار جا کے بری خرید لائے تھے عام سی سرخ رنگ کی فلیٹ تھی جس کے ساتھ سرخ رنگ کا گونا گوا ڈوپٹہ تھا جو ام کلثوم کا عروسی لباس تھا ساتھ بے حد عام سے بلکے میٹرل والی ہیل کی سنہری جوتی..... جس کی ایڑی ہاتھ لگاتے ہی ہلٹی محسوس ہوتی تھی اور ام کلثوم کو ڈر تھا اگر وہ ذرا زور سے زمین پر پاؤں رکھے گے تو وہ یقیناً ٹوٹ جائے گی سستا سا تیز رنگوں والا میک اپ تھا“

”یہ لائی ہے تمہاری سسرال تمہاری بری..... کیا تم یہی سب ڈیزور کرتی تھیں ٹومی“

”بتول آپ کو دکھ ہوا تھا کلیوں جیسی نازک اور دلشین ان کی بہن مقدر کے معاملے میں بہت کم رو ثابت ہوئی“

تھی اور اس میں زیادہ غلطی ان کی اپنی بہن کی تھی ام کلثوم کچھ نہیں بولیں خامش ہو رہی جانتی تھی کہ اس کا دیا جواب بحث کو جنم دے گا اور وہ کسی بحث میں نہیں پڑنا چاہتی تھی وہ خوبصورت تھی اور بے حد حسین بھی اسی لیے توفلیٹ کے عام سے ستے سوٹ اور گولے کناری والے دوپٹے میں بھی نظر لگنے کی حد تک حسین لگ رہی تھی..... بارات میں مسٹر انوار کے حسبِ منشا شہر کے معزز ترین لوگ شامل تھے ان کے خاندان سے کوئی شامل نہیں ہوا تھا اور صرف خالق اس کی بیوی اور اس کی ماں تھے..... بارات کا انتظام ہوٹل میں کیا گیا تھا اور اس ہوٹل کا انتظام وانصرام دیکھ کر خالدہ بی بی اور خالق کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے تھے کہ اتنی ڈشیں تھیں کہ وہ کچھ بھی پیٹ بھر کے نہیں کھا پائے تھے انہیں حشمت زیدی کے نصیب پر رشک آیا تھا وہ اپنے بیٹے کو بڑا آدمی بنا دیکھنا چاہتی تھی اور وہ آج بن گیا تھا..... شہر بھر کے معروف ادیب و شعرا آج کے علاوہ ان کے دوست احباب کی لمبی فہرست تھی..... کچھ نہ کچھ بھرم انوار حسین کا بالآخر حشمت نے ان کا رکھ ہی لیا تھا بھلے اس اقدام کے پیچھے اس ہتک کا عنصر شامل تھا جو اس کے سر نے اس کی کی تھی..... رخصتی کے وقت ام کلثوم باپ کے گھٹنوں کو چھو کر معافی مانگ کے روئی تھی وہ آخر باپ تھے..... اور جانتے تھے کہ ام کلثوم سے غلطی ہوئی ہے اور اگر انہیں کسی بھی لحاظ سے حشمت زیدی اپنی بیٹی کے قابل لگتا تو وہ اپنے ہاتھوں سے اسے بیٹی بیاہ دیتے..... انہوں نے اس کے بارے میں پتہ نہ کروایا تھا مکمل چھان بین..... اسکا غلی بیک گراؤنڈ اسکا رہن سہن اس کی اٹھک بیٹھک..... وہ ایک متکبر اور خود غرض شخص تھا وہ کسی بھی لحاظ سے انہیں انسانیت کے درجے پر فائز محسوس نہیں ہوا تھا ورنہ وہ خود ہی ام کلثوم کا رشتہ حشمت زیدی کے ساتھ کر دیتے..... ان کی بیٹی آگ میں کودنے کی خواہش کر رہی تھی وہ کیسے اسے خود دھکا دے دیتے اور جب اولاد خود دوسر ہو جائے تو والدین انہیں ان کی غلطی کا احساس دلانے کو سزا دیا ہی کرتے ہیں تبھی بچے ان کی غلطی دہرانے کو سوچتے بھی نہیں ہیں..... انہوں نے ام کلثوم کو اس گھر سے بے شک خالی ہاتھ رخصت کیا تھا مگر پھر بھی انہوں نے اپنی بیوی کو بیس ہزار کا چیک لکھ کر چلتے سے ام کلثوم کو دینے کو کہا تھا..... مگر ام کلثوم نے وہ چیک لینے سے انکار کر دیا تھا“

”مجھے ان پیسوں کی نہیں معافی کی ضرورت ہے امی جان..... آپ لوگ میری اس غلطی کی مجھے معافی دے دیں مجھے اور کچھ بھی نہیں چاہیے..... وہ ماں کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی“

”بغیر کہے ہی وہ جانتی تھی کہ اس گھر سے نانا اس کا ہمیشہ کیلئے ٹوٹ رہا ہے مگر وہ خود کو مضبوط کیے آگے کا سوچ رہی تھی اس نے خود سے عہد کیا تھا کہ گھر بسا کر دکھائے گی..... اور جب وہ اپنے گھر میں خوش و خرم زندگی بسر کرے گی تو کبھی نہ کبھی اس کے والدین بھی اسے معاف کر دیں گے اور وہ ان لوگوں سے دوبارہ ملنے بھی لگے گی..... اس کی بہن کو تو اس پر اتنا غصہ آیا تھا کہ رخصتی کے وقت وہ اس کے قریب بھی نہ پہنچی تھی شاید وہ ایسا نہ کرتی اگر اس کا شوہر اور ساس قریب نہ کھڑے ہوتے اس کی ساس تو ام کلثوم کو اپنے بھانجے کے لیے مانگ رہی تھیں اور اب جب سے انہیں اپنے بیٹے کی زبانی ام کلثوم کی حرکت کے بارے میں علم ہوا تھا وہ اٹھتے بیٹھتے خدا کا شکر ادا کرتے نہ تھکتی تھیں جس نے انہیں ام کلثوم جیسی بدطیعت و بدکردار لڑکی کے چنگل میں پھنسنے سے بچا لیا تھا..... بتول کو یہ سب سن کر کس قدر سبکی و ہتک محسوس ہوتی اس کا اندازہ سوائے اس کے اور کوئی بھی نہیں کر سکتا تھا“



وہ بازار میں دکانوں کے اوپر بنا ایک کمرہ کچن اور چھوٹے سے برآمدے پر مشتمل اسکا گھر تھا جس میں اسے بیاہ کر لایا گیا تھا..... گھر میں کسی بھی قسم کی آرائش نہیں کی گئی تھی..... اس کے واحد اور اکلوتے کمرے و بیڈروم میں اسے لاکر بٹھایا گیا تھا ام کلثوم نے گھونگٹ اٹھا کر پورے کمرے کو ایک طائرانہ نگاہ سے دیکھا..... جس میں فرنیچر کے نام پہ اونچے پایوں والی مسبری ایک رائٹنگ ٹیبل چیر اور دو کرسی اور میز تھے..... سامنے کی دیوار والی کھڑکی بازار کی طرف کھلتی تھی جس پر کوئی پردہ نہیں لگا تھا..... کھڑکی سے اندر آتا ٹریفک اور لوگوں کا بے ہنگم شور ان کے کان کے پردے پھاڑ رہا تھا مگر وہ خود پر ضبط کیے بیٹھی رہی تھی اس کے لیے کمرہ بھی نہیں سجایا گیا تھا اس کی آمد کے ایک گھنٹے بعد حشمت زیدی کے چند دوستوں نے آکر ٹیبل پر کچھ فروٹس، کیک کے علاوہ گلاب کے پھولوں کی لڑیاں بھی لاکھی تھیں..... ام کلثوم کے دل میں حشمت زیدی کے لیے شکوہ نہیں تھا کہ اس کے استقبال کے لیے کچھ اہتمام نہیں کیا مگر پھر بھی اگر وہ ایسا کرتا تو ام کلثوم کو اس عزت و تکریم پر بہت زیادہ خوشی محسوس ہوتی جیسے کہ اس وقت ہو رہی تھی اس کی ساس اسے اٹھا کر باربرآمدے میں لے گئی تھیں اور حشمت کے دوست اندر کمرہ سجانے لگ گئے تھے خالدہ بی بی اپنی بے حد حسین بہو کو نرم نرم نگاہوں سے دیکھتی خوش ہو رہی تھیں وہ واقعی میں چاند سے بھی زیادہ خوبصورت تھی پھر بے ساختہ انہوں نے دوپٹے کے پلو سے دس روپے نکال کر اس کے سر پر سے وارے اور مٹھی میں کسی ضرورت مند کو دینے کیلئے دبوچ لیے تھے۔

”سدا سہاگن رہے..... دودھونہاؤ پوتوں پھلو“ انہوں نے اسے بے ساختہ دعا دی تھی ام کلثوم بے ساختہ مسکرائی ”جانتی ہے حاشو نے جب تیرے بارے میں مجھے بتایا تو اس نے کیا کہا..... اس نے کہا تھا اماں..... تیری بہو کو چاند بھی دیکھنے سے شرماتا ہے کیونکہ وہ چاند سے بھی زیادہ پیاری ہے اور اس نے کس قدر رچ کہا تھا..... بس اللہ تم دونوں کی جوڑی سلامت رکھے..... وہ اپنے سادہ انداز بیان میں تعریف کرتی اور دعائیں دیتیں ام کلثوم کو بہت اچھی لگی تھیں چلو کوئی تو تھا جو ان کی نئی زندگی کے لیے دعا گو تھا..... ورنہ جو اس نے اپنے والدین کا دل دکھا کے کیا تھا ایسے میں اسے امید نہیں تھی کہ وہ لوگ اسے دل سے معاف کر دیں گے..... اس کے دل پر بھاری بوجھ تھا وہ تو صحیح طرح سے خوش بھی نہ ہو پا رہی تھی..... کاش وہ اس وقت نہ بہکتی تو آج وہ کس قدر آسودہ طریقے سے بہت دھوم دھام سے حشمت زیدی کی زندگی میں داخل ہوتی“

”لو بیٹا..... کچھ کھا لو..... اس کی ساس کچھ دیر بعد اس کے لیے کھانا لے کر آئی تھی ام کلثوم نے حیرت سے دیکھا شادی والے روز وہ اپنے گھر میں پہلے ہی ان حشمت کے بغیر کھانا نہیں کھانا چاہتی تھی“

”رہنے دیجیے خالہ..... مجھے بھوک نہیں ہے“ اس نے نہایت آہستگی سے دھیمے پڑتے لہجے میں کہا تھا خالدہ بی بی بمشکل سن پائیں وہ نہیں جانتی تھیں کہ وہ دھیمے لہجے میں بات کرنے کی عادی ہے۔

”اچھا ٹھیک ہے..... میں رکھ دیتی ہوں رات میں جب بھوک لگے تو کھالینا..... ٹھیک ہے بیٹا..... ان کی پیار بھری تائید و تاکید پر وہ محض سر ہلا کے رہ گئی تھی.....“ ستمبر کا آخر تھا مگر گرمی ابھی بھی پوری طرح پڑتی تھی..... دو گھنٹے بعد

حشمت زیدی کے دوست کمرہ سیٹ کر کے نکلے تو اسے اندر لایا گیا حشمت زیدی کے دیرینہ دوست جسے سب لوگ پیار سے مفتی صاحب کہتے تھے کمرہ کرائے پر لائے تھے انہوں نے ہی ان دونوں کی کچھ تصاویر اکٹھی اتاری تھیں ورنہ تو شاید ان کی شادی کا کوئی ثبوت کوئی یادگار نشانی ان کے پاس نہیں ہونی تھی چلتے سے مفتی صاحب نے اپنی بھابی کو پانچ روپے سلامی دی تھی اس وقت کے پانچ روپے آج کے پانچ سو کے برابر سمجھے جاتے تھے ام کلثوم کو پہلی بار کسی نے سرال میں سلامی دی تھی اور اہ اتنی کم تھی کہ ام کلثوم کو لیتے ہوئے شرم محسوس ہوتی تھی..... رات گئے کمرہ خالی ہوا تو اسے آرام کرنے کا موقع ملا..... مارے حجاب کے وہ کہہ نہ سکی کہ بیٹھے بیٹھے اس کی کمر تختہ ہو چکی ہے..... حشمت زیدی اسے پلنگ پر بٹھا کے خود اس کے بالکل سامنے کرسی پر آ بیٹھے..... ام کلثوم کی ایک سرسری سی نگاہ حشمت زیدی پر پڑی جو آج مکمل موڈ میں پورے استحقاق کے ساتھ اسے دیکھ رہے تھے ام کلثوم کے اندر شہنشاہی بیٹھے پانیوں کے جھرنے بہنے لگے جنگل میں موروں کا ناچ شروع ہو گیا..... کوئل ان کے ملن کے گیت گانے لگ گئی تھی دونوں ایک دوسرے کی قربت میں مدھوش ہو رہے تھے جہی حشمت زیدی نے بات چیت دی تھی انہوں نے ام کلثوم کے نازک سپید گلابی ناخنوں والے ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی پہنائی جو وزن میں قدرے ہلکی تھی مگر ڈیزائن خوبصورت تھا۔

”میں اس طرح سے میں تمہیں اپنی زندگی میں شامل نہیں کرنا چاہتا تھا تو ماجان..... مگر تم جانتی ہوناں اگر میں یہ سب نہ کرتا تو ہمارا ملن ناممکن ہو جاتا اور یہ مجھے کسی بھی طور گوارا نہیں تھا..... اور میں جانتا ہوں کہ تم بھی میرے بغیر زندہ نہ رہ پاتیں“ وہ اس کا ہاتھ تھامے بہت نرمی سے کہہ رہے تھے ام کلثوم نے ہلکے سے سر کو اثبات میں جنبش دی۔

”مگر میں تمہارے والدین سے سخت مایوس ہوا ہوں..... انہیں کم از کم تمہارے ساتھ ایسا ظلم نہیں کرنا چاہیے تھا..... بخدا مجھے تو تمہارے علاوہ اور کچھ نہیں چاہیے زندگی میں..... مگر تم تو آسائشات کی عادی تھیں انہیں تمہارا تو سوچنا ہی چاہیے تھا..... انہوں نے تو تمہیں خالی ہاتھ رخصت کر کے بالکل ہی بے وقعت کر دیا.....“ ام کلثوم کی آنکھیں ڈبڈبائیں سر مارے شرمندگی کے ناچا پتے ہوئے بھی جھک گیا۔

”غلطی تو ہم نے بھی کی ہے ناں حشمت“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بمشکل بول پائیں

”یہ غلطی نہیں ہمارا شرعی حق تھا تو ماجان..... جو ہم نے استعمال کیا ہے تم اس بارے میں مزید کچھ مت سوچو..... سوائے اس کہ کہ ہماری محبت سچی تھی کہ ہم ہزار کھٹائی کے بعد بھی ایک ہو گئے اور اب تم سر حشمت زیدی بن گئی ہو سو ان سب لوگوں سے جنہوں نے تمہارے ساتھ کوئی ناروا سلوک کیا ہے یا تمہارا دل دکھایا ہے تو ایسے ہی پیش آنا جیسے ایک نامور معروف ادیب کی بیوی کو آنا چاہیے..... آخر کو ہزاروں چاہنے والیوں میں سے تمہیں ہی یہ منصب نصیب ہوا ہے“ وہ شرارت و تکبر کے ملے جلے تاثرات سے کہہ رہے تھے ام کلثوم کے لبوں پر ایک بے دم مسکراہٹ نے آ کے دم توڑ دیا

”اور میں نہیں چاہوں گا کہ میری بیوی..... میری بیوی یہ خاصا زور دے کے“ اب اس جگہ جائے جہاں سے اسے نہایت بے عزت کر کے نکالا گیا ہے بھلے وہ تمہارا میکسی ہے مگر اب تمہاری عزت میری اور میری عزت تمہاری ہوگی ہے ناں تو ماجان، بہر حال تم پر کوئی روک ٹوک یا دباؤ نہیں ہوگا مگر تم بھی مجھے مجبور نہیں کرو گی..... ام کلثوم محض سر ہلا کے

رہ گئی..... شادی کی پہلی رات جب وہ پہلے ہی ذہنی دباؤ میں تھی ایسی باتیں..... اسے سمجھ نہیں آئی کہ کیا جواب دے..... بہر حال اس نے تائید کر لی تھی اور اسی میں اس کی بھلائی بھی تھی.....

☆☆☆

ساری رات وہ بے چین رہی..... کھلی کھڑکی سے ساری رات ٹریفک کا بے ہنگم شور اس کے کان کے پردے پھاڑتا رہا..... اسے بے اختیار اپنا پرسکون و پرآسائش کمرہ یاد آیا..... بس کل رات ہی کی تو بات تھی وہ اے سی آن کر کے مکمل طور پر مصنوعی سردی کا ماحول بنا کر کمبل اوڑھ کے دن چڑھے تک سوئی رہتی تھی اور آج کی رات وہ یہاں تھی یہاں اس چھوٹے سے کمرے میں جس کی کھڑکی کی چوڑی سلاخیں لکڑی کی بڑی کھڑکی سے محروم تھی اور پردے سے بھی..... ام کلثوم کو سخت کوفت ہوئی اگر مسینے کی کھڑکی ہوتی تو شاید اس بے ہنگم شور سے کچھ جان چھوٹ جاتی صبح وہ جلدی ہی اٹھ گئی جبکہ حشمت زیدی تو بڑے مزے سے سو رہے تھے..... ام کلثوم نے خود کو اس نئی زندگی اور اس میں درپیش آنے والے مسائل کے لیے خود کو تیار کرنے کی کوشش کی تھی..... اسے محل سے اٹھ کر اس ایک کمرے کے مکان میں آنے کا کوئی افسوس نہیں تھا..... نہ ہی اسے یہاں کے مسائل سے کوئی مسئلہ تھا اسے بس دکھ تھا کہ اس کی جذباتیت اور جلد بازی کی وجہ سے اس کے والدین اس سے ناراض ہو گئے تھے اور اسے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس کے والدین کبھی اس سے راضی بھی ہوں گے کہ نہیں

اس نے بے خبر سوئے ہوئے حشمت کی گھنی پلکوں والی آنکھوں کو دیکھا جو گہری نیند میں ہونے کے باوجود بھی ہولے ہولے لرز رہی تھیں..... ام کلثوم کو ان کی آنکھوں پر بے ساختہ پیار آیا..... ان کی ذہانت سے بھرپور بے حد خوبصورت آنکھیں تھیں اس قدر پرکشش اور سحر زدہ کہ ام کلثوم ڈوب ڈوب جاتی بہت دیر ان کی طرف دیکھتے اور آنکھوں کے راستے دل میں سوتے رہنے کے بعد وہ غسل کے لیے اٹھی تھی ہاتھ روم کا حال بھی کم دیش و سیاہ تھا مگر ام کلثوم نے اسے استعمال کیا۔

”آہستہ آہستہ وہ سب کچھ ٹھیک کرے گی..... ویسے بھی حشمت تو مرد ہیں انہیں کیا پتہ کہ گھر کو کیسے سنوارا جاتا ہے یہ تو خالصتاً عورتوں کے کام ہوتے ہیں.....“ اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بال بناتے مسکراتے ہوئے سوچا تھا..... تھوڑی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی تو ام کلثوم کو حشمت کو جگانا ہی پڑا..... مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوئے تھے۔

”حشمت اٹھیے پلیز..... دروازے پر دستک ہو رہی ہے دیکھیں ناں جا کر کہ کون آیا ہے؟“

”خود ہی دیکھ لو جا کر یار..... مجھے تو سونے دو..... اتنی دنوں کی تھکاوٹ ہے“ وہ کروٹ بدل کر پھر سو گئے تو ناچار ام کلثوم کو ہی دروازہ کھولنا پڑ گیا تھا..... اسے تو بالکل ایک فی صدی بھی امید نہیں تھی اسے حیرت ہوئی تھی دیکھ کر کہ اس کے میکے سے اس کے لیے ناشتہ بھیجا گیا تھا بتول آپنی اور اس کی دوست مارہ تھے۔

”السلام علیکم آپنی.....“ ام کلثوم نے ہی سلام میں پہل کی تھی ورنہ بتول آپنی تو اس کے بھیکے بھیکے روپ کو دیکھنے میں اتنی مگن تھیں کہ حال احوال پوچھنے کا تو خیال ہی نہیں آیا..... وہ بے حد سادہ سے سائٹن کے سوٹ میں اس قدر دلکش و

حسین لگ رہی تھی کہ نظریں بٹانا مشکل ہو رہا تھا بتول آپنی نے بے ساختہ اسے گلے لگا کر پیار اور دعا دی..... جو بے وقوفی وہ اپنی جذباتیت کے ہاتھوں کر چکی تھی اب ضرور نہیں تھا کہ وہ ساری زندگی اس پاداش میں معتبہ ٹھہرائی جاتی۔

”میرا خیال ہے تم اکیلی ہو یہاں پر..... تمہاری ساس اور باقی سسرال والے کہاں ہیں“ ڈرائیور برآمدے میں رکھی تپائی پرناشتے کے ڈھیر دو لوازمات رکھ گیا تھا حشمت کمرے میں سو رہے تھے تھانا چارام کلثوم کو ان لوگوں کو برآمدے میں بٹھانا پڑا تھا.....

”وہ لوگ تو رات کو ہی چلے گئے تھے آپنی..... ابھی شاید آنے والے ہوں اور حشمت ابھی سو رہے ہیں میں جگاتی ہوں انہیں.....“ وہ فوراً ہی اٹھ گئی تھی اندر آ کر حشمت کو جگانے کے لیے تو وہ پہلے سے ہی جاگ رہے تھے اور سگریٹ پی رہے تھے ام کلثوم کو اچنکھا ہوا کہ وہ جاگ جانے کے باوجود باہر اس کے میکے والوں سے ملنے کیوں نہیں آئے..... شادی کے بعد وہ لوگ پہلی دفعہ ان کے گھر آئے تھے۔

”اچھا ہوا..... آپ اٹھ گئے باہر بتول آپنی اور مارہ آئی ہیں ناشتہ لے کر..... آپ جلدی سے فریش ہو کر آجائیں“

”کہہ دو ان سے کہ میں سو رہا ہوں..... میرا موڈ نہیں ہے ابھی کسی سے ملنے کا“ انہوں نے صفا چٹ انکار کر دیا تھا اور اس کی امید ام کلثوم کو بہر حال نہیں تھی۔

”ایسا اچھے گلے گا کیا؟“ ام کلثوم بس اتنا ہی کہہ پائی۔

”ٹو ما..... کیا فرق پڑتا ہے یار..... اور پھر میں منافق نہیں ہوں جن لوگوں نے میری بیوی کی انسلٹ کی ہو میں ان لوگوں کی عزت نہیں کر سکتا..... آ تم سو رہی“ انہوں نے ہاتھ اٹھا کے منع کر دیا۔

”آہستہ بولیں حشمت..... وہ لوگ سن لیں گے اور پھر وہ باہر ہی تو موجود ہیں..... ام کلثوم کو خوف ہوا کہیں اس کی آپنی سن ہی نہ لیں ورنہ تعلقات میں بہتری بس کو ایک خواب ہی رہ جاتا۔“

”تم چلو میں آتا ہوں“ شادی کی پہلی ہی صبح شاید حشمت زیدی کو احساس ہو ہی گیا تھا کہ اسے ایسا رویہ اختیار نہیں کر ان چاہیے یا شاید اسے ام کلثوم کا دیکھی چہرہ اچھا نہیں لگا تھا۔

”میں نے حشمت کو جگایا ہے..... ابھی آتے ہیں تھوڑی دیر میں“ اس نے باہر نکلتے ہی زندگی کا پہلا بھرم رکھا بتول آپنی کچھ نہیں بولیں

”تیار ہو جاؤ ٹو می..... ہم تمہیں لینے بھی آئے ہیں.....“ مارہ نے اسے کہا تو وہ چاہتے ہوئے بھی کوئی جواب نہیں دے پائی تھی۔

”کہاں رہ گئے دلہا میاں..... آدھے گھنٹے سے زیادہ ہو گیا ان کا انتظار کرتے کرتے تم تو ناشتہ کر لو ام کلثوم.....“ بتول آپنی نے بے حد سنجیدگی سے اسے تحکیم انداز میں کہا تھا۔

”بھوک نہیں ہے آپنی..... بعد میں کھا لوں گی“

”بعد میں..... کیا مطلب تم ہمارے ساتھ نہیں جا رہی ہو کیا؟“ بتول آپنی معاملے کو سمجھ رہی تھیں پھر بھی اس کے منہ سے سننا چاہتی تھیں ام کلثوم کی آنکھیں یکنخت نمکین پانیوں سے بھر گئیں وہ بے ساختہ آپنی کے پاس آ بیٹھی۔

”آپنی..... پلیز میری بات سمجھنے کی کوشش کیجیے گا..... میں آؤں گی ضرور آؤں گی مگر ابھی نہیں..... اس وقت تک جب تک ابا جان کا غصہ و ناراضی ختم نہیں ہو جاتی..... اور میں وہاں اکیلی بھی نہیں آنا چاہتی.....“ آپنی، موٹے موٹے آنسو اس کے گالوں پر بہہ رہے تھے بے ربط انداز ٹوٹا کھرا لہجہ..... بتول آپنی کے دل پر برجھی چلا گیا انہوں نے بے ساختہ اس کے آنسو صاف کر کے اسے تسلی دی تھی۔

”تم فکر نہیں کرو..... آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا“ چلتے سے انہوں نے اس کے ہاتھ پر کچھ رکھا تھا ام کلثوم نے چونک کر دیکھا سوالیہ نگاہوں سے پوچھا یہ کیا ہے؟

”رکھ لو..... انکار مت کرنا ابا جان نے بھیجا ہے..... کل بھی ای جان تمہیں دینا چاہ رہی تھیں زیادہ نہیں ہے مگر تمہارے کچھ نہ کچھ ضرورتیں پوری ہو ہی جائیں گی اور نہیں تو کسی اچھے علاقے میں گھر ہی لے لینا“

”کہاناں رکھ لو.....“ اسے بولنے کیلئے پرتوتا دیکھ کر انہوں نے چپک اس کی مٹھی میں رکھ کے دپایا تو اسے خاموش ہونا پڑا..... اسے بھی یکدم ہی اس گھر میں بہت سی کیاں نظر آنے لگی تھیں..... اب وہ ایک گھر والی تھی سو ایسی سوچیں نامناسب نہیں تھیں..... جب وہ لوگ دو گھنٹے بعد چلی گئیں تھیں حشمت زیدی اٹھ کر نہایا، ام کلثوم نے ناشتے کا پوچھا تو اس نے انکار کر دیا۔

”نہ بھئی میں تو سسرال سے آیا ایک دانہ بھی نہ کھاؤں جنہوں نے میری بیوی کی قدر نہیں کی..... اسے اس کے حق سے محروم رکھا میں انہیں کا بھیجا انا ج کھالوں کہ حق کی بات نہ کر سکوں نہ بابا نہ میری غیرت یہ گوارا نہیں کرتی..... ام کلثوم خاموش ہو رہی کیونکہ وہ بات ہی اس کے حوالے سے کر رہا تھا..... اور اس کے واقعی ناشتہ نہیں کیا تھا بلکہ اپنی اماں کا لایا ہوا دوپہر کا کھانا ہی کھایا تھا ام کلثوم کے میکے سے آئی مٹھائی اور فروٹس پاک ٹی ہاؤس میں موجودان کے دوست احباب میں بانٹ دیے گئے دوستوں میں ہمیشہ کی طرح ان کی واہ واہ ہو گئی تھی“



خالق کا بیٹا ہوا تھا..... آج صبح ہی اماں نے فون کر کے بتایا تھا ام کلثوم کی شادی کو دس روز ہو گئے تھے اس دوران ام کلثوم گھر میں ضرورت کی کافی چیزیں لے آئی تھیں سب سے پہلے اس نے کھڑکی کے آگے پردہ لگوا دیا تھا..... حشمت زیدی اسے دیکھ کر ہنستے..... وہ روز شام کو جب گھومنے کے لیے باہر نکلتے تو ام کلثوم روزانہ ہی گھر کی کوئی نہ کوئی چیز خرید لاتی..... کچن میں برتن اور راشن ڈالا..... بیڈ فیش، کمبل وغیرہ خریدے..... حشمت زیدی کے اندر کی طعنہ باز عورت جاگ اٹھی۔

”ہا ہا..... یہ تمہارے کرنے کے کام تو نہیں تھے ٹو ما جان..... یہ سب ضرورتیں تو والدین پوری کیا کرتے ہیں کیا کوئی مان سکتا ہے کہ اتنے بڑے باپ کی بیٹی اچھرہ بازار سے گھر کی چیزیں خریدتی ہے،“ وہ کف افسوس ملتے ام کلثوم کی جان

سولی پر لٹکا دیا کرتے ام کلثوم شرمندہ ہو جاتی..... وہ اس سے اس انداز سے ہمدردی کرتے کہ وہ جواب میں یا اپنی صفائی میں کچھ بھی نہ بول پاتی اسے کبھی یہ نہیں لگا وہ اس کا مذاق اڑا رہے ہیں یا درپردہ اسے اس کی غلطی پر نارچہ کرتے ہیں وہ جذباتی ضرورتی مگر اتنی معاملہ فہم یا ذہین نہیں یا پھر حشمت زیدی ہی زیادہ ہوشیار تھے۔

”ہر کسی کو اپنے نصیب کا ملتا ہے اور میں اپنے نصیب پر شاکر ہوں حشمت.....“ وہ ان کے قریب بڑھ آئی ان کی آنکھوں میں محبت سے دیکھا۔

”میں تمہیں تمہاری حیثیت کے مطابق خوش نہیں رکھ پاتا ناں؟“ وہ اپنے احساس کمتری کو ناچاہتے ہوئے بھی عیاں کر گئے حالانکہ ایسی احساس کمتری کو دبانے کیلئے وہ ام کلثوم کے والدین پر چوٹ کیے رکھتے۔

”ایسا کیوں سوچتے ہو آپ..... میں بہت خوش ہوں آپ کے ساتھ..... اور مجھے زندگی میں کچھ بھی نہیں چاہیے“

جانے حشمت زیدی مطمئن ہوئے یا نہیں مگر خاموش ہو گئے تھے۔

”اچھا چلیں تیار ہو جائیں..... ہمیں خالق بھائی کے بیٹے کو دیکھنے کیلئے جانا ہے“

”کیا ضروری ہے یار..... کہ ہم ابھی چلیں..... ہم دوبارہ بھی تو جا سکتے ہیں“ انہیں ہمیشہ ہی اس محلے میں جانے سے کوفت ہوتی تھی۔

”جی..... اور ہم ابھی چلیں گے بس جلدی سے تیار ہو جائیں میں نے آپ کے کپڑے نکال دیے اور ابھی آپ نے مجھے شاپنگ بھی کروانی ہے بچے کے لیے، وہ جانے کیلئے تیار تو ہو گئے لیکن بچے کے تحائف کیلئے ان کی جیب خالی تھی۔“

”آج ویسے ہی ہو آتے ہیں..... تحفہ پھر کسی دن لے جائیں گے.....“ انہوں نے بازار میں آتے ہی ام کلثوم کے چہرے سے نظریں چراتے کہا۔

”جی نہیں..... آج میں آپ کی کوئی بات نہیں مانوں گی..... ہم ابھی تحفہ لے کر جائیں گے“ ام کلثوم کو ضد ہو گئی تھی۔

”مگر ٹو ما..... اس وقت میرے پاس ایک دھیلا بھی نہیں ہے..... ڈائجسٹ سے منی آرڈر ملنے میں ابھی کچھ دن باقی ہیں اور بچہ کا تحفہ کونسا ستا آ جائے گا“ انہوں نے اپنی پریشانی کی وجہ فوراً ہی بتادی تھی اس سے پہلے کہ وہ کسی دکان میں ٹکس جاتی انہوں نے اسے روکنے کی کوشش کی مگر

”آپ چلیں تو اندر..... اور فکر نہیں کریں میرے پاس کچھ پیسے ہیں ہم آرام سے شاپنگ کر لیں گے وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر اندر بڑھ گئی تھی نوزائیدہ بچے کے تین سوٹ اس کی ماں باپ کے علاوہ اس نے اپنی ساس کے لیے بھی سوٹ خرید تھا..... حشمت زیدی کی تو آنکھیں ابل کر باہر آ گئیں وہ کس قدر فیاضی سے ان کے رشتے داروں کے لیے شاپنگ کر رہی تھی جبکہ انہیں تو آج تک کبھی احساس ہی نہ ہوا تھا۔“

”آپ کچھ اچھی لگی میری شاپنگ حشمت“ وہ ان سے تائید چاہ رہی تھی تبھی وہ کہہ گئے۔

”کیا ضرورت تھی اتنا روپیہ خرچ کرنے کی ٹو ما جان..... ان پیسوں سے ہم اپنی ضروریات بھی تو پوری کر سکتے

تھے ناں؟ ام کلثوم تو چڑی ہی رہ گئی جبکہ وہ تو شادی کے بعد کا سارا وقت حیران ہی ہو رہی تھی،

”ان سب پر خرچ کرنا بھی تو ہمارا فرض ہے ناں حشمت“ وہ دھیسے لہجے میں جتا گئی مگر مقابل کو چنداں پرواہ نہیں تھی، اور پھر آپ خود ہی تو کہتے ہیں کہ ہمارے ان شتوں کا ہم پر بہت قرض ہوتا ہے ان کی محبتوں کا قرض..... تو پھر ہم عملی زندگی میں اس قرض سے کوتاہی کیوں برتیں۔ وہ انہیں ان کے مشہور ناول میں لکھے جملے کو یاد کرواتے کہہ رہی تھی حشمت زیدی کو لب بھینچ کر خاموش ہونا پڑا وہ کہہ نہ سکے کہ عملی زندگی اور فکشن میں فرق ہوتا ہے.....

اماں کے گھرانے کا والہانہ استقبال ہوا تھا..... محلے بھر کی تمام خواتین یکدم ہی ام کلثوم کو دیکھنے کے لیے جمع ہو گئی تھیں اور وہ سب بار بار حشمت زیدی اور خالدہ بی بی سے کہہ رہی تھیں۔

”وے حشمت..... تو کتنا خوش قسمت ہے پتر..... تیری دوہٹی تو دودھ ملائی سے بنی لگتی ہے انی سوئی اور بولتی تو اتنا ہولی (آہستہ) ہے کہ کان لگا کے سننا پڑتا ہے سچ بتا کہاں سے ڈھونڈا ایسا ہیرا..... تقریباً تمام محلے والی عورتوں کے تعریفی جملے اسی طرح کے تھے حشمت زیدی بڑائی اور فخر کے تاثرات سبائے ان تعریفوں کو اس طرح سے وصول کر رہے تھے جیسے یہ سب ان کا حق ہو جبکہ ام کلثوم شرماری تھی اسے اپنی تعریف میں سچائی سے زیادہ ان سب سادہ لوگوں کا پیار اور محبت کی حد تک نظر آ رہی تھی اس روز وہ شام کا کھانا کھا کر وہاں سے نکلے تھے شام کے کھانے کی تیاری ام کلثوم نے خالدہ بی بی کے ساتھ مل کر کروائی تھی وہ تو نہال ہی ہو گئی تھیں انہیں تو اندازہ تک نہیں تھا کہ اتنے بڑے گھر سے آنے کے باوجود بھی ان کی بہو اس طرح سے کام کرے گی بلکہ انہیں تو اس کے شایان شان جگہ ہی گھر میں نظر نہیں آ رہی تھی..... ام کلثوم کی عادات انہیں قدم قدم پر چونکا رہی تھیں پھر وہ سب گھر والوں کے قیمتی جوڑے بھی لائی تھی جبکہ حشمت اپنی ماہوار حاصل رقم میں سے بھی ماں کو پانچ دس روپے تک نہ دیتا تھا بلکہ وہ تو اس قدر کھل مل گئی تھی کہ خود ہی خالق سے فرمائش بھی کر دی کہ بچے کا نام میں رکھوں گی..... انہوں نے فوراً اجازت دیتے پوچھا تھا کہ کیا نام رکھو گی.....“

”آفاق کیسا ہے؟“ حشمت زیدی کی طرف دیکھتے اس نے نام کے متعلق پوچھا تھا۔

”بہت پیارا ہے..... آج سے یہ آفاق ہی پکارا جائے گا“ خالق بھائی نے اٹھ کر اس کے سر پر پیار دیتے ہوئے کہا تھا..... واپسی پر وہ دونوں بہت خوش تھے..... کچی بستی سے مین روڈ تک وہ لوگ پیدل چل کر آئے تھے..... جس وقت وہ لوگ لوٹے مغرب کی اذانیں ہو رہی تھیں میں روڈ پر رکشہ روکنے کیلئے وہ سڑک پر کھڑے تھے بھی اچانک بہت اچانک ایک گاڑی اس کے پاس آ کر رکی تھی..... چند لمحوں کے لیے ساری کائنات رک گئی جہنم پرند سانس لینا بھول گئے ام کلثوم بھی سانس لینا بھول گئی تھی وہ گاڑی چند لمحے اس کے پاس رکنے کے بعد آگے بڑھ گئی تھی..... مگر ام کلثوم آگے نہیں بڑھ سکی اور آگے تو حشمت زیدی بھی نہیں بڑھ سکے تھے..... انہوں نے بھی گاڑی میں بیٹھے اس شخص کو دیکھ لیا تھا..... وہ ام کلثوم کے ابا جان تھے.....

اور یہ سچ تھا کہ انہیں ام کلثوم کو یوں شام کے وقت فٹ پاتھ پہ کھڑے دیکھ کر دکھ ہوا تھا وہ تو عادی تھی ہمیشہ آرام دہ گاڑی میں سفر کرنے کی..... واپسی کا سفر کم تکلیف دہ ان کے لیے بھی نہیں تھا، ان دونوں میں سے کسی نے بھی ایک دوسرے

سے اس چھوٹے سے واقعے کا ذکر نہیں کیا تھا۔

☆☆☆

”آج واپسی پہ میں نے ابا جان کو دیکھا حشمت! رات کو ان کے چوڑے کشادہ سینے پر سر رکھے اس نے نم لہجے میں ہو لے سے سرگوشی کی..... وہ جو اس کے گھنے ریشمی بالوں میں انگلیاں چلا رہے تھے ان کے ہاتھ یکجہت تھے“

”کتنے روز کے بعد میں دیکھ رہی تھی انہیں..... پورے دس روز کے بعد..... پہلے اتنے روز میں کبھی ان سے جدا نہیں ہوئی اگر وہ بیرون ملک بھی جائیں تو بھی وہ فون لازمی کرتے تھے مجھے..... اس کے لہجے میں اداسی تھی رخصتی کے وقت اسے تو باپ کے کندھے پر سر رکھ کر جی بھر کے رونے کا موقع بھی نہیں مل سکا تھا“ حشمت زیدی اس کی اداسی کو لب بھیج کر محسوس کرتے رہے..... مگر بولے کچھ نہیں“

ان کی آنکھوں میں اس قدر حیرت تھی مجھے فٹ پاتھ پہ کھڑا دیکھ کے..... کہ چند ٹاپے کے لیے میں خود دم بخود رہ گئی..... انہیں یقیناً دکھ ہوا ہوگا اپنی ام کلثوم کو یوں سڑک پر کھڑے دیکھ کر..... میں عادی بھی کہاں تھی یوں لوکل ٹرانسپورٹ میں سفر کرنے کی..... وہ تو اپنی ہی دھن میں بولے جا رہی تھی مگر اس کا اتنا ہی کہنا غضب ہو گیا۔

”چھپتا رہی ہو مجھ سے شادی کر کے.....“ حشمت زیدی کا لہجہ سرد ہو گیا ان کی انگلیاں ام کلثوم کے بالوں میں منجمد ہو گئیں۔ میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا تھا اپنی مالی حیثیت..... میں نے تم سے کوئی دھوکا نہیں کیا جو تم ایسی باتیں کر رہی ہو..... ام کلثوم اس قدر سرد اور بر فیلے لہجے پر سن پڑ گئی وہ اٹھ بیٹھی۔

”میرا یہ مطلب نہیں تھا حشمت..... میں تو بس ویسے.....“

”تو پھر کیا مطلب تھا تمہارا..... میری انسلٹ کرنے کے علاوہ..... میں انگو اکر کے نہیں لایا ہوں تمہیں تمہاری پوری رضا مندی کے ساتھ تمہیں بیاہ کر لایا ہوں میں..... بلکہ میں تو عدالتوں میں جا کر ذلیل ہوا ہوں تمہارے باپ سے جو تیاں کھائی ہیں اپنے منہ کے اوپر..... مگر سچ کہا ہے کسی نے عورت ذات کبھی راضی نہیں ہوتی“ وہ بھڑک اٹھے تھے۔

”حشمت“ ام کلثوم کی آواز بھرا گئی دکھ سے وہ اپنی بات مکمل کرنا بھول گئی آپ غلط سمجھ رہے ہیں.....

”میں غلط سمجھ رہا ہوں..... وہ بھی اٹھ کر بیٹھ گئے غصے سے ان کا تنفس پھول رہا تھا“ ایک دنیا دیکھی ہے میں نے..... میں جانتا ہوں تم مجھے کیا باور کروانا چاہ رہی ہو..... رتم مجھے جان بوجھ کر میری کم مائیگی کا احساس دلانا چاہتی ہو۔ وہ بات کو طویل دے کر جھگڑا کر رہے تھے ام کلثوم نہیں جانتی تھی کہ وہ جلدی غصے میں آ جاتے ہیں بلکہ وہ تو ان کے بارے میں بہت کچھ نہیں جانتی تھی ابھی تو ابتدائے دوستی تھی اور وہ ابھی سے پریشان ہوا بھی تھی

”حشمت..... میں بھلا کیوں کرنے لگی ایسا.....“ وہ اپنی صفائی میں کچھ بولنا چاہتی تھی مگر حشمت زیدی نے

ہاتھ اٹھا کر منع کر دیا۔

”بس..... مجھے کوئی صفائی نہیں چاہیے..... اور اب مجھے سونے دو نیند آرہی ہے مجھے.....“ وہ کروٹ بدل کر

سو گئے تھے مگر ام کلثوم ساری رات نہیں سو سکی۔ صرف دس روز ہوئے تھے ان کی شادی کو..... اور کبھی زندگی میں جھگڑانہ

کرنے کا عہد کرنے والے عہد توڑ گئے تھے..... اور وعدے تو ہوتے ہی توڑنے کیلئے ہیں حشمت زیدی نے بھی وعدہ توڑ دیا تھا دس روز بعد ان کا پہلا جھگڑا ہوا تھا..... پہلا جھگڑا ایک بے حد معمولی بات پر مگر وہ معمولی بات معمولی جھگڑے پر نہیں ختم ہوئی تھی..... حشمت زیدی کا غصہ طول پکڑ گیا تھا وہ ساری رات ام کلثوم نے جاگ کر گزاری تھی مگر اس ادراک کے ساتھ کہ حشمت زیدی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی معاف کرنے والا نہیں اسے محتاط رہنا تھا کیا خبر کس لمحے اس کی کوئی بات حشمت زیدی کے مزاج گرامی کو ناگوار گزر جائے دوسری صبح وہ بغیر ناشتہ کیے سویرے ہی پاک ٹی ہاؤس کی جانب چل دیے تھے..... انہوں نے ام کلثوم کی جانب دیکھا تک نہیں تھا م کلثوم نے بات کرنے کی کوشش کی مگر انہوں نے جواب نہیں دیا بلکہ سرے سے نظر انداز کر دیا وہ ہر روز صبح بیڈنی لینے کے عادی تھے ام کلثوم بنا کر لے گئی مگر انہوں نے چائے کی طرف نگاہ غلط بھی نہ ڈالی۔ خود ہی اپنے کپڑے نکال کر استری کیے اور تیار ہو کر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد ام کلثوم پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔ ایک ناکردہ جرم کی سزا اس قدر سخت اتنی کڑی..... اس کی فہم سے بالاتر..... محبت کمال کرتی ہے محبت اپنے کمالات دکھانے کا آغاز کر چکی تھی.....

☆☆☆

تین دن کے بعد ان کا غصہ خود ہی ٹھنڈا ہو گیا تھا وہ بالکل پہلے والے ٹھنڈے بیٹھے جان نثار و الہا نہ محبت چھڑکنے والے حشمت زیدی بن گئے تھے مگر ان تین دنوں میں ام کلثوم کی جان سوکھ گئی تھی شاید وہ ابھی بھی نہ مانتے بلکہ وہ ام کلثوم کو اچھے سے یاد کراتے کہ وہ اپنے میکے کے حوالے سے کوئی ایسی بات نہ کرے نہ سوچے..... وہ اس کو ذہنی طور پر دبا کر مفلوج کر رہے تھے تاکہ وہ کبھی بچھتا نہ سکے اور اگر بچھتائے تو اس کا اظہار نہ کرے..... مگر انہیں اس سے بات کرنا پڑتی تھی انہیں اپنا موڈ ٹھیک کرنا پڑا تھا ان کی خالی جیب انہیں یہ سب کرنے پر مجبور کر گئی تھی۔

”تمہارے پاس اگر پانچ سو کھلا ہو تو دے دو..... میری جیب خالی ہے بالکل“ وہ شرمندہ شرمندہ سے مسکرائے تھے۔ ام کلثوم نے اثبات میں سر ہلا کر اندر گئی اور پیسے لا کر دیے یہ وہ قلیل رقم تھی جو اس کے پاس کچھ پہلے سے موجود تھی تھوڑی بہت سلامی کی جمع تھی۔

”نوازش بیگم صاحبہ..... جلد ہی لوٹا دوں گا“

”میں نے کب آپ سے واپس مانگے ہیں جو ایسی غیروں جیسی باتیں کر رہے ہیں“ ام کلثوم خوشی سے رہی مخمور لہجے میں شکوہ کر رہی تھی اس کے لیے تو آج عید کا دن تھا حشمت کا موڈ اس کے ساتھ پہلے جیسا ہو گیا تھا.....

”پھر بھی..... میاں بیوی میں بھی حساب کتاب تو ہوتا ہی ہے.....“ انہوں نے سگریٹ جلا کر لبوں میں دبایا۔

”میاں اور بیوی کا ایک دوسرے پر حق بھی تو ہوتا ہے کہ نہیں“ وہ مسکرائے۔

”ہاں کہہ تو ٹھیک رہی ہو“ انہوں نے شرارت سے اس کی ریشمی لٹ کھینچی۔

”اچھا یہ بتاؤ کہ کیا پکاری ہو آج.....“

”جو آپ کا کھانے کا موڈ ہو..... جلدی سے بنالوں گی“ ام کلثوم واری صدقے ہونے لگی۔

”ایسا کرو جان..... کہ تم اپنے لیے بنا لو..... میں تو آج دوستوں کے ساتھ کھاؤں گا آج ٹی ہاؤس والے دوستوں نے شادی کی خوشی میں عشاء یہ مانگا ہے ناں“ ان کے بتانے پر ام کلثوم کا منہ لنگ گیا اسے اب سمجھ میں آ گیا تھا کہ حشمت پیسے کیوں مانگ رہے تھے۔

”حشمت..... پھر تو پیسے کم نہیں آپ کے پاس“ یکدم ہی اسے تشویش بھی ہوئی تھی۔

”نہیں..... بہت ہیں کچھ میں نے علیم الدین سے مانگ لیے تھے“

”آپ کوئی جاب کیوں نہیں کر لیتے..... ساتھ ساتھ“ ام کلثوم نے عادت کے مطابق مشورہ دیا مگر اگلے ہی لمحے

زبان دانتوں میں داب لی مبادا حشمت کا مزاج پھر بگڑ جائے۔

”پیسے تو پہلی بار مانگے ہیں تم سے اور وہ بھی ادھار اور تم مجھے مشورے بھی دینے لگیں.....“ انہوں نے سنجیدگی

سے جتلیا تھا ام کلثوم کی جان تختہ دار پر لنگ گئی وہ پھر ناراض ہونے والے تھے مگر اگلے ہی لمحے وہ حیران رہ گئی جب انہوں نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

”اس کے بارے میں بھی..... کچھ نہ کچھ سوچتے ہیں“ ام کلثوم نے بے ساختہ شکر کا کلمہ پڑھا تھا۔

☆☆☆

”جونیر سیکشن میں وہ بھی شامل تھی اور فائنل والوں کے فیر ویل فنکشن کی تیاریوں میں پیش پیش بھی..... ہنی

کلاس میں آنے پر پر جوش بھی تھی مگر اس کے چلے جانے سے اداس بھی..... یہ سچ تھا کہ اس ایک سال میں اس نے کبھی بھی

اس کے بغیر یونیورسٹی آنے جانے اور یہاں اکیلے وقت بتانے کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا مگر وہ بہت خوش تھا اس کا بی

اے آرزو مکمل ہو رہا تھا اس کی کامیابی کی سیڑھی پر پہلا قدم پوری طاقت سے پڑ گیا تھا..... اس کی زندگی کے حوالے سے

ترجیحات بہت بلند تھیں اسے بہت آگے جانا تھا خوب ڈھیر سا راپیسہ کمانا تھا اسے اپنے لیے اپنے نام کے ساتھ قابل فخر

ڈگریوں کی لمبی فہرست لگانی تھی اسے خود کو کامیاب ترین انسان کہلوانا تھا اور یہ بات طے تھی کہ وہ اپنے ارادوں میں اٹل تھا

ارسہ کو اس بات کی واضح طور پر خبر تھی مگر وہ یقین نہیں کر پائی کہ اس کی زندگی کی ترجیحات، ضروریات اور خواہشات میں وہ

کس مقام پر کس جگہ پر کھڑی ہے وہ ان سب میں شامل ہے بھی یا نہیں.....“ وہ اس سے کبھی بھی پوچھ نہیں سکی اور وہ اسے

کبھی بتا نہیں پایا.....

”مگر ارسہ کی یہ شدت سے خواہش تھی کہ وہ بس ایک بار ہی سہی مگر اس کے دل میں جھانک لے اور دیکھے کہ اس

کے دل میں کیا ہے اس کا مقام کیا ہے اس کے دل کے کسی کونے میں بستی ہے آیا بستی بھی ہے یا نہیں..... یہ خیال جان لیوا

سہی مگر حقیقت پسند ہونے کے ناطے وہ ایسا سوچتی ضرور تھی“

”تمہارے کیا پلانز ہیں فوج کے حوالے سے“ اس روز فیر ویل فنکشن سے دو دن پہلے اس نے پوچھ لیا تھا وہ

خود کو روک نہیں سکی اس سوال کو پوچھنے سے.....

”ابھی فی الحال تو اچھے پیرز کی دعا کر رہا ہوں باقی پلاننگ میں نہیں کیا کرتا جو بھی قسمت میں لکھا ہو گا وہ ہو کر

رہے گا اس کے انداز میں لاپرواہی کا عنصر معمول سے کہیں زیادہ تھا یا پھر اسے کو محسوس ہوا تھا۔“

”شادی کب کرو گے؟“ اس نے فضول میں وقت ضائع کرنے کی بجائے صاف سیدھے انداز میں پوچھ لیا تھا۔

”شادی..... آں..... وہ سوچ میں پڑ گیا تھا اور اس دوران اس کا دل سوکھے پتے کی مانند لرزنے لگا تھا۔“

”کسی ایسی لڑکی سے کروں گا جسے میرے والکن سے محبت ہوگی..... کیونکہ میری پہلی محبت میرا والکن ہی ہے اس نے یکدم اظہار کر دیا تھا اسے دم بخود بیٹھی رہ گئی اظہار کا انداز بہت انوکھا اور قدرے مبہم تھا۔“

”کیا تم نے ایسی لڑکی ڈھونڈی ہے جسے تمہارے والکن سے محبت ہے؟“ اس نے یقین دہانی کرنا ضروری سمجھی تھی۔

”تم محبت پر یقین رکھتی ہو اسے؟“ یکدم اس نے پوچھا تھا اس کا سوال دھرا رہ گیا..... اس نے بے ساختہ اور ترنت اثبات میں سر ہلایا۔

”میں نہیں رکھتا..... کیوں کہ میرا یہ ماننا ہے کہ محبت دکھ کے علاوہ زندگی میں اور کوئی تحفہ دان نہیں کرتی اس نے خود ہی وضاحت کرتے اور سر پر دکھ کا پہاڑ گرادیا تھا وہ بول نہیں پائی۔“

”تمہیں ایسا کیوں لگا؟“ بہت دیر بعد خاموش رہنے کے بعد اس نے پوچھا تھا۔

”یہ میرا تجربہ و مشاہدہ ہے..... محبت انسان کو زندگی میں صرف دکھ، تنہائی اور پچھتاوے ہی سونپتی ہے یہ سب کو اس نہیں آتی اسی لیے میں محبت کرنے سے ڈرتا ہوں..... مگر یہ بہت ظالم شے ہے یہ اسی انسان کا پچھا کرتی ہے جو اس سے دور بھاگتا ہے“ وہ بے بسی سے کہہ رہا تھا اور وہ تو اتنی حیران تھی کہ پوچھ ہی نہیں پائی کہ کیا تمہیں بھی اس ظالم محبت نے ڈس لیا ہے جو تم ایسا کہہ رہے ہو یا..... یا کسی تجربے سے ڈرتے ہو یا محبت سے ڈرتے ہو۔

”تو تم شادی نہیں کرو گے.....“ وہ الٹا سوال کر گئی تھی وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ پھر کیا تم محبت نہیں کرو گی..... مگر اس کے حواس نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

”میں نے کب کہا کہ میں شادی نہیں کروں گا بلکہ میں تو محبت بھی کروں گا“ وہ مبہم سا مسکرایا تھا۔ اس نے ہمت مفقود ہو گئی کہ وہ پوچھ سکے کہ کب اور کس سے..... محبت اور اس کے خدشات نے اس کی زبان کو مفلوج کر دیا تھا مگر وہ مگن سا ارد گرد دیکھنے میں گم رہا تھا۔



نانی اماں..... کیا یہ سچ ہے کہ محبت دکھ کے علاوہ اور کچھ دان نہیں کرتی زندگی کو..... اس روز بہت دنوں کے بعد اسے وقت ملا تھا نانی اماں کے پاس بیٹھنے کا..... نانی اماں کی گود میں سر رکھے وہ لیٹی ہوئی تھی جبکہ ابامیاں لاؤنج میں ذرا فاصلے پر پی وی پر لگے ناک شو میں گم تھے۔

”ضروری نہیں اسے..... کہ محبت ہمیشہ غم ہی دے جس رشتے میں توقعات زیادہ ہوں وہ سبھی غم دیتے ہیں صرف

محبت کو پوائنٹ آؤٹ کرنا غلط ہے.....“ انہوں نے نرمی سے سمجھایا تھا۔

”تو پھر محبت اتنی بدنام کیوں ہے؟“ وہ بھی الجھ گئی تھی اس کے عمر بھی تو ایسی ہی تھی۔

”کیونکہ محبت میں ہی توقعات وہ چیز ہے جو حد سے زیادہ دونوں فریقین ایک دوسرے سے وابستہ کر لیتے ہیں اور

اکثر دونوں فریقین ہی اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ انہیں ایک دوسرے کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش کرنی چاہیے
لگاڑ تو بھی پیدا ہوتا ہے جب انسان اپنے اپنے فرائض سے پہلو تہی کرتے ہیں..... اور یہ ہر رشتے میں ہی ہوتا ہے

..... ارشخ میرج میں بھی ایسا دیکھنے میں اکثر آتا ہے۔“

”مگر سب سے اچھی بات یہ ہے کہ بیٹوں کو ہمیشہ ہی اپنے والدین کی مرضی کے مطابق شادی کرنا چاہیے

..... کیونکہ والدین ہمیشہ اپنی بچیوں کا بھلا چاہتے ہیں ان کی دعائیں ان کے زادراہ کے طور پر ہمیشہ کام آتی رہتی ہیں

..... بنجانے کس وقت ابامیاں اٹھ کے ان کے قریب آئے تھے ان دونوں کو پتہ نہیں چلا تھا..... ارسہ جان گئی وہ اسے کیا

سمجھانا چاہتے ہیں ویسے بھی وہ بہت حساس اور ذہین لڑکی تھی اور ابامیاں سے بے پناہ محبت کرتی تھی ان کے وجود میں اس

نے ہمیشہ باپ کی مہک و شفقت ڈھونڈی اور محسوس کی تھی..... اس نے جان لیا تھا کہ اسے اپنوں کا دل کبھی نہیں توڑنا اسے

ان کی خاطر جینا ہے اسے محبت نبھانی ہے اسے احسان اتارنا ہے اور محبتیں احسان ہی تو ہوا کرتی ہیں انہیں صرف حق سمجھ کر ہی

نہیں وصولنا چاہیے انہیں احسان سمجھ کر بدلے کی طرح ہمیشہ اتارنا کی کوشش کرنی چاہیے اس روز کے بعد وہ پھر کبھی اس سے

نہیں ملی..... دانستہ جب تک فائل والوں کو کالج سے فری نہیں کر دیا گیا وہ یونیورسٹی نہیں گئی تھی اس نے اپنی معصوم سی محبت کا

گلا خود ہی گھونٹ دیا تھا..... کیونکہ محبت میں وہ زبردستی کی قائل نہیں تھی..... اور جب وہ یونیورسٹی گئی وہ تب وہاں نہیں تھا اس

کے اور اس کے واکمن کے بغیر پورا کیمپس اداس اور مغموم تھا اور تنہا بھی اور تنہا تو وہ بھی ہو گئی تھی جس محبت کا آغاز ہوا تھا وہ

انجام سے پہلے ہی بیچ راہ میں کہیں کھو گئی تھی..... مگر بات یہ تکلیف دہ نہیں تھی بلکہ جس محبت کا وہ دم بھرتی تھی اس محبت کے

سفر میں وہ اکیلی تھی..... اس کی وجہ کیا تھی اسے جاننے میں زیادہ وقت نہیں لگا تھا.....“



”پیسے کی اہمیت کا اندازہ ام کلثوم کو اس وقت ہوا جب اس نے عملی زندگی میں اس کی بار بار اور بے شمار قلت

دیکھی تھی..... اب بھی تقریباً ہر دوسرے دن حشمت زیدی کی جیب خالی رہنے لگی تھی پہلے ہی کی طرح سے دوستوں کو کھلانے

پلانے کے قائل تھے مگر گھر میں راشن ڈالنا بھول جایا کرتے تھے..... پہلے وہ متواتر لکھا کرتے تھے تو ماہوار اچھی آمدنی ہو جایا

کرتی تھی مگر اب وہ صرف ایک ڈائجسٹ میں ہی سسلے دار ناول لکھ رہے تھے اور اس کا اعزاز یہ بہر حال اتنا کسی طور پر بھی

نہیں تھا کہ ایک گھر کا خرچ علاج معالجہ اور دیگر ضروریات کے ساتھ ساتھ دوستوں پر بھی لٹایا جاسکے..... ان کے کپڑے

پہلے پہل دھوبی سے دھل کر آتے مگر اب ام کلثوم خود ہی دھو کر کلف لگا کر استری جما کر ناسیکھ گئی تھی..... اس کے اخلاق اور

اخلاص کی وجہ سے آئے دن اس کے سسرال والوں سے بھی کوئی نہ کوئی آیار ہوتا..... اس کے میکے سے تو کبھی بھی کوئی نہیں آیا

تھا اس کی شادی کو ایک سال ہو گیا تھا اور اس ایک سال میں اس نے زندگی کے بہت سے رنگ و روپ و اتار چڑھاؤ دیکھے

لیے تھے..... حشمت زیدی کی بے پناہ محبت، غصہ اہانت وہ جیسے عاوی و ہنکی تھی حشمت زیدی بہت روکھے مزاج کا بندہ تھا اس قدر گنجلک سوچ کا حامل کہ ام کلثوم اس کی ذات کے ریشمی لہجے دارا جنسوں میں الجھ کے رہ گئی تھی کبھی اتنا نرم رو کہ ام کلثوم کو کلیوں کی مانند سہلاتا مگر کبھی ایسا چٹان اور سخت کہ ام کلثوم کی محبت سرخ سرخ کر رہ جایا کرتی مگر اس سب کے باوجود بھی ام کلثوم کی محبت اس تنگ دستی، تنگ نظری میں بھی ایک دن کیلئے بھی نہیں پچھتاتی تھی اس روز جب خالق بھائی اور ان کی بیگم آفاق کی سالگرہ کا کہنے کیلئے آئے تو گھر میں چینی تک نہیں تھی کہ وہ خالی چینی کا شربت ہی بنا کر انہیں پلا سکتی..... وہ تو اتفاق ایسا تھا کہ وہ لوگ شام کو بازار سے شاپنگ کر کے کھانا کھا کر لوٹے تھے بس کھڑے کھڑے ان دونوں کو دعوت دے کر گھر چلے گئے بلکہ وہ لوگ آتے وقت ام کلثوم کے لیے بھی دو کباب اور دو پراٹھے لے کر آئے تھے انارکلی کے بہت مشہور کباب پراٹھے تھے..... ام کلثوم کو بہت خوشی ہوئی تھی کباب تو اس کے پسندیدہ تھے اکثر ہی امی جان سے فرمائش کر کے بنوائے رکھتی تھی مگر اب تو بہت عرصہ ہو گیا تھا اس نے کباب چکھے تک نہیں تھے حشمت کی محدود آمدنی اسے ایسی شاہ خرچی کی اجازت نہیں دیتی تھی گو کہ حشمت دل کے خاصے کھلے انسان تھے مگر انہوں نے کبھی خود سے لا کر دینے کی زحمت کی تھی نہ ہی ام کلثوم نے کہنے کی..... سودل کی وہ دل ہی میں دبائے بظاہر مطمئن اور خوش تھی مگر اس روز والی صورت حال پر وہ سچ میں پریشان ہو گئی تھی اس نے نوکری کا پکا ارادہ کر لیا تھا اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ حشمت سے لازمی آج ذکر کر کے ہی رہے گی آج وہ ان کے کسی بھلاوے میں نہیں آئے گی اور وہ واقعی میں نہیں آئی تھی۔“

”ایسا کب تک چلے گا..... آپ کوئی جاب کیوں نہیں ڈھونڈتے اب تو گھر میں فاقوں کی نوبت آنے لگ گئی ہے..... پہلی بار وہ تھوڑا سا تلخ ہوئی تھی حشمت زیدی نے اسے چونک کے دیکھا تھا۔“

”بس..... عشق کا بخارا تر گیا جان من.....“ وہ الٹا اس پر طنز فرمانے لگ گئے تھے۔

”میں نے تو تمہیں اپنی حیثیت پہلے ہی بتادی تھی.....“ وہ ام کلثوم جب بھی کوئی بات کرنے لگتی طعنے دے کر اسے چپ کر وادیا کرتے مگر آج اسے چپ نہیں ہونا تھا بلکہ انہیں قائل کرنا تھا۔

”حشمت..... میری محبت کو مت برا بھلا کہیں..... میری محبت اور میں کبھی نہیں پچھتائے مگر خود سوچیں اگر یہی حال رہا تو ہم آئندہ زندگی میں سروایو نہیں کر پائیں گے..... کل کو ہمارے بچے ہوں گے ان کی ضروریات بھی تو ہوں گی آپ کوئی جاب کیوں نہیں کر لیتے“

”جواب کروں گا تو خود مر جاؤں گا..... اور میں اپنی تخلیق کو مارنا نہیں چاہتا میں زندہ رہنا چاہتا ہوں اپنی تخلیق کے ذریعے ہمیشہ کے لیے امر ہو جانا چاہتا ہوں..... انہوں نے نئی دفعہ کی کہی بات دہرائی۔“

”تو پھر مجھے اجازت دے دیجیے..... میں کہیں جاب کر لیتی ہوں“ اس نے تھک کر کہا تھا۔

”مجھے عورت کی کمائی کھانے سے نفرت ہے اور پھر میں تم جیسی حسین بیوی کو باہر کمانے کے لیے بھیج دوں تاکہ تمہارے نام نہاد عزت دار باپ کو باتیں بنانے کا موقع مل سکے.....“ وہ بھڑک اٹھے۔

”حشمت..... وہ جیسے تھک کر بولی تھی کوئی کچھ نہیں کہے گا“ مگر وہ سمجھتے تب ناں۔

”تم جو بھی کہو..... مگر میری انا پر یہ بات تازیانہ ہے کہ میرے ہوتے ہوئے تم باہر سے کما کر لاؤ ابھی اتنا بھی برا وقت نہیں آیا میرے اوپر.....“ ام کلثوم کا جی چاہا سر پیٹ لے۔

”میں بھی پڑھی لکھی ہوں حشمت..... اور پھر گھر میں سارا دن بولائی بولائی سی رہتی ہوں آپ تو صبح کے گئے رات کو لوٹتے ہیں..... میں بھی مصروف رہنا چاہتی ہوں“

”تو گھر میں مصروف رہنے کے اور بھی تو کئی طریقے نکل سکتے ہیں.....“

”مگر حشمت..... میں گھر کے ایک جیسے حالات سے اکتا گئی ہوں..... اب کچھ پیسہ جمع کر کے اپنا مکان بنانا چاہتی ہوں اسے اپنے پسند سے سجانا سنوارنا چاہتی ہوں اور اگر ایسے ہی حالات رہے تو یہ خواب خواب ہی رہے گا“ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا وہ کیسے سمجھائے انہیں.....

”میرے حالات کو برا بھلا مت کہو بڑا..... اگر تمہارے باپ کو احساس ہوتا تو وہ کبھی بھی تمہیں یوں خالی ہاتھ گھر سے رخصت نہ کرتے..... میں نہ سہی تم تو آسائشات میں پٹی بڑھی تھیں وہ تمہارے آئندہ کی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے ہی سہی وہ تمہیں اپنا ایک گھر تو دے ہی سکتے تھے“ لے دے کے ان کی تان بس اس کے والدین پر ہی ٹوٹی تھی ام کلثوم چڑ گئی۔

”حشمت..... مجھے یہ سب میرے والدین کیوں دیتے..... مجھے تو یہ سب آپ سے لینا تھا، ہم نے اپنا گھر بنانا تھا اپنی محنت اور محبت سے..... میں کیوں لیتی اس کو اپنے باپ سے“

”تو پھر یہ رونا بند کر دو..... جب کبھی میرے پاس ہو اسب کچھ تمہیں گھر بیٹھے مل جایا کرے گا ابھی جو ہے اسی پر گزارہ کرو..... انہوں نے بات ختم کر دی تھی مگر ام کلثوم اب اس مسئلے کا حل چاہتی تھی زیادہ نہیں تو وہ چاہتی تھی کہ وہ لوگ یہ گھر ضرور بدل ہی لیں۔“

”مگر ہم کسی اچھے علاقے میں شفٹ تو ہو ہی سکتے ہیں حشمت“

”میری سمجھ نہیں آ رہا تم جان بوجھ کر مجھے ذلیل کرنے کی کوشش کر رہی ہو یا واقعی میں تمہیں میری بات سمجھ نہیں آ رہی..... وہ لینے سے اٹھ بیٹھے تھے کیسیٹ کو الیش ٹرے میں جھاڑا۔“

”حشمت..... میں یہ دونوں کام نہیں کر رہی..... میرے پاس کچھ پیسے ہیں آپ وہ لے لیں اور کوئی اچھا سا گھر ڈھونڈ لیں..... میں اب یہاں اور نہیں رہ سکتی سارا دن ساری رات ٹریفک کا بے ہنگم شور یہاں کا ماحول، گندگی، کچھ بھی اب میری برداشت میں نہیں ہے.....“ پورے ایک سال کی بھڑاس وہ اب آج اسی وقت نکال رہی تھی وہ اس کی بات کے جواب میں مبہم سا مسکرائے تھے۔

”میں ابھی لا کے دکھاتی ہوں..... آپ کو ایسے یقین نہیں آئے گا“ اسے لگا شاید انہیں یقین نہیں آ رہا وہ بھاگ کر اندر سے الماری سے وہی چیک نکال کر لائی جو بتول آپنی نے اسے شادی کے دوسرے ہی دن دیا تھا کہ کبھی نہ کبھی ضرورت آ جائے گی اور اسے خوشی تھی کہ ایک سال بعد اسے ضرورت محسوس ہوئی تھی اور اب وہ اپنا گھر خرید نہیں سکے گی تو کیا

ہوا وہ تبدیل تو کر ہی لے گی اور ان پیسوں میں کچھ نہ کچھ تو بچ ہی جائے گا تو وہ ان بقایا پیسوں سے گھر کا فرنیچر اور دوسری چیزیں خرید لے گی..... اس نے خوشی خوشی چیک لاکر حشمت کو دکھایا تھا۔

”یہ دیکھیں جناب“ اس نے چیک ان کے سامنے لہرایا انہوں نے پکڑ کر دیکھا اور وہ حیران رہ گئے چیک پر اچھی خاصی رقم لکھی تھی۔

”یہ تمہیں کس نے دیا اور کب.....“ وہ حیران ہی تو ہوئے تھے۔

”بتول آپی دے گئی تھیں ابا جان نے دیا تھا کہ کچھ ضرورت کی چیزیں خرید لوں“

”تمہارے ابا جان آئے تھے کیا..... یا تمہاری بہن آئی تھی تم نے مجھے بتایا ہی نہیں ان کے لہجے میں یکنشت

سنجیدگی در آئی تھی“

”کوئی نہیں آیا حشمت..... یہ بتول آپی نے مجھے ہماری شادی کے دوسرے ہی دن دیا تھا مگر مجھے کبھی ضرورت

ہی نہیں پڑی اور پھر مجھے یا نہیں رہا کچھ اس کے بارے میں.....“ وہ سادہ سے لاپرواہ انداز میں کہہ رہی تھی مگر حشمت زیدی کو جی بھر کے برا لگا تھا انہیں امید نہیں تھی کہ وہ ان سے یوں چھپائے گی۔

”مگر تمہیں مجھے اسی وقت بتانا چاہیے تھا..... ہم اتنے دن مشکل حالات میں رہے ہیں اور پھر تم احمق

عورت..... اتنے سے پر ہی راضی ہو گئیں..... کیا تمہارا حق ان کی لمبی چوڑی جائیداد میں سے صرف 20 ہزار ہی نکلتا ہے

“.....

”حشمت..... مجھے ان کی جائیداد میں سے کچھ نہیں چاہیے“ مگر وہ اور بھی بھڑک گئے۔

”کیوں..... کیوں نہیں چاہیے اور پھر یہ احسان لینے کی بھی کیا ضرورت تھی.....“ ام کلثوم کی سمجھ میں نہیں آیا کہ

اس نے وہ چیک انہیں دکھایا ہی کیوں اسے تو یہ خدشہ تھا کہ وہ بہت زیادہ بگڑیں گے کہ اس نے وہ چیک لیا ہی کیوں مگر اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس لیے لڑیں گے کہ اتنے کم پیسوں کا چیک کیوں لیا..... وہ دم بخود رہ گئی تھی۔

”اچھا ٹھیک ہے..... میں یہ چیک واپس بھجوا دیتی ہوں.....“ ام کلثوم کو بروقت پیسو جھا اس نے چیک ان سے

لینا چاہا مگر انہوں نے واپس لے کر جیب میں رکھ دیا۔

”رہنے دو..... صبح میں کہوں گا عظیم الدین بھائی سے کہ کسی اچھے علاقے میں مکان ڈھونڈ کر دیں“ انہوں نے

اس کی ذات پر احسان عظیم کیا تھا۔

”سچ..... آپ سچ کہہ رہے ہیں حشمت تھینک یو سوچ.....“ وہ انکا ہاتھ تھام کر فرط مسرت سے لبریز لہجے میں کہنے

لگی تھی مگر بہت دن گزر گئے اس کا خواب خواب ہی رہ گیا تھا..... وہ ہر روز حشمت سے اپنے گھر کا پوچھتی مگر وہ کہتے کہ ڈھونڈ رہے ہیں ابھی گھر نہیں ملا..... تین ماہ گزر گئے ایک دن تک آ کر اس نے وہ چیک مانگا تو حشمت نے ٹھنڈے لہجے میں جو

بتایا اس کی ناگوں سے زمین نکال کر لے گیا تھا۔ اس نے وہ چیک اس لیے مانگا تھا کیونکہ وہ ابھی تک بری کے بنائے گئے

چند جوڑوں میں ہی گھوم رہی تھی اس نے کوئی ڈھنگ کا جوڑا نہیں بنایا تھا شدید گرمی میں بھی اس نے وہی کپڑے پہنے رکھے

تھے..... مگر وہ بھی اب تو گھس گھس کے بے حال ہو چکے تھے اس کا ارادہ تھا کہ وہ کچھ پیسے نکلا کر پڑے بنالے مگر حشمت نے اسے بتایا تھا کہ اس نے وہ چیک تین ماہ پہلے ہی کیش کروالیا تھا..... اور اگر اس نے وہ چیک کیش کروالیا تھا تو پھر اس کا گھر کہاں تھا..... اور وہ پیسے اس نے استعمال کہاں کیے تھے اگر گھر نہیں ملتا تھا تو اس نے پوچھ بھی لیا تھا۔

”جس انجمن سے میں منسلک ہوں اس کو فنانشل سپورٹ کی ضرورت تھی تو میں نے کچھ پیسے انہیں دے دیے کچھ گھر کے خرچ میں صرف ہو گئے“ ان کا انداز لا پرواہ سا تھا۔

”مگر حشمت..... سارے پیسے ضائع کرنے کی کیا ضرورت تھی..... وہ پیسے تو ہمارے گھر کے لیے تھے“ اسے

از حد دکھ ہو رہا تھا

”تو کیا اتنے سے پیسوں سے گھر آ جانا تھا کیا..... اپنے باپ سے اور پیسے منگوا لو..... اور گھر خرید لیں گے..... اچھا اور بڑا سا“ ان کو جیسے فکر ہی نہیں تھی کہ انہوں نے ام کلثوم کا دل دکھایا ہے۔

”حشمت..... کیوں کیا آپ نے ایسا..... اور پھر ہماری ایسی کیا حیثیت کہ ہم انجمن کو اسپورٹ کر سکیں۔“

”میں لیڈر ہوں ترقی پسند مصنفین انجمن کا..... اور یہ میرا فرض تھا کہ پہلا دیا میں اپنے گھر سے جلاتا“ ام کلثوم کی آنکھ سے بے ساختہ آنسو بہہ نکلے اسے حشمت زیدی کی بے حسی تکلیف دے رہی تھی اسے دکھ ہوا تھا کہ انہیں ام کلثوم کے جذبات کی مطلق پرواہ بھی نہیں تھی انہیں احساس تک نہیں تھا بڑے پرسکون انداز میں کہہ کر اس کے سکون کو تہہ وبالا کر گئے تھے ام کلثوم کچھ کہہ نہیں پائی اور احساسات و جذبات کا گہرا مشاہدہ کرنے کی صلاحیت رکھنے والے حشمت زیدی اس کی خاموشی کو سمجھتے تک نہیں تھا وہ اٹھ کر کمرے میں آ گئی تھی اور وہاں بیٹھ کر دھاڑیں مار مار کے روئی تھی اسے حشمت زیدی سے ایسی توقع بہر حال نہیں تھی انہیں اس بات کا احساس تو تھا کہ جس انجمن کے وہ لیڈر ہیں اسے وہ سپورٹ کریں مگر انہیں اپنے گھر کی ضروریات اور دیگر گروں حالت نظر نہیں آتی تھی..... اس اکلوتے کمرے کی پلستر اکڑی سیلن زدہ دیواروں کی بدبو..... بے رنگ اور پرانا قدرے بھدا نظر آتا فرنیچر..... اڑا ہوا دیواروں کا رنگ..... برآمدے کا اکھڑا فرش..... کچن کی بھر بھری ہو کر روز بروز بکھرتی سلیب..... انہیں ایسا کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔

”اب اٹھ بھی جاؤ..... کس کا سوگ بنا رہی ہو وہ تھوڑی دیر بعد کمرے میں آئے تھے بے حد غمی سے استفسار کرتے ہوئے وہ ام کلثوم کی دلی و ذہنی کیفیت سے قطعی طور پر لاتعلق نظر آ رہے تھے۔“

”کھانا دو..... مجھے بہت بھوک لگی ہے.....“ ام کلثوم کو غصہ آ گیا تھا۔ گھر میں تین دن سے راشن ختم تھا اور وہ حشمت سے کہہ کہہ کے تھک چکی تھی اور انہوں نے آج صبح بھی لا کر نہیں دیا تھا وہ تڑکے ہی ٹی ہاؤس چلے گئے تھے اور اب اکثر ہی وہ جلدی چلے جایا کرتے اور رات گئے لوٹا کرتے تھے۔

”کہاں سے لاؤں کھانا..... گھر میں ایک چٹکی زہر تک نہیں جو میں ان حالات سے تنگ آ کر پھاٹک لوں۔ وہ بھی غصے میں آ گئی تھی بہت عرصے بعد اس کے اندر کی جذباتی اور ضدی ام کلثوم نے سر اٹھا رہا تھا..... مگر حشمت زیدی اس کے ایسے رویے کے عادی نہیں تھے۔“

”کیا بکواس کر رہی ہو..... اگر اتنی ہی تنگ ہو ان حالات سے تو چلی کیوں نہیں جاتیں اپنے ماں باپ کے گھر..... وہاں تو روپے پیسے کی کمی نہیں ہوگی تجھے.....“ ام کلثوم تو دم بخود رہ گئی تھی اسے امید نہیں تھی کہ حشمت اسے یوں جانے کو کہہ دیں گے۔

”چلی جاؤں“ اس نے دکھ سے دہرایا ”آپ نے کتنی آسانی سے کہہ دیا کہ چلی جاؤں جو کچھ میں آپ کے کہنے میں آ کر ان کے ساتھ کر چکی ہوں اب کوئی گنجائش رہ گئی ہے کیا میرے واپس جانے میں“ وہ دکھ سے چور ہوتی کہہ گئی تھی مگر اس کی یہ بات حشمت زیدی کو تازیا نے کی مانند پڑی تھی وہ بلبلاتا اٹھے تھے۔

”میں ورغلا کے نہیں لے گیا تھا تمہیں..... نہ ہی میں نے تمہاری منت کی تھی تم خود آئی تھیں میرے پاس..... تم جیسی امیر گھروں کی لڑکیوں کو عادت ہوتی ہے ہمارے جیسے غریب گھرانے کے مردوں کے عشق میں گرفتار ہو کر ماں باپ کی عزت نیلام کرنے کی..... اور برے ہم بن جاتے ہیں.....“ وہ بھی طیش کے عالم میں کہنے لگے تھے ان کی نوک جھونک اب سنجیدہ رخ اختیار کرتی جا رہی تھی..... اور سچ تو یہ ہے کہ خالی پیٹ محبت کی بھی نہیں جاسکتی۔

”حشمت..... آپ میری محبت کی تو ہین کر رہے ہیں..... میں نے کب کہا کہ میں تنگ ہوں اور کب شکایت کی آپ سے آپ جن حالات میں رکھ رہے ہیں میں رہ رہی ہوں میں نے کب کی آپ سے شکایت..... پورا سال گزر گیا مجھے اپنی بری کے چار جوڑوں کو پہنتے ہوئے اب تو وہ بھی کھس کھس کر بدرنگ ہو چکے ہیں.....“ وہ سسک اٹھی تھی۔

”تو جاؤ اور جا کر میری غریبی کے پوسٹر لگوادو زما بنے میں..... کہ نامور لکھاری کی بیوی بری کے بدرنگ اور گھسے ہوئے چار جوڑوں میں سال بھر سے گزارہ کر رہی ہے“ وہ بھڑکے تھے۔

”غلط بھی نہیں ہے..... اور ہاں یہ میرا ہی قصور تھا میں نے اپنے ماں باپ کا دل دکھایا تھا مجھے اپنی کرنی کو بھرنانا تو تھا ہی ناں.....“ آج تو ام کلثوم کے ضبط کا پیمانہ بھی لبریز ہو گیا تھا وہ بھی دودبو جھگڑا کر رہی تھی۔

”تو پھر چلی کیوں نہیں جاتیں اپنے باپ کے گھر..... تاکہ مجھے بھی کوئی سکون ملے..... بندہ گھر میں سکون کیلئے آتا ہے اور تم ہو کہ آتے ہی بے سکون کر دیتی ہو..... کیا نہ آیا کروں میں گھر..... میں ہی چلا جاتا ہوں گھر سے..... تم راضی ہو جاؤ..... بس کسی طرح سے.....“ وہ گرجتے ہوئے گھر سے نکل گئے تھے ام کلثوم بے بسی سے رو دی..... وہ اس کو ہی غلط کہہ گئے تھے اور ام کلثوم حق پر ہوتے ہوئے بھی غلط تھی..... وہ ساری رات گھر نہیں لوٹے تھے ام کلثوم جب رورو کے تھک چکی تو اسے حشمت کے نہ لوٹنے کی پریشانی لاحق ہونے لگی اس کا جی چاہا وہ ان کے پیچھے جائے ان کا پتہ کرے ان کو جا کر ڈھونڈے انہیں منا کر لائے مگر وہ کچھ بھی نہیں کر سکی کیونکہ اسے خبر نہیں تھی کہ وہ اس وقت کہاں تھے..... مگر وہ ٹی ہاؤس میں ہی تھے ساری رات انہوں نے سفید پتھر کی چو کو ر میز پر بیٹھ کر سگریٹ پھونک پھونک کے گزاری تھی..... جب غصہ اترتا تو احساس ہوا کہ وہ غلط کر آئے ہیں مگر وہ ساتھ ہی ایک فیصلہ کر کے اٹھے تھے۔



گھر واپس آتے ہوئے وہ ازالے کے طور پر نان اور پوریاں لائے تھے وہ جانتے تھے ام کلثوم کو ایسا ناشتہ بے

حدمرغوب ہے..... دودھ چائے پتی چینی اور دیگر اشیائے خورد و نوش کا سامان بھی لائے تھے ان کی یہ بیوقوفی تھی کہ انہوں نے گھر پر توجہ دینا ہی چھوڑ دی تھی..... انہوں نے دروازہ کھٹکھٹایا تو دروازے کی دستک پر بے تابی سے کان لگائے ام کلثوم فوراً اٹھی تھی..... حسب توقع حشمت ہی تھے..... اس کی ویران آنکھوں میں پھر سے پانی جمع ہونے لگ گیا وہ درمیان سے ہٹ گئی۔

”کیسی ہو.....“ انہوں نے اس کا ہاتھ تھام کر اس سے پوچھا تو ام کلثوم کی آنکھوں سے آنسو موتیوں کی لڑیوں کی مانند ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرنے لگے تھے انہوں نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے پاس بٹھالیا تھا۔

”ناراض ہے میری جان“ انہوں نے اپنا بازو اس کے کندھوں کے گرد حائل کرتے پوچھا تو ام کلثوم اس التفات پر اور زیادہ بکھر گئی تھی۔

”کیوں سوچ سوچ کر خود کو ہلکان کرتی ہو..... وہ دن دور نہیں جب تم پیسے میں کھیلو گی..... ایک بہترین بگلہ خرید کر تمہارے نام کر دوں گا بہت جلد تمہیں ایک خوشخبری سنانے والا ہوں..... ایک ڈرامہ لکھنے کی آفر ملی ہے ان دنوں..... بہت پیسہ آجائے گا اب اٹھو اور جا کر ناشتہ لے کر آؤ بہت بھوک لگی ہے مجھے.....“ مگر وہ اٹھی نہیں وہیں جمی بیٹھی رہی۔ حشمت زیدی اٹھ کر خود کچن میں گئے اور نکال کر کھانا لائے..... اس روز خود ہی انہوں نے ام کلثوم کو کھانا کھلایا..... وہ برستی آنکھوں سے ان کے ہاتھ سے نوالے منہ میں ڈالتی رہی اور سوچتی رہی۔

”کیا حشمت زیدی کی کبھی گئی ان باتوں کی تکلیف کا ازالہ ان کے اس التفات سے ہو سکتا ہے اس کا دل و دماغ نفی میں شور مچانے لگا تھا اور وہ برستی آنکھوں سے نوالہ چبانے کی کوشش کر رہی تھی مگر ابھی تو آغاز ہوا تھا انجام جانے کب اور کس طرح کا ہونا تھا..... کوئی کیسے جان سکتا تھا“

”چند دن مزید سر کے جب ایک روز حشمت زیدی اس سے کسی کو ملوانے کے لیے لائے تھے ان دنوں انہوں نے اس کا بہت زیادہ خیال رکھا تھا ام کلثوم مطمئن رہنے لگی تھی مگر اس کا اطمینان عارضی ثابت ہوا تھا اس وقت جب وہ وکیل کے ہمراہ اس سے ملنے آئے تھے..... وہ تو اکثر رات گئے گھر لوٹا کرتے تھے ام کلثوم اس روز انہیں سرشام ہی گھر میں دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔“

”دو کپ چائے بنا کر جلدی لے کر آؤ“ انہوں نے آتے ہی آرڈر جاری کیا جس کی تکمیل میں وہ فوراً کچن کی جانب دوڑی تھی جب وہ چائے بنا کرئی اس وقت وکیل کچھ کاغذات پھیلانے اس کی آمد کا منتظر تھا۔

”لو..... ان پر دستخط کر دو.....“ انہوں نے وہی فائل اس کے سامنے کر دی تھی۔

”یہ کیا ہے؟“ اس کی آواز مزید جیسی ہو گئی ذہن و دل میں یکنخت آندھیاں چلنے لگی تھیں۔

”یہ تمہاری بقا کی جنگ ہے تمہارے حق کی لڑائی ہے..... اور یہ جنگ تمہیں لڑنی ہے ام کلثوم اپنا حق لینا ہے“ ام

کلثوم ان کی بات سمجھ نہیں سکی وہ کس کی بات کر رہے ہیں

”میرا حق..... کونسا حق اور کیسی جنگ؟“

”ٹو ما جان..... تم اپنے والدین پر کیس کرو گی اپنے حصے کی جائیداد کے حصول کا“ انہوں نے بے حد نرمی سے اس کے حواسوں پر برم پھوڑا تھا وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھتی رہ گئی۔

”میں وکیل صاحب کو ساتھ اسی لیے لے کر آیا ہوں.....“ سارے کاغذات مکمل ہیں ہم اپنا حق لیں گے۔

”تمہاری ہر خواہش پوری ہوگی..... کوئی آرزو تشنہ نہیں رہے گی“ ام کلثوم کو اس سے ان سے بے حد کراہت محسوس ہوئی تھی وہ خوشبو بھری مہکتی باتیں لکھنے والے کس قدر ذہنی گراؤ کا شکار تھے ان کے جذب سے بھرپور لہجے میں ام کلثوم کو سانپ کی پھنکار محسوس ہو رہی تھی وہ کس قدر خود غرض تھے ابھی کیا کی رہ گئی تھی جو وہ مزید اپنے والدین کو رسوا کرتی..... اس نے تو پہلے ہی انہیں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا تھا اور اب حشمت زیدی انہیں عدالتوں کے چکر میں الجھا رہے تھے اس کا باپ جو اس قدر معزز تھا جس نے ساری زندگی لوگوں کے کیس لڑے تھے ان کے فیصلے کیے تھے اور آج ام کلثوم کا انتخاب ان کو عدالت میں چیلنج کرنے کی بات کر رہا تھا وہ ایک مرتبہ پھر ام کلثوم کی طرف سے انہیں ذلیل و رسوا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پہلی بار ام کلثوم کی محبت کو اپنے انتخاب پر شرمندگی ہوئی اور اڑھد ہوئی..... اس کا سربے ساختہ نفی میں ہلا اور پھر ہلتا چلا گیا۔

”میں ان کاغذات پر ہرگز سائن نہیں کروں گی، اس نقطہ سے انکار کر دیا تھا اپنی اور صرف اپنی عزت کی بہت پرواہ کرنے والے حشمت زیدی کو اس سے بہت سبکی محسوس ہوئی“

”کیا بکواس کر رہی ہو.....“ وہ ہولے سے اس کے کان کے پاس غرائے۔ وکیل کا خیال نہ ہوتا تو شاید گدی سے پکڑ کر نیچے جھکا دیتے۔

”میں..... ان کاغذات..... پر دستخط نہیں کروں گی“ جواباً اس نے ایک مرتبہ پھر ایک ایک لفظ کو چبا چبا کر ادا کرتے کہا تھا۔

”ٹو ما جان..... یہ ہماری بہتری کے لیے ایک اقدام ہے جو میں کر رہا ہوں تمہارے لیے.....“ انہوں نے اچانک ہی پینتر ابدلاتھا جانتے تھے دال ایسے نہیں گلے گی۔

”آپ جو بھی کہیں حشمت..... مگر میں یہ سب نہیں کروں گئی کبھی بھی نہیں“ وہ مڑ کر اندر چلی گئی حشمت زیدی نے لب بھینچ لیے وکیل اٹھ کے ان کے نزدیک آیا۔

”حشمت صاحب..... میں چلتا ہوں آپ نے خواہ مخواہ میں میرا اتنا وقت برباد کیا پہلے بیوی کو تو راضی کر لیتے آپ.....“ تابوت میں آخری کیل وکیل کی بات نے ٹھوٹک دیا تھا وہ جیسے تیسے اسے رخصت کر کے اندر آئے اندر کلثوم بیٹھی اپنے نصیبوں کو کوس رہی تھی۔

”ہاں اب بول منحوس عورت..... ابھی باہر کیا بکواس کر رہی تھی تو.....“ وہ اس کے ان ریشمی لہرے دار بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر چیخے تھے جن کی مسور کن خوشبو کی چاہ میں وہ صفحات کا لے کر دیا کرتے تھے انہوں نے اس کے پھولوں جیسے گال پر تھپڑ کس کر مارا تھا جس کی رعنائی و دلکشی بیان کرتے وہ زمین و آسمان کے قلابے ملا دیا کرتے تھے وہ الفاظ کا سحر نہ بین

تھا اس وقت وہ محبت کا سحر تھا جو ان کی تحریر کو جگمگا دیا کرتا تھا اور خواتین کی اکثریت اپنی اس قدر عزت و تکریم پر اپنے خون سے ستائشی خط لکھا کرتی تھیں اگر وہ اس سے اس ساحر کے منہ سے نکلے آگ اگلے الفاظ سن لیتیں تو شاید اپنے کانوں میں سیسہ انڈیل کر خود کو بہرہ کرنا زیادہ پسند کرتیں اور وہ حشمت زیدی کی تحریریں پڑھنے کی بجائے اپنی آنکھوں کو اندھا کرنے کو زیادہ ترجیح دیتیں۔ وہ اسے مار رہا تھا بے تحاشہ..... بے حد بے حساب..... ام کلثوم کی آنکھوں سے بے بسی کے آنسو گھلے اس کی جینیں حلق میں ہی گھٹ گئی تھیں۔

”بہت زبان درازی کرنے لگی ہے ناں تو..... گدی سے کھینچ لوں گا تیری زبان اگر اب بکواس کی تو“

”میں اپنے باپ کو مزید رسوا نہیں کروں گی..... چاہیں آپ مجھے جان سے مار دیں“ وہ گھٹی گھٹی چیخوں میں بس اتنا ہی بول پائی مگر اس کا اتنا کہنا ہی غضب ہو گیا تھا چار چوٹ کی مار کے ساتھ مغلظات کا طوفان تھا جو حشمت زیدی کے منہ سے اگلا تھا مگر ام کلثوم کی ایک ہی رٹ تھی وہ اپنے باپ کے ساتھ مزید کوئی زیادتی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”جان تو میں تیری نکال دوں گا..... یہ تیری بھول ہے کہ اب کبھی تو واپس اپنوں سے ملے گی، اگر تو یہ چاہتی ہے کہ تیری معافی تلافی ہو جائے تو پھر بھول جا..... تیری ساری کشتیاں میں اپنے ہاتھوں سے جلا دوں گا“ وہ اسے ٹھوکر مار کر نیچے گراتے کہہ رہے تھے۔ ام کلثوم اپنی جگہ ساکت رہ گئی غصے میں وہ اپنے دل کی بات واضح عیاں کر گئے تھے۔

ام کلثوم اپنے انتخاب کو دیکھتی رہ گئی جس باپ کی عزت اس نے محبت کی خاطر اچھالی تھی اسے بھرے بازار میں رسوا کر دیا گیا آج وہی محبت اس کو بچھتانے پر مجبور کر رہی تھی..... اس کے حالات آئندہ آنے والے دنوں میں سلجھنے کی بجائے مزید الجھ گئے تھے..... حشمت زیدی کئی کئی دن گھر نہ لوٹے..... وہ بھوک پیاسی گھر کے کونے کھدرے میں بے حس و حرکت پڑی رہتی دنوں میں وہ مرجھا کر رہ گئی تھی آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں رنگت میں زردی کھند گئی اور جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا تھا وہ سندر رنگت والی نازک اندام ام کلثوم کہیں کھوی گئی تھی محبت نے اس کے شباب کو نگل لیا تھا۔

دروازے پر بہت دیر سے دستک ہو رہی تھی..... ام کلثوم نے اپنی ہمت مجتمع کر کے خود کو اٹھانے کی سعی کی ناگوں میں واضح لرزش اسے کھڑا ہونے نہیں دے رہی تھی وہ تین دن سے بھوک تھی اور حشمت زیدی تین دن سے گھر نہیں لوٹے تھے..... اس نے جا کر دروازہ کھولا تو ٹھنک گئی سامنے علیم الدین کھڑے تھے ام کلثوم نے بے ساختہ دوپٹہ سر پر جما کر دایاں گال چھپایا جس پر نیل پڑا تھا علیم الدین صاحب نے اسے بے حد دکھ سے دیکھا ان کے گھر یلو حالات اور حشمت زیدی کی ظلم کی داستان کسی طور پر بھی ان کی نگاہوں سے مخفی نہیں تھی اور وہ جانتے تھے کہ اس کا سبب کیا چیز ہے..... انہوں نے خاموشی سے شاہراہ ام کلثوم کی جانب بڑھایا۔

”بٹیا..... ایک بات کہیں آپ سے..... وہ جاتے جاتے پلٹ کر آئے تو ام کلثوم نے بے ساختہ سر اثبات میں ہلادیا اور انہیں اندر آنے کا راستہ دیا.....“ وہ براہِ آمدے میں پڑی کرسی پر بیٹھ گئے۔

”حشمت زیدی آج کل کسی نئی عورت کے چکر میں تھے وہ لاہور شہر کی ابھرتی ہوئی شاعرہ تھی جو شاعری کم مگر اپنے تعلقات اور اختیار زیادہ استعمال کرنے کی قائل تھی آج کل اپنے التفات حشمت زیدی پر نچا کر رہی تھی وہ ہر جگہ ان

کے ساتھ جاتی تھی اور ان دونوں کی آپسی بے تکلفی التفات اور دوستانہ تعلقات کسی سے بھی ڈھکے چھپے نہیں تھے..... ٹی ہاؤس میں حشمت زیدی کے خلاف ہونے والی چہ گویاں ان کے کردار کی دھجیاں بکھیر دینے کو کافی ہوتی تھیں سبھی کو معلوم تھا انہوں نے ام کلثوم کے ساتھ شادی کیسے اور کن حالات میں کی تھی سواب اتنی جلدی ان کا پہلی شادی سے دل بھر جانا اور دوسری عورتوں کے چکر میں پڑنا ان کے کردار کو زیب نہیں دیتا تھا ان کی شخصیت کو گرہن لگ رہا تھا مگر انہیں خبر نہیں تھی۔

”کیسے بھائی صاحب! ام کلثوم نے انہیں چپ بیٹھے دیکھ کر استفسار کیا تو وہ گہری سانس بھر کر رہ گئے تھے وہ بھلا اسے کیسے بتاتے کہ جس شخص کی خاطر انہوں نے اپنی ساری کشتیاں جلا دی تھیں اس نے بیچ منجہ دار میں ہی اسے ڈوبنے کو چھوڑ دیا تھا“

”تم بالکل میری بیٹیوں جیسی ہو ام کلثوم..... اور ایک بڑے بھائی اور باپ ہونے کی حیثیت سے میں یہ بات تمہیں سمجھا رہا ہوں..... خود کو اکیلا مت سمجھنا کوئی بھی مسئلہ ہو مجھ سے آ کر کہنا..... اور گھر میں کوئی مسئلہ ہو جائے تو اسے مل بیٹھ کر سلجھا لینا چاہیے..... اسے اپنی انا کا مسئلہ نہیں بنانا چاہیے ورنہ باہری دنیا کے غاصب گھات لگائے اس گھر کی بنیادیں کھوکھلی کرنے کو ہمہ وقت تیار رہتے ہیں ان سے بچاؤ کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے سلجھاؤ مل بیٹھ کر اپنی انا کو بالائے طاق رکھ کر حالات کے سدھار کی کوشش کرنا..... ورنہ گھر ٹوٹ جاتے ہیں تم سمجھ رہی ہونا میری بات، ام کلثوم نے آہستہ سے سر اثبات میں ہلایا مگر بولی کچھ بھی نہیں علیم الدین بھائی اسے کیا سمجھانا چاہ رہے تھے اس کے گھر کو کس سے خدشہ تھا اس کی خوشیوں کا کون غاصب تھا..... سوالات کا ایک ہجوم تھا جو اس کے ذہن میں شور مچا رہا تھا..... اسی شام وہ خود سے ٹی ہاؤس جانے کے ارادے سے تیار ہو کر نکلی تھی اس نے علیم الدین بھائی کی باتوں کا اثر لیا تھا انہیں سمجھا تھا اور اسی لیے وہ حشمت زیدی کو منانے کے لیے جاری تھی..... اسی جگہ جہاں پہلی بار وہ ان سے ملنے گئی تھی جہاں ان دونوں کی محبت کی داستان پروان چڑھی تھی جہاں انہوں نے ایک دوسرے کو جانا تھا جہاں ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائی تھیں“ ام کلثوم کو یقین تھا آج وہیں بیٹھ کر وہ اپنے مسائل حل کر لیں گے..... وہ اپنی محبت کو مرنے نہیں دیں گے وہ اپنی محبت کا مان ٹوٹنے بکھر نہیں دیں گے، اسے اپنے گھر کو بچانا تھا ان تمام غاصبوں سے جو گھات لگا کر بیٹھے تھے..... وہ مرکزی دروازے تک آتے آتے خود سے عہد کر رہی تھی وہ آج حشمت کو منا کر ہی جائے گی وہ جتنا بھی غصہ کر لیں گے وہ انہیں ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ کر بھی ساتھ لے جائے گی وہ انہیں سمجھائے گی کہ وہ بہت تھوڑے میں گزارہ کر سکتی ہے..... وہ خود نوکری کر سکتی ہے..... وہ جیسے تیجے انہیں سمجھا لے گی کہ اسے اپنے والدین سے تعلق نہیں رکھنا اسے ان کی جائیداد سے کوئی لینا دینا نہیں ہے اسے دولت کا کوئی لالچ نہیں ہے اس کے قدم ٹھوکر لگنے سے رکے تھے ام کلثوم نے بے ساختہ دروازہ تمام کر سامنے کا دھندلا منظر دیکھا..... وہ ساکت ہو گئی کا نکات تھم گئی اس کی سانس رک گئی بس وہ مری نہیں تھی سامنے حشمت زیدی بیٹھے والی کھڑکی کے پاس ایک طرح دار لڑکی کو بغل میں لیے بیٹھے تھے شاید وہ اس کا ہاتھ دیکھ رہے تھے اور ادبی سرگوشیاں کر رہے تھے اور جواباً وہ شرم سے سرخ پڑ رہی تھی ام کلثوم کا مان، فخر و غرور آن واحد میں بکھرا..... اس نے اپنی محبت کو کسی اور کے ساتھ محکوم دیکھا..... محبت و پیار کے والہانہ مظاہرہ کرتے دیکھا..... اس کی محبت کبھی یہ سوچ ہی نہیں سکتی تھی کہ حشمت اس سے

بے وفائی کے مرتکب بھی ہو سکتے ہیں ان کی محبت اتنی جلدی نفٹ ایک سال میں اپنی کشش کھو سکتی ہے وہ یوں ایک دوسرے سے صدیوں کے فاصلوں پر بھی جاسکتے ہیں..... ام کلثوم کو وہ ہیں کھڑے کھڑے علیم الدین بھائی کی باتیں سمجھ میں آنے لگیں..... تو کیا وہ جانتے تھے کہ ان کے گھر کو کسی غاصب کا خدشہ تھا اور اس غاصب کو راہ دکھانے والا خود اس کا شوہر ہی تھا..... تکلیف ہی تکلیف تھی بے تحاشہ اذیت وہ اگلے قدموں وہاں سے لوٹ آئی بازار میں چلتے وہ گرتے پڑتے بس جیسے تیسے قدم اٹھا رہی تھی اس کی آنکھوں کے سامنے آنسوؤں کی دھند بڑی تیزی سے تن رہی تھی..... مگر وہ بکھری بکھری دور سے ہی لٹی پٹی نظر آ رہی تھی..... ہاں اسے اعتراف تھا کہ وہ لٹ چکی تھی اسے اس کی محبت کے انتخاب نے آسمان سے زمین پر پٹخ دیا تھا اس کی کشتیاں جل چکی تھیں واپسی کے سارے راستے بند تھے اور خود وہ بھری دنیا میں اکیلی رہ گئی تھی تنہا اور ویران۔

علیم الدین بھائی نے کاؤنٹر کے پیچھے سے اسے مرکزی دروازے سے لوٹنے دیکھ لیا تھا وہ بے ساختہ اس کے پیچھے دوڑے تھے..... انہیں اس کو رکنا تھا اس کی ذہنی حالت مخدوش ہو گئی تھی وہ جانتے تھے کہ محبت کرنے والوں کیلئے بے وفائی کا بار اٹھانا بہت مشکل ہوتا ہے جان لگانی پڑتی ہے مگر چین کی طور کسی پل نہیں پڑتا.....

ام کلثوم پاگلوں کی طرح سیدی سڑک پر چل رہی تھی اس کا دوپٹہ سر سے ڈھلک کر شانے پر اٹک گیا تھا مگر وہ ارد گرد سے بے نیاز کسی غیر مرئی نقطے پر نگاہ جمائے آگے کی جانب بڑھ رہی تھی..... تبھی اچانک سے بہت زور کا چکر آیا تھا اس سے پہلے کہ علیم الدین بھائی اس تک پہنچتے وہ نیچے گر چکی تھی اور اس کے گرتے ہی بے ساختہ آنے والی گاڑی نے بریک لگائی تھی علیم الدین بھائی نے بے ساختہ آنکھوں پر بازو رکھ کر خود کو اس اندوہناک منظر سے نظریں چرانے کی کوشش کی..... اگر بروقت گاڑی کو بریک نہ لگتے تو وہ قطعی نہ بچ پاتی..... وہ شاید کوئی بھلا مانس انسان تھا جو گاڑی سے نکل کر ام کلثوم کو اٹھانے لگا تھا وہ اپنے ڈرائیور کے نکلنے سے بھی پہلے نکلا تھا..... وہ اس شہر کے ہائی کورٹ کے معزز ایڈیشنل جج تھے..... وہ ام کلثوم کے ابا جان تھے..... اور وہ جتنا بھی ناراضگی کا اظہار کرتے مگر ان کا غصہ جھاگ کی طرح سے آن واحد میں بیٹھ گیا تھا ان کا کلیجہ پھٹ گیا تھا اپنی ام کلثوم کو اس حالت میں دیکھ کر..... پورے ایک سال بعد وہ اسے دیکھ رہے تھے اور انہیں خود پر بے تحاشہ غصہ آیا انہیں اپنی لاعلمی پر تاؤ آیا تھا انہوں نے کیوں لا پرواہی کی تھی بچے تو غلطیاں کرتے ہیں والدین کو ہمیشہ ہی اپنا بدل اور ظرف وسیع رکھنا پڑتا ہے پھر وہ تو جانتے تھے شہمت زیدی کی فطرت و اوقات..... انہیں تو در پردہ ہی سہی مگر ام کلثوم کا خیال رکھنا چاہیے کیا خبر کس وقت اسے ان کی ضرورت پڑ جاتی..... اور اس کی مخدوش حالت انہیں احساس دلا رہی تھی وہ کس قدر غلط تھے انہوں نے انجانے میں کتنا ظلم کیا تھا..... سچ ہی کہتے ہیں غصہ عقل کا دشمن ہوتا ہے..... انہوں نے بے ہوش پڑی ام کلثوم کو گاڑی میں اٹھا کر ڈالتے دگر فنی سے سوچا تھا۔ علیم الدین بھائی واپس لوٹ گئے اب انہیں کوئی فکر نہیں تھی ام کلثوم محفوظ ہاتھ میں پہنچ چکی تھی۔



اسے جب ہوش آیا تو وہ ایک انجانے کمرے میں لیٹی تھی..... اس کا ذہن خوابیدہ اور آنکھوں کے پونے قدرے بھاری تھے اس نے آنکھیں کھول کر اس کمرے کی شناخت کرنا چاہی مگر کر نہیں سکی..... تبھی ایک جانا پہچانا روح کو

سرشار کرتا بس اس نے محسوس کیا تھا اس کے بالوں میں کسی مہربان وجود نے انگلیاں پھیریں تھیں اس کے اندر یلکھت سکون کے جھرنے بہنے لگے تھے اس نے خود کو تپتے صحرا سے آن واحد میں نخلستان میں محسوس کیا اس کے اندر سکون اور اطمینان کے سوتے پھوٹ پڑے اس کی آنکھوں سے گرم سیال بہنے لگا اس نے آنکھیں کھول کر بے ساختہ اس مہربان وجود کو دیکھنے کی کوشش کی جس کے لمس کو جس کے احساس کو وہ کروڑوں میں پہچان سکتی تھی جس کے لیے وہ ترس رہی تھی اس نے پوری قوت صرف کر کے آنکھیں کھولیں..... اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے باپ کا حلیم پر شفقت چہرہ تھا..... ام کلثوم کا دل کٹ کٹ کے گرا..... اس کے ابا جان بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھ رہے تھے وہ اس کو دیکھ کر غصہ نہیں تھے بلکہ اس کی حالت پر غمگین تھے ام کلثوم نے بالکل بھی جاننے کی کوشش نہیں کی وہ یہاں کیسے اور کس طرح پہنچی بلکہ وہ اس احساس کو محسوس کرنا چاہتی تھی جس کے لیے وہ بے تاب تھی..... اسے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑی والدین کو کچھ بتانے کی ضرورت کبھی پڑتی بھی نہیں وہ دل کی بات جان جایا کرتے ہیں وہ بچوں کی غلطیاں معاف کر دیا کرتے ہیں جیسے ام کلثوم کی غلطی معاف کر دی گئی تھی جیسے وہ اپنوں میں لوٹ آئی تھی۔

علیم الدین کے بتانے پر حشمت زیدی کو ام کلثوم والے واقعے کی خبر ہوئی تھی..... انہیں ندامت نہیں ہوئی کہ ام کلثوم انہیں اس شاعرہ کے ساتھ دیکھ کر دگر فز ہو گئی ہے بلکہ انہیں علیم الدین پر غصہ تھا انہوں نے بروقت انہیں بتایا کیوں نہیں تھا کہ ام کلثوم سڑک پر بے ہوش ہو کر گری ہے۔

”حد ہے علیم الدین صاحب..... کم از کم آپ کو تو ہماری عزت کی پرواہ کرنی چاہیے تھے“ وہ بھڑکے تھے۔
 ”مجھے کوئی دکھ نہیں اس بات کا..... بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ ام کلثوم بٹیا اب محفوظ ہاتھوں میں پہنچ چکی ہیں انہیں اس وقت اپنوں کی توجہ اور محبت کی ضرورت ہے اور آپ کو جانا چاہیے ان کی خبر گیری کرنے کے لیے.....“
 ”کیسے جاؤں وہاں دوبارہ..... اس کے باپ کو آپ جانتے ہیں ناں کیسا جھک آمیز سلوک وہ کر سکتے ہیں ہمارے ساتھ..... میں وہاں قطعی نہیں جا سکتا انہیں اپنی عزت و انا بہت عزیز تھی ام کلثوم سے کہیں زیادہ“
 ”بٹیا تو ٹوٹ جائیں گی اگر آپ ان کی خبر گیری کے لیے نہ گئے تو.....“
 ”اور جو میری عزت کا جنازہ لٹکے گا اس کا کیا.....“ وہ تن کر کھڑے ہو گئے تھے۔

”تو پھر آپ اطمینان سے بیٹھ کر یہ فیصلہ کر لیجیے کہ آپ کو محبت بچانی ہے یا غیرت“ ہم آپ کے لیے چائے لاتے ہیں..... وہ یہ کہہ کر پلٹ گئے تھے مگر حشمت زیدی کو سوچوں کی یلغار میں گھیر کر..... ام کلثوم کے لیے ان کے دل میں محبت ماند ضرور پڑ گئی تھی مگر مکمل طور پر ختم نہیں ہوئی تھی اور پھر وہ پہلی لڑکی تھی جس نے انہیں متاثر کیا تھا جس پر وہ دل ہارے تھے ورنہ عورتوں کی کمی انہیں کبھی بھی نہیں رہی تھی۔

”کچھ سوچا پھر؟“ علیم الدین چائے لے کر آئے تو انہیں سوچوں میں ہنوز دم دیکھ کر پوچھ بیٹھے۔
 ”ام کلثوم ہمارے دل میں بستی ہے علیم الدین صاحب.....“ مگر وہ انک گئے۔
 ”محبت میں اگر مگر نہیں چلتے حضور..... محبت اگر مگر لیکن لیکن سے مشروط نہیں ہوتی“ علیم الدین ہولے سے

مسکرائے بڑی عجیب بات تھی محبت لکھنے اور تخلیق کرنے والے انسان کو ایک عام انسان محبت کرنا سمجھا رہا تھا۔

”تو پھر شام کو جا رہے ہیں ناں بٹیا کو لینے کے لیے“ وہ مسکرارہے تھے۔ جانتے تھے ناں کہ ان کی لگائی گئی چوٹ پوری ضرب سے پڑی ہے۔ حشمت زیدہ حسب وعدہ شام کو ام کلثوم کو لینے کے لیے گئے تھے..... وہ ڈرائنگ روم میں ام کلثوم کی آمد کے منتظر بیٹھے تھے اور یہ حشمت زیدی کی بد قسمتی تھی کہ ام کلثوم نے باپ کی ہمدردی و توجہ ملتے ہی انہیں ساری حقیقت کہہ سنائی تھی یہ ام کلثوم کی بے وقوفی تھی جو اس نے گھر کا بھرم توڑ دیا تھا کیونکہ بھرم اسی وقت تک قائم رہتے ہیں جب تک باتیں چار دیواری کے اندر رہیں جیسے ہی زبان سے الفاظ نکلیں وہ پرانے ہو جایا کرتے ہیں اور ہر انسان انہیں اپنے مطالب کے معنی پہناتا ہے اپنی سوچ اور فہم کے مطابق..... ام کلثوم نے حشمت زیدی کے خلاف دل میں موجود نفرت میں کمی نہیں بلکہ اپنی سادگی و جذباتیت میں آ کے اضافہ کر دیا تھا..... مسٹر انوار حسین مزید بھڑک گئے تھے۔ اسی لیے جب حشمت زیدی ام کلثوم سے ملنے کیلئے آئے تو انہیں روک دیا گیا تھا۔

”وہ تم سے ملنا نہیں چاہتی.....“ مسٹر انوار حسین نے اسے ڈرائنگ روم میں آ کے بتایا تھا اور وہ جھوٹ نہیں کہہ رہے تھے ام کلثوم ان سے اپنی محبت سے اس سے اس قدر دلگرفتہ تھیں کہ انہوں نے ملنے سے انکار کر دیا تھا جبکہ حشمت زیدی کو شاک لگا تھا انہیں وہ مسٹر انوار حسین کی کوئی چال لگی تھی۔

”میں نہیں مان سکتا کہ وہ ایسا کہہ سکتی ہے وہ بیوی ہے میری“ ان کے لہجے میں مان تھا مسٹر انوار حسین اس کے حد درجہ یقین پر تمسخر سے بنے۔

”اچھا..... اچھا کو لبا استہزائیہ انداز میں کھینچا..... وہی بیوی جو تین دن سے گھر میں فاقے کاٹ رہی تھی اور تم ٹی ہاؤس میں کسی نئی عورت کے زلفوں کے اسیر ہو رہے تھے اور کیا وہی بیوی جس کی دگرگوں حالت اسے سڑک پر گر کر مرنے پر مجبور کر دیتی ہے اور تمہیں پانچ روز کے بعد پتہ چلتا ہے“ وہ حسب عادت اسے بھگو بھگو کر مار رہے تھے ان کا تو بس نہیں چل رہا تھا وہ سامنے کھڑے شخص کا خون کر دیتے۔

”دیکھیے محترم..... یہ ہم میاں بیوی کا آپسی معاملہ ہے..... اسے ہم خود مل بیٹھ کر سلجھالیں گے“ انہوں نے ضبط کا مظاہرہ کیا تھا۔

”ہونہہ..... سلجھالیں گے..... کیا اس کی اس حالت کے بعد بھی تمہیں لگتا ہے کہ معاملات سلجھ جائیں گے.....“ انہوں نے اس پر یہ طنز کا گھونسہ جڑ دیا تھا۔

”چلے جاؤ یہاں سے..... اور آج کے بعد ادھر کا رخ کبھی مت کرنا ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا بھول جاؤ کہ کسی ام کلثوم سے تعلق تھا تمہارا..... کیونکہ اب میں اپنی بیٹی کو اس قید خانے میں کبھی نہیں بھیجوں گا پہلے بھی جو میں کر چکا ہوں تو اس پر ہی بہت شرمندہ ہوں اب مزید کوئی غلطی نہیں دہرا سکتا.....“ حشمت زیدی نے یکنخت ان کا فیصلہ سننے کے بعد کہا تھا۔

”اگر یہ سب کچھ ام کلثوم میرے سامنے کہہ دے تو میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ دوبارہ کبھی ادھر کا رخ نہیں کروں گا اور میں اپنی قسم کا بہت پکا انسان ہوں“ ان کی بلبلائی اناء یکدم ہی انہیں جذباتی کر گئی تھی جو وہ اتنا بڑا دعویٰ کر گئے تھے انہیں

یقین تھا ام کلثوم کی محبت پر اس کے باپ کا دعویٰ غلط ثابت ہونے والا تھا وہ اپنی متوقع فتح کو سوچ کر مسکرائے۔
 ”تمہیں جتنی جائیداد چاہیے میں دینے کو تیار ہوں مگر میری بیٹی کی زندگی سے نکل جاؤ“ انہوں نے اس کی لاپٹی فطرت کے پیش نظر اسے دانہ پھینکا تھا۔

”اس بات کا فیصلہ ام کلثوم کے آنے کے بعد ہوگا..... پہلے اس سے تو پوچھ لیں وہ جانا بھی چاہتی ہے یا نہیں.....“ ام کلثوم کو بلایا گیا مگر وہ نہیں آئی تین بار بلانے پر وہ مجبوراً آئی حشمت زیدی کو اسے دیکھ کر بہت شرمندگی ہوئی تھی وہ دنوں میں ہڈیوں کا ڈانچا بچن گئی تھی رنگت میں ہلکی کھنڈی ہوئی تھی آنکھوں پر گہرے حلقے تھے وہ ام کلثوم نہیں تھی جو کلیوں جیسی شہادت رکھتی تھی حشمت زیدی اس کی طرف بے تابانہ طور پر بڑھے تھے اور بس وہ ایک اضطرابی گئی جس میں زمانہ شناس مسٹر انوار حسین نے وہ دیگر وڈلگرنے فیصلہ کیا تھا انہوں نے سوچا تھا وہ حشمت زیدی کو ام کلثوم کو لے جانے کی اجازت دے دیں گے..... آخر وہ اس کی بیٹی کے شوہر تھے مگر انہیں اندازہ نہیں تھا کہ حشمت زیدی کے نصیب ان کا ساتھ چھوڑ چکے ہیں۔

”کیسی ہوٹو ماجان.....“ وہ بے تابی سے اس کی طرف بڑھے مگر ام کلثوم نے نفرت سے منہ موڑ لیا تھا۔
 ”ٹو ماجان.....“ حشمت زیدی نے محبت کی تمام تر شدتوں سے پکارا جانے کس منہ سے؟

”مرگئی ٹو ما..... اسی روز جس روز اس نے آپ کو کسی اور کے ساتھ محبت کی پیشگیس بڑھاتے دیکھا..... مرگئی اس روز ٹو ما جس دن اس نے اپنی آنکھوں سے محبت کا قتل ہوتے دیکھا تھا“ وہ ہانپنے لگی تھی وہ بہت زیادہ کمزور و لاچار ہو گئی تھی مسٹر انوار حسین خاموشی سے باہر نکل گئے۔

”میری بات تو سنو ٹو ماجان..... تمہیں غلط فہمی“

”نہیں..... مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی کم از کم اس مرتبہ..... آپ جیسا خود غرض سفاک اور لا لاپٹی انسان محبت کے قابل ہی نہیں تھا میں ہی غلط تھی جو سراب کے پیچھے بھاگتی رہی.....“

”تم بچتا وگی ٹو ما..... مجھے کچھ نہ کہنے کا موقع دے کر.....“ انہوں نے اپنی طبیعت کے برعکس قتل کا مظاہرہ کیا تھا جبکہ وہ چیخ پڑی تھی۔

”میں بچھتا رہی ہوں حشمت زیدی..... اور دن میں ہزار بار اس فیصلے پر خود کو کوکتی ہوں جس وقت میں اپنے باپ کی عزت نیلام کرنے آپ کے ساتھ گئی تھی“ وہ جواباً بھنکاری تھی حشمت زیدی کا صبر کا پیرا لبریز ہو گیا ان کا دماغ الٹ گیا۔

”اوہ..... تو اب محبت تمہارے لیے بچھتا و این گئی ہے؟“ ان کے سنجیدہ طنزیہ لہجے کی گہرائی میں کہیں کہیں دکھ کی شدت تھی مگر ام کلثوم جذبات کی رو میں بہتے محسوس نہیں کر پائی تھی۔

”مجھے افسوس ہے کہ آپ کی محبت نے مجھے ایک سال کی رفاقت میں سوائے بچھتاؤں کے اور کچھ نہیں دیا جو میں آپ کو لوٹا سکتی“

”گھر چلو ٹو ماجان..... ہم اپنے مسائل خود حل کر لیں گے“ وہ پھر بھی اس کی طرف بڑھے تھے مگر ام کلثوم مزید چیخ

”گھر..... کونسا گھر..... وہ گھر جس میں سے آپ مجھے ہمہ وقت نکالنے کے درپے رہتے تھے میں نکل آئی آپ کے گھر سے..... اب اس گھر اور آپ پر میرا کوئی حق نہیں..... چلے جائیں یہاں سے.....“

”ٹوٹا..... میں آخری بار کہہ رہا ہوں یہ یاد رکھنا کہ میں دوبارہ کبھی نہیں آؤں گا..... گھر چلو.....“ وہ اناست پسنڈی سے دھمکی دینے والے انداز میں اسے ڈرا رہے تھے۔

”اپنی دھمکیاں اپنے پاس رکھیں مسٹر حشمت زیدی..... جائیں یہاں سے میں دیکھتی ہوں کہ کون ایسی عورت ہوگی جو آپ جیسے دولت کے پجاری خود غرض اور سفاک انسان کے ساتھ گزارہ کرتی ہے جو اس قدر بے حس ہے کہ اسے اپنے علاوہ کوئی نظر ہی نہیں آتا..... جائیں ڈھونڈ لیں پھر کوئی ام کلثوم..... اور تھکیاں کے کوشش کریں اس کی جائیداد..... میں کم از کم اب کسی بہلاوے میں آنے والی نہیں“ وہ روتے روتے چلائی تھی۔ سب کچھ ختم ہو گیا اب، اب کچھ باقی نہیں بچا..... میری محبت کو سوا کر دیا آپ نے..... اور یہ بات میری برداشت سے باہر ہے میں شرکت برداشت نہیں کر سکتی۔

”ٹھیک ہے تو پھر ہوا اپنے اثناء کے خول میں بند اور یاد رکھنا کہ میں دوبارہ نہیں آؤں گا..... میں دولت کا بجاری ہوں یا نہیں مگر تم ضرور ہو جو محبت کا دعویٰ کر کے دولت کے بغیر رہ نہیں پائیں..... وہ حسب عادت سارے قصور اس کے کھاتے میں ڈال کر چلے گئے تھے..... ام کلثوم کو اس قدر امید نہیں تھی کہ وہ یوں اس کو منائے بغیر چلے جائیں گے مگر وہ ہمیشہ ہی اس کے اندازے کے برعکس نکلے تھے ام کلثوم ان کے جانے کے بعد پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی مسز حسینہ اس کی بچکیوں کی آواز سن کر کمرے میں آئی تھیں۔“

”کیا ہوا ام کلثوم..... میری بچی“ وہ بے ساختہ ان سے لپٹ گئی تھی۔

”سب کچھ ختم ہو گیا امی جان..... میرا سب کچھ ختم ہو گیا“ بے ربط انداز میں کہتے وہ ان کی گود میں بے ہوش ہو گئی تھی محبت کے کمالات نے فقط ایک برس کے قلیل وقت میں دونوں فریقین کی ہمت و استقامت کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔ دونوں کی جذباتیت و اناست پسنڈی نے انہیں اس مقام پر کھڑا کر دیا تھا اور ستم بالائے ستم کسی کو بھی احساس نہیں تھا..... محبت کا سفر آغاز سے پہلے ہی انجام کی جانب بڑھ گیا تھا..... قابل افسوس، قابل مذمت۔

☆☆☆

”اب کیا ہوگا“ یہ سوال ایک مرتبہ پھر ام کلثوم کی زندگی کا احاطہ کیے ہوئے تھا اس وقت جب اسے ماں بننے کی خبر ملی تھی..... ایک مرتبہ پھر پورے گھرانے پر مردنی چھا گئی تھی..... ام کلثوم کو جس روز یہ خبر ملی اسے اس کے اندر ایک نئی امید جاگی..... شاید کہ اب حالات درست سمت پر آجائیں..... حشمت زیدی باپ بننے کی خوشی میں سب کچھ بھول کر اپنی زندگی نئے سرے سے شروع کر لیں..... مگر ان کا شاید شاید ہی رہا تھا..... حشمت زیدی کو سبھی نے سمجھا کے دیکھ لیا تھا مگر ان کی ناں ہاں میں نہیں بدلی تھی ان کی اناست نے محبت کو قربان کر دیا تھا۔ خالدہ بی بی، خالق اور علیم الدین بھائی سبھی نے اپنی سی کوشش کر کے دیکھ لی تھی۔

”سب کچھ ختم ہو گیا ہے اب علیم الدین صاحب..... اس کے نزدیک میری کوئی اہمیت نہیں باپ کی دھن و دولت کی ہے..... تو پھر ٹھیک ہے ناں وہ رہے اپنے باپ کے ہمراہ“ ان کے لہجے میں قطعیت تھی۔

”ایسا مت کہیں حضور..... ہمیں پورا یقین ہے اگر ہم ام کلثوم بٹیا کو لینے کے لیے جائیں تو وہ ابھی ہمارے ساتھ آنے پر راضی ہو جائیں گی.....“ ان کے لہجے میں بہت مان تھا۔

”رہنے دیجیے محترم..... جہاں غرض آجائے وہاں محبت کے پرندے کوچ کر جایا کرتے ہیں۔ ام کلثوم اب وہ نہیں رہی جنہیں میں یا آپ جانتے تھے..... وہ اب بہت بدل چکی ہیں..... اور پھر اب میں ان سے کسی بھی قسم کا کوئی تعلق رکھنا ہی نہیں چاہتا..... انہوں نے انکار کر دیا تھا مگر علیم الدین نے ہار نہیں مانی تھی وہ اور خالدہ بی بی صلح کی غرض سے ام کلثوم کے پاس گئے تھے اور انہیں ساتھ چلنے کو کہا تھا۔“

”آپ کا آنا سر آنکھوں پر بھائی..... مگر میں اب اس گھر سے اس طرح نہیں جاسکتی اور پھر اب حالات بھی میرے بس میں نہیں ہیں اب میرے جانے یا جانے کا فیصلہ میرے ابا جان طے کریں گے اور وہ کبھی بھی مجھے نہیں بھیجیں گے اگر حشمت مجھے خود لینے کے لیے نہ آئے تو“ وہ نیم رضا مند تھی ویسے بھی جب سے اس کی کوکھ میں ایک ننھے وجود نے سانس لینا شروع کیا تھا وہ بہت دھیمی ہو گئی تھیں بلکہ سمجھوتے پر راضی بھی ہو گئی تھیں۔۔۔

”ضد مت کریں بٹیا..... آپ جانتی ہیں حشمت خود کتنے ضدی ہیں وہ اگر نہ آئے تو خدا نخواستہ آپ کیا ساری عمر یہیں رہیں گی..... کبھی نہ کبھی تو آپ کو لونٹا ہی ہو گا ناں“

”انہیں ضد زیادہ عزیز ہے یا اپنا گھریا ہونی والا بچہ علیم الدین بھائی..... وہ فیصلہ کر لیں میں تب تک نہیں جاؤں گی جب تک وہ خود لینے کے لیے نہیں آئیں گے“ اتنا کہہ کر وہ اٹھ کر وہاں سے چلی گئی تھی ایک بہت غلط موقع پر وہ ضد کر رہی تھی..... اور ضد کرنے کا انجام عموماً بہت عبرتناک ہوا کرتا ہے۔ دوسری طرف علیم الدین نے حشمت زیدی کو ام کلثوم کو منا کر لانے کے ہزاروں جتن کیے تھے مگر ان کی ناں بھی ہاں میں نہیں بدلی تھی ایک بار ام کلثوم خود علیم الدین کے بارہا منانے پر گھر واپس آئی بھی مگر حشمت زیدی نے اپنانے سے انکار کر دیا تھا..... انہوں نے اسے ایک مرتبہ پھر بے عزت کر کے نکالا تھا اور پردہ اس بے عزتی کا بدلہ یا بدسلوک ام کلثوم نے ان کے ساتھ اپنے گھر پر کیا تھا..... اپنی اپنی انا کے پرچم بلند کرتے سے کسی نے بھی اس بچے کا نہیں سوچا تھا جو ابھی دنیا میں آنے والا تھا.....

حشمت زیدی نے پھر کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا..... انہوں نے میدانِ ادب میں اپنی کامیابیوں کے جھنڈے گاڑ دیے تھے انہوں نے زندگی میں ادب کے حوالے سے بے تحاشہ کام کیا تھا ان کے عورت ذات سے مراسم بھی رہے مگر کوئی بھی ام کلثوم کی جگہ نہیں لے سکی بلکہ انہیں تو عورت ذات سے بے تحاشہ نفرت محسوس کی تھی انہیں عورتوں سے گھن محسوس ہوئی تھی جو اپنے باپ بھائیوں اور شوہروں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ان کیساتھ مراسم رکھتی تھیں..... کچھ وقت سر کا تو ان کے اکیلے پن کے خیال سے خالق بھائی آفاق کو اس کے پاس چھوڑ گئے تھے..... دوسری شادی کے لیے راضی کرتے کرتے ان کی ماں قبر میں جاسوئی تھی دوسرا ہٹ کے احساس کے لیے انہوں نے بھی آفاق کو اپنے ساتھ رکھ لیا تھا..... اس

کی تمام نجی و تعلیمی ضروریات کا خرچہ انہوں نے اٹھالیا تھا..... ایک ہی شہر میں رہنے کے باوجود انہیں پھر کبھی بھی ام کلثوم کی خبر نہیں ملی تھی نہ ہی انہوں نے کبھی جاننے کی کوشش کی تھی۔ سن 2000ء میں جب علیم الدین نے پاک ٹی ہاؤس بند کرنے کا ارادہ کیا تو انہوں نے وہاں جانا ہی چھوڑ دیا..... وہ پاک ٹی ہاؤس جہاں پر ادب کے لوگ بہار کی مانند مسکراتے پھرتے تھے وہ اب ویران ہو گیا تھا بالکل حشمت زیدی کی زندگی اور دل کی طرح.....

ان کی بے جا ضد، ہٹ دھرمی اور انایت پسندی نے انہیں بالکل تنہا کر دیا تھا کاش وہ اس وقت اتنے سفاک نہ بننے تو آج ام کلثوم ان کے ساتھ ہوتی یہ پچھتاوا انہیں دن رات ڈستار ہوتا تھا..... ایک بار علیم الدین بھائی نے اسے بتایا تھا کہ وہ باپ بننے والے ہیں مگر انہوں نے غصے میں آ کر اس اولاد کو اپنانے سے بھی انکار کر دیا تھا..... وہ تنہائی کے عفریت میں گھرے اکثر سوچا کرتے..... جانے ان کا بیٹا ہوا ہو گا یا بیٹی..... اور جانے اب اس کی عمر کتنی ہوگی۔



صبح سے شام ہو گئی تھی وہ دم بخود ایک تک بیٹھے انہیں روتے دیکھ رہی تھی حشمت زیدی کے بوڑھے جھریوں زدہ چہرے پر ان گنت پچھتاوے رقصاں تھے کھلی ہوئی کلی کا چہرہ کھلا گیا تھا.....

”مجھے اعتراف ہے کہ میری بے جا ضد نے میری زندگی کی خوشیوں کو کھالیا..... میں تہی دست و بے اماں ہو گیا..... مجھے میری ضد اور انا نے کہیں کا نہیں چھوڑا..... مجھے اعتراف ہے کہ میں نے ام کلثوم کیساتھ بہیمانہ سلوک روا رکھا اس کی محبت کو خود اسی کے لیے سزا بنا دیا.....“ ان کے جھریوں زدہ چہرے پر آنسو ایک تواتر سے گر رہے تھے کلی ان کے پاس آ بیٹھی ان کے ہاتھ پہ زری سے ہاتھ رکھا۔

”میں بہت بد قسمت انسان ہوں میری تحریروں سے ایک دنیا نے فیض پایا مگر میں خود کو کوئی مفاد حاصل نہیں کر پایا میں نے لوگوں کو محبت کرنا سکھائی مگر مجھے خود کو محبت کرنے کا ڈھنگ کبھی نہ آیا..... میں نے دنیا کو سمجھوتی قربانی اور درگزر کا درس دیا مگر خود اس ڈھب کو کبھی اپنا نہیں پایا..... میں نے زندگی میں کبھی شکر کرنا نہیں سیکھا کبھی خود کو خوش نہیں کر پایا..... بچوں سے بے تحاشہ محبت کرنے کے باوجود میں اپنی اولاد کو کبھی دیکھ اور محسوس نہیں کر پایا..... مجموعی طور پر میں ایک ناکام انسان ہوں جو زندگی میں کسی ایک رشتے کو بھی ڈھنگ سے نبھانے میں ناکام رہا..... میری زندگی میں فقط ایک بات کا سکون ہے کہ میرا ادبی سفر ناکام نہیں رہا زیادہ نہ سہی مگر کچھ نہ کچھ لوگوں نے ضرور میری تحریروں سے اپنی زندگی کی روشن اور واضح راہیں متعین کی ہیں..... ورنہ میرے دامن میں ماسوائے پچھتاؤں اور حسرتوں کے اور کچھ بھی جمع نہیں ہے..... صرف خسارہ ہے اور دکھ ہیں“ وہ بچوں کی مانند پھوٹ پھوٹ کر روتے اعتراف کر رہے تھے کلی ان کا ہاتھ سہلاتی رہی بہت دیر گزر گئی اس نے خود کو فقط ایک سوال پوچھنے کے لیے تیار کیا وہ سوال جو شاید اس کے وہاں آنے کا سبب بنا تھا۔

”سر..... ایک بات تو بتائیں..... کیا آپ کے دل میں کبھی یہ خواہش نہیں جاگی کہ آپ اپنے بچے سے ملیں..... بیٹا ہے یا بیٹی یہ جانیں..... اسے اپنا نام دیں اور کیا آپ کو یہ بھی کبھی نہیں لگا کہ آپ کی اولاد کو آپ کی محبت، شفقت اور نام کی ضرورت بھی ہوگی آپ کی اولاد نے کتنی حسرت زدہ زندگی گزاری ہوگی یا گزار رہی ہوگی..... اس کا معصوم

بچپن کتنی محرومیوں کا شکار رہا ہوگا آپ کو کبھی خیال کیوں نہیں آیا..... آپ نے اور آپ کی بیوی نے صرف اپنی انا اور ضد کا پرچم بلند کیا مگر اپنی اولاد کو کیوں بھول گئے..... آج آپ کو پچھتاوا ہے اپنے کیے پر تو اس کا کیا فائدہ..... کیا آپ کا پچھتاوا ان محرومیوں کا ازالہ کر سکتا ہے..... وہ سراپا سوال بنی ان کے سامنے تن کر کھڑی تھی حشمت زیدی نے لکھتے اسے پہچانا..... اس کی نیلی روئی روئی آنکھیں ان سے سوال کر رہی تھیں“

اس بچی کا وہ معصوم بچپن جب وہ پہروں باپ کو یاد کر کے روتی تھی..... اور اس کی ماں جس نے ساری زندگی اپنی ناکام محبت کا سوگ مناتے بیٹی کی تربیت و پرورش سے پہلو تہی کرتے گزاری جسے زندگی بھر اس بات کا یقین ہی نہیں آیا کہ حشمت زیدی اس کے ساتھ ایسا بھی کر سکتے ہیں کیا مدوا ہے آپ کے پاس اس بچی کے دکھوں کا جو اس نے چھپ چھپ کر روئے اور اپنی ذات کے ساتھ جو خاکیلے بیٹھ کر بانٹے..... وہ زار و زار روتے ان سے سوال نہیں کر کر کھڑی تھی بلکہ وہ ان کے سامنے کھڑی ان کی ہستی ہلا رہی تھی۔

”تو کیا تم..... میری بیٹی ہو.....“ شدت جذبات ہے ان کی آواز پھٹ سی گئی تھی۔

”ہاں..... کلی استہزائیہ ہنسی“ اور آپ کی بیٹی ہونے کی سزا میں نے ہر لمحہ پائی ہے“ اس کے لہجے میں ٹوٹے کاٹج کی چھین تھی درد تھا اذیت تھی۔

”میں سمجھا نہیں.....“ انہیں واقعی میں سمجھ نہیں آئی تھی وہ حیرت میں گھرے تھے۔

”کچھ نہیں..... بس باپ کے کیے کی سزا بیٹی نے تو پائی ہی تھی ناں..... بیٹی نے تو ان محبتوں کا خراج ادا کرنا تھا جن کی قدر آپ نے زندگی میں کبھی نہیں کی.....“ وہ سسکی تھی۔

”بیٹی..... میرے پاس آؤ..... مجھے بتاؤ تمہارے دکھ کیا ہیں“ وہ پدرانہ شفقت سے لبریز لہجے میں بے تابی سے اس کو چھونے کے منتظر تھے وہ اسے پیار کرنا چاہتے تھے وہ ان کے وجود کا حصہ ہے اس بات کا یقین دلانا چاہتے تھے خود کو..... ”مجھے اپنے دکھ کسی سے کہنے کی عادت نہیں ہے سر..... آپ دوا لے لیں..... آپ کی دوا کا وقت ہو گیا ہے.....“ وہ فوراً ہی پیشہ وارانہ انداز میں کہہ کر آگے بڑھنے لگی تھی مگر انہوں نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے روک لیا تھا دونوں باپ بیٹی اب ملکر رو رہے تھے۔

”میں چاہتے ہوئے بھی کبھی آپ سے نفرت نہیں کر سکی..... حتیٰ کہ اس وقت بھی جب اس نے صرف میری محبت کو ماننے سے صرف اس لیے انکار کر دیا کہ میرے باپ کے نام کی جگہ میرے ابا میاں کا نام درج ہے..... ورنہ ہی میں نے کبھی صرف آپ کو قصور وار گردانا ہے میں جانتی ہوں کہ غلطی ماما کی بھی تھی..... انہوں نے ایک غلط وقت پر اپنی ضد کو بڑھا دیا اور باقی کی ساری عمر آپ کی طرح پچھتاوے کی نظر کر دی..... مقام حیرت کہ آپ دونوں کو احساس تو تھا مگر کبھی بھی اس غلطی کا ازالہ کرنے کی کوشش نہیں کی..... دونوں ہی ایک دوسرے کی جانب سے پہل کے منتظر تھے مگر خود قدم نہیں بڑھایا..... آپ کے لیے کیا مشکل تھا ماما کو ڈھونڈنا اور یہ بھی کوئی مشکل تو نہ تھی کہ آپ معلوم کر لیتے کہ آپ کی اولاد کون ہے..... آپ نے تو مڑ کر پورے تیس برس خبر ہی نہ لی۔“

”میں مانتا ہوں میری بچی..... میں خطا کار ہوں، تم ماں بیٹیوں کا..... میں نے ظلم کیا تمہارے ساتھ اور تمہاری ماں کے ساتھ میں گناہ گار ہوں تم لوگوں کا..... وہ اس کا سر تھپتھا کر اعتراف کر رہے تھے میں چاہوں بھی تو بھی اس بات کا ازالہ نہیں کر سکتا۔ ان تمام دکھوں کی اذیت، تپش جو تم نے ان تین برسوں میں سہی، برداشت کی..... مگر میرے پاس اب اور کوئی چارہ نہیں ہے میری بچی میری بد قسمتی کہ میں عمر کے اس دورا ہے پر کھڑا ہوں جب میرے پاس عمر کی نقدی ختم ہو چکی ہے..... وہ پھوٹ پھوٹ کر بچوں کی مانند رو رہے تھے..... کلی بھی رو رہی تھی“

☆☆☆

جس روز ام کلثوم نے بیٹی کو جنم دیا..... انوار حسین کے گھر وہ مرگ کا دن تھا..... کتنی بد قسمتی کی بات تھی ان کی بیٹی نہ مطلقہ تھی نہ بیوہ پھر بھی ان کی بیٹی ان کے گھر پر تھی بغیر کسی حیثیت کے..... وہ ایک بیٹی کی ماں بن چکی تھی..... گزشتہ مہینوں میں انہیں بھی کہیں یہ امید تھی کہ حشمت زیدی صلح کی کوشش ضرور کرے گا اور نہیں تو اپنی اولاد کا سن کر تو ضرور ہی آئے گا مگر ان کی یہ خام خیالی ثابت ہوئی تھی حشمت زیدی نے ان کے ارادوں اور امیدوں کو پوری قوت سے جھٹلایا تھا..... انہوں نے بہت مہارت سے انہیں دنیا والوں کے سامنے رسوا اور بدنام کیا تھا جو سیاہی ام کلثوم نے کورٹ میرج کر کے ان کے چہرے پر پوت دی تھی وہ شاید کبھی نہ کبھی دھل جاتی مگر جو سیاہی اب کی بار حشمت زیدی نے ان کے چہرے پر ملی تھی انہیں دنیا کا کوئی سمندر نہیں دھو سکتا تھا..... انہوں نے خود کو بوڑھا ہونے محسوس نہیں کیا تھا وہ سچ سچ میں بوڑھے ہو گئے تھے انہوں نے اس کے بعد ہر گزرتے دن حشمت زیدی سے نفرت کی تھی وہ اگر چاہتے تو اس کے سارے کس بل چٹکیوں میں نکال سکتے تھے مگر انہیں ام کلثوم کے ترلے اور واسطے یاد آئے تھے جب انہوں نے خلع کی بات کی تھی اور ام کلثوم نے خلع لینے سے انکار کر دیا تھا اس رات وہ ان کے پیروں پر سر رکھ کے روئی تھی اپنی غلطیوں کی معافی مانگتے اس نے بمشکل تمام باپ کو حشمت زیدی کی بیوی رہنے کے لیے راضی کیا تھا..... ارسہ کا وجود بہت بے ضرر اور معصوم تھا مگر انہیں ایک عرصے تک اس کے لیے ان کی نفرت سہنا پڑی کیونکہ اس کی رگوں میں دوڑتا خون خود غرض، سفاک، بے حس اور لالچی حشمت زیدی کا تھا..... مگر ایک روز جب وہ بہت چھوٹی تھی اور وہ پیاس کی شدت سے نڈھال تھے تب اس نے اپنے ننھے منھے ہاتھوں سے انہیں پانی پلایا تھا اور انہیں دیا تھا اس روز ان کے دل پر جمی نفرت ارسہ کے لیے ہمیشہ کے لیے دھل گئی تھی انہیں لگا وہ اس بچی کے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں..... جس کی بد قسمتی کہ اسے کبھی باپ کا پیار نہیں ملا..... ماں نے اپنے کھوکھوں اور غموں میں گھر کر کبھی توجہ نہیں دی..... اس نے اس کی ولدیت کے خانے میں بھی اپنا نام لکھوایا صرف اس لیے کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ اپنے باپ کے بارے میں سوال کرتے کسی محرومی کا شکار ہو..... مگر وہ یہ بھول گئے تھے کہ وہ ارسہ حشمت زیدی تھی جو اپنے باپ کی طرح سے ہی ذہن تھی بہت کم عمری میں ہی وہ ان ساری باتوں اور حقیقتوں کو از حد جان گئی تھی جو اگر وہ بتانا چاہتے تو بہت مشکل میں گھر کر بتا پاتے مگر ارسہ زیدی ذہن تھی اس نے اپنوں کی محبت کو ہمیشہ احسان سمجھا تھا اس نے کبھی بھی انہیں کسی مشکل میں نہیں ڈالا تھا..... وہ ان کی لاڈلی بیٹی تھی جس نے ہمیشہ ہی ان کی لالچ رکھی تھی جس نے کم عمری میں ہی اپنے باپ کی غلطیوں کا ازالہ کرنے کی سعی کی تھی۔ انہیں اس کے دکھ اور محرومیاں ادھ مو کر دیا کرتی تھیں..... اور جب اس نے

فقط ان کی خاطر اپنی زندگی کی واحد خوشی سے دستبرداری حاصل کر لی تھی اس روز وہ تہجد کے وقت خون کے آنسو روئے تھے..... وہ جانتے تھے ارسلہ کے دل کی خوشی وہ لڑکا ہے جس کے لیے وہ وائلن سننا اور بجانا سیکھی تھی مگر وہ اپنے خدشات اور وہمات سے خوفزدہ تھے اب ان میں اتنی ہمت نہیں تھی کی ایک اور ام کلثوم کا دلکہ سہہ پاتے..... انہوں نے ارسلہ زیدی کو فقط دو لفظوں میں سمجھایا تھا اور ان کے لیے مقام حیرت کہ ارسلہ سمجھ گئی تھی ان کی ارسلہ..... ان کی کلی حد سے زیادہ سمجھدار تھی اور محبتوں کو احسان سمجھ کر اتارنے کی کوشش کیا کرتی تھی اس نے ان کا بھر مر رکھ لیا تھا اور اس روز انہوں نے خود سے عہد کیا تھا وہ ارسلہ کو ساری حقیقت بتائیں گے..... وہ خود اسے شہمت زیدی سے متعارف کروانے والے تھے وہ جانتے تھے وہ اب بہت ضعیف ہو چکے ہیں ان کا بلاوا کسی بھی وقت آسکتا ہے سو انہوں نے ارسلہ کو بہت اچھے الفاظ میں اس کے باپ کی خوبیاں بتائی تھیں انہوں نے اپنی بیٹی اور داماد کی زندگی کا تجزیہ بہت غیر جانبداری سے کیا تھا انہوں نے ارسلہ انوار حسین عرف کھلی ہوئی کلی کو اپنے باپ کے پاس ایک کیئر ٹیکر کی حیثیت سے جانے کی اجازت خود دی تھی.....

☆☆☆

”وہ بہت اچھا وائلن بجاتا تھا..... اور اس وقت اور بھی اچھا لگتا جب وہ خاص الخاص میرے لیے بجاتا تھا“، کلی نے چہرے پر زبردستی کی بشارت پیدا کرنے کی کوشش کی کہ شہمت زیدی کو بتایا جو اسے بہت محبت اور توجہ سے سن رہے تھے چونک اٹھے۔

”میں گھنٹوں سانس رو کے اس کا وائلن سن سکتی تھی..... اور وہ بجاتا بھی تھا مگر..... وہ اپنا دلکہ کہتے کہتے انک گئی تھی میری قسمت میں محبت نہیں تھی اس نے مجھے اپنانے سے انکار کر دیا صرف اس لیے کہ میری ولدیت کے خانے میں میرے ابا میاں کا نام درج ہے..... اس نے بہت ظلم کیا ڈیڈی..... اس نے تو محبت کے وجود سے ہی انکار کر دیا..... وہ رونے لگی تھی مگر شہمت زیدی نہیں روئے وہ مسکرا رہے تھے انہیں جیسے بیٹی کے آنسو نظر ہی نہیں آ رہے تھے“

”اگر وہ تمہیں چھوڑ گیا تو تم یہ سوچ کر آرزوہ مت ہو کہ وہ تمہیں چھوڑ گیا بلکہ یہ سوچو کہ وہ تمہارے قابل ہی نہیں تھا..... اور جنہیں محبت کی قدر کرنی نہ آئے انہیں تو انسانیت کے درجے پر فائز ہی نہیں کرنا چاہیے..... مگر ہو سکتا ہے کہ وہ ایک دن لوٹ آئے تمہیں ایسا لگا ہو کہ اس نے تمہیں ٹھکرا دیا ہے ہو سکتا ہے وہ خود کو تمہارے قابل بنانے کی سعی میں جتا ہو،“ انہوں نے اس کے سلکی بالوں میں محبت سے انگلیاں پھیرتے انہیں سہلایا..... کلی کے اندر سکون کے جھرنے بہنا شروع ہو گئے..... کلی نے چونک کے سراٹھایا۔

”آپ ایسا کیسے کہہ سکتے ہیں“ وہ چونک اٹھی وہ مبہم سا مسکرائے۔

”تم نے وراثت میں مجھ سے صرف بدگمانی ہی کیوں لی میرے بچے..... ساری زندگی میں بھی از خود پریشان کن سوچوں میں گھرا بدگمان ہوتا رہا..... کبھی یہ سوچا ہی نہیں کہ میں بھی غلط ہو سکتا ہوں.....“

”میں سمجھی نہیں.....“ وہ واقعی نہیں سمجھی تھی۔

”کیا تم نے اسے کسی وعدے کی زنجیر میں باندھا تھا؟“ انہوں نے سوال کیا تھا

”کیا یہ کام بھی میں نے کرنا تھا.....“ کلی نے بھی سوالیہ انداز اپنایا تھا۔

”محبت میں اناء کو حائل نہیں کرنا چاہیے ورنہ نتیجہ ہمارے حالات جیسا نکلتا ہے“

”مگر میرے ہاتھ تو زادراہ کے طور پر بھی خالی ہی تھے“ کلی سسک اٹھی اسے اپنی اور اس کی آخری ملاقات یاد آئی۔

”کیا خبر وہ بھی یہی سمجھتا ہو“ انہوں نے جیسے اس کی وکالت کی۔

”ابھی تم نے خود ہی بتایا کہ جب تمہارے ابا میاں کو لگا کہ تم بھی ماں والے راستے پر چل نکلی ہو تو انہوں نے تمہیں روک دیا تھا اور تم اس لیے رک گئیں کیونکہ تمہیں اپنے ابا میاں کو دکھی نہیں کرنا تھا تم نے اپنی محبت کو قربان کر دیا اور قربانی کبھی رائیگاں نہیں جاتی بچے..... اس کا صلہ کبھی نہ کبھی ضرور ملا کرتا ہے..... وہ بڑی امید سے جذب کے عالم میں کہہ رہے تھے“

”ہاں..... اس کا صلہ مجھے ملا ہے آپ کی صورت کہ مجھے آپ کی محبت اور توجہ مل گئی ہے..... کلی نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا.....“ وہ مسکرا دیے تھے انہوں نے بھی اسے نہیں بتایا تھا بس انہوں نے ایک فیصلہ کیا تھا اپنی بیٹی کے لیے..... اس کی خوشیوں کے لیے کہ انہیں اپنی بیٹی کی زندگی کی واحد خوشی اسے لوٹانی تھی اسے اس کی محبت سے اسے ملوانا تھا۔ ابھی انہیں اپنے پیارے بھتیجے کو فون کرنا تھا جو جرمنی میں بیٹھا اپنے واپسی کے دن گن رہا تھا..... ابھی چند دن پہلے جب وہ اس سے اسکا پپر بات کر رہے تھے..... کلی نے اسے نہیں دیکھا تھا مگر اس نے اسے دیکھ کر پہچان لیا تھا جب وہ کسی کام سے کمرے میں آئی تھی..... اسکا دھیان اسکا پپر کی طرف نہیں گیا تھا ورنہ وہ بھی آفاق کو پہچان جاتی..... آفاق نے ساری کہانی انہیں بتادی تھی حشمت زیدی کو حیرت ہوئی تھی انہیں آفاق سے ایسی امید نہیں تھی کہ وہ کسی لڑکی کو اتنا آگے لے جا کر انتظار یا اظہار کی کسی بھی ڈور یا وعدے میں باندھے بغیر چھوڑ بھی سکتا ہے..... انہوں نے اسے ڈانٹا بھی تھا مگر جو کچھ اس نے کہا وہ انہیں منجمد کر گیا تھا۔

”میں محبت پر یقین نہیں رکھتا چچا جان..... محبت ہمیں سوائے دکھوں کے اور کچھ بھی نہیں دیا کرتی..... اور میں اسے ایسے عہد کے کسی ڈور میں نہیں باندھنا چاہتا تھا جس سے بندھ کے وہ مجھ سے توقعات وابستہ کر لیتی جنہیں میں پوری نہ کر پاتا..... تو نا کام زندگی گزارنے سے بہتر تھا کہ میں محبت سے دستبرداری قبول کر لیتا..... مجھے جو صحیح لگا میں نے وہ کر دیا..... میں آپ والی غلطی نہیں دہرانا چاہتا تھا میں محبت نہیں کرنا چاہتا تھا“ وہ رنجیدہ ہوا تھا حشمت زیدی بول نہیں سکے..... وہ اس کے احتساب کا دن تھا انہیں ساری رات نیند نہیں آ سکی ان کی غلطیاں خسارے پہنچتا دے اور نا کامیاں اس قدر زیادہ تھیں کہ اب ان کے بچے محبت کرنے سے ڈرنے لگے تھے..... وہ کس قدر خراں نصیب تھے کہ یادداشتہ طور پر اپنے بچوں کی خوشیوں کے بھی قائل تھے..... مگر اب انہوں نے ازالہ کرنا تھا انہیں آفاق کو واپس بلانا تھا ایک چچا کی حیثیت سے نہیں ایک باپ کی حیثیت سے..... انہیں اب انوار حسین کے گھر جانا تھا اپنی غلطیوں کی معافی مانگنے کیلئے“ انہوں نے سوچ لیا تھا اب انہیں اپنی اناء کو درمیان میں نہیں لانا تھا انہوں نے ہاتھ جوڑ کر ابا میاں اور ام کلثوم سے معافی مانگی تھی ان کی غلطیاں بہت تھیں مگر وہ جانتے تھے کہ ام کلثوم کی محبت کا ظرف اس سے بھی زیادہ بڑا ہے وہ انہیں معاف کر دے گی..... اور اگر اس نے

انہیں معاف نہ بھی کیا تب بھی انہیں برا نہیں لگے گا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ام کلثوم حق بجانب ہوگی انہوں نے اس کی زندگی کے تیس برس ضائع کیے تھے انہیں گرجا بن لگا دیا تھا یہ ایک دن کی معافی تلافی کا کام نہیں تھا وہ اگلے تیس چوبیس برس مزید ان کی نفرت سہتے تو بھی ان کی معافی تلافی ممکن نہیں تھی ہاں مگر انہوں نے سوچ لیا تھا وہ آفاق اور ارسہ کی محبت کے لیے اب کی بار کچھ بھی کر جائیں گے کم از کم وہ اپنے بچوں کے لبوں پر سسکیاں اور آہیں ہمیشہ کیلئے نہیں جمائیں گے..... وہ آہوں اور سسکیوں کو ان کی زندگی کا حصہ نہیں بننے دیں گے اور کائنات کا نظام کو ممکنات اور ناممکنات پر ہی چلتا ہے.....

”کیا خبر..... کیا معلوم ام کلثوم مان ہی جائیں..... اور عمر کی بقیہ نقدی وہ ایک ساتھ بتائیں اور چاہے ام کلثوم صرف اور صرف نفرت ہی جتائیں مگر وہ سہہ لیں گے..... وہ معافی اور صرف معافی ہی مانگیں گے..... ام کلثوم معاف نہ بھی کرے تو بھی وہ بقیہ کی زندگی معافی مانگتے رہیں گے..... ان کے لیے یہ احساس ہی باعث اطمینان تھا کہ زندگی انہیں معافی کی مہلت دے رہی ہے“



”تمہیں یہ کیوں اور کب لگا کہ میں نے تمہاری محبت کو اس لیے ٹھکرایا کیونکہ تمہارے ولدیت کے خانے میں تمہارے ابا میا کا نام درج ہے“ وہ بالکل اچانک ہی اس کے سامنے آیا تھا۔ کلی نے اسے حیرت سے دیکھا تھا تو کیا وہ اسے ڈھونڈتے ہوئے وہاں تک آیا تھا..... اسے سمجھ نہیں آئی تھی۔

”تو اور کیا سمجھتی تھی وہ آخری سچائی تھی جو چمچڑنے سے دو روز پہلے میں نے تمہیں بتائی تھی“ اس نے بھی برملا اعتراف کیا تھا شمت زیدی نے ٹھیک ہی کہا تھا اس نے ورٹے میں ان سے صرف بدگمانی ہی بتائی تھی۔

”واہ..... اور آپ جناب اتنی سمجھدار ہیں کہ پوچھے بغیر ہی جدا ہونے کا فیصلہ کر بیٹھیں..... اذیت میں تو میں رہا بے اعتنائی کا شکار تو میں ہوا پریشانی تو میرے حصے میں آئی جب تم بغیر بتائے کیسپس آنا چھوڑ گئی تھیں..... وہ پانچ سال بعد اس کے سامنے کھڑا اپنے دکھ جبکہ رہا تھا کلی کی نیلی آنکھوں کے آگے سمندر کا پانی تن گیا..... وہ دن پوری جزئیات سے یاد آ گیا تھا جب اس نے محبت کے وجود سے انکار کر دیا تھا..... اس کی محبت کی کہانی کو اظہار کی زبان ملنے سے پہلے ہی ختم ہونا پڑا تھا اس اذیت میں وہ بھی پچھلے پانچ برس سے مقید تھی“

”تو جانے سے پہلے کچھ تو کہا ہوتا..... کوئی بھی ایسی بات جس سے میں خوش امیدی کا دامن تھامے رکھ سکتی“ اس کی نیلی آنکھوں میں درد تھا لہجہ بھرا ہوا..... آفاق درد سے ہنسا۔

”آیا تو تھا..... کچھ لے کر تمہارے لیے مگر تم کیسپس آنا چھوڑ چکی تھیں میں تین بار وہاں گیا مگر تم نہیں آئی دسویں روز تو میری فلائٹ تھی میں جرمنی چلا گیا تھا ہاں مگر اب لوٹ آیا ہوں کلی کو اچھے سے یاد تھا وہ جان بوجھ کر تب تک کیسپس نہیں گئی تھی جب تک اسے اس کے چلے جانے کا یقین نہیں ہو گیا تھا۔“

”میں اس روز تمہیں پر پوز کرنے گیا تھا مجھے اس بات سے کبھی فرق نہیں پڑتا تھا کہ تم کون ہو یا تمہارے باپ کون تھے..... میرے لیے اہم تمہاری ذات اور تمہاری ذات سے وابستہ دکھ اور خوشیاں تھیں..... میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتا

تھا میں تمہیں کہنا چاہتا تھا کہ میں خود کو تمہارے قابل بنانے کے لیے باہر جا رہا ہوں تاکہ جس وقت میں لوٹوں..... مجھے تمہارے والدین انکار نہ کر سکیں اور میں تمہیں بہترین معیار زندگی دینا چاہتا تھا میں حشمت چچا کی طرح اپنی محبت کو غم میں پڑ کے رسوا نہیں کرنا چاہتا تھا..... ارے..... وہ دو قدم اس کے قریب بڑھ آیا“

”محبت ایک بہت خوبصورت جذبہ ہے اس کی قدر نہ کی جائے تو یہ مرجھنے لگتا ہے..... اور میں نہیں چاہتا کہ ہماری محبت مرجھائے یا وقت کی گرد پڑنے سے یہ دھندلا جائے ہم ایک دوسرے سے زندگی کی آخری سانسوں تک پیار کریں اپنی محبت کو نبھائیں ہمیں یہ عہد کر کے اپنی زندگی کی شروعات کرنی ہیں ایک دوسرے کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش کرنی ہے“ وہ اس کا ہاتھ تھام رہا تھا اور وہ بالکل خاموش تھی..... محبت کسی ایک فریق کے نبھانے کا نام نہیں ہے اسے دونوں فریقین کی باہمی رضا مندی سے گزارنا چاہیے..... یہ دیکھو یہ میں نے تمہارے لیے لیا تھا..... اس نے جب سے ایک محلی کیس نکالا تھا..... کلی نے حیرت سے دیکھا وہ لاکٹ چین تھا چ..... جس پر Till death do us Part کے الفاظ کندہ تھے اس نے دھیرے سے ہاتھ بڑھا کے وہ لاکٹ تھام لیا اسے ان الفاظ میں زندگی سانس لیتی محسوس ہوئی تھی کس قدر خوبصورت منظر تھا دو محبت کرنے والوں کا ملن ہو رہا تھا..... نیلی آنکھوں میں محبت کا خمار اترنے لگا۔ آفاق نے مسکرا کر ان آنکھوں کی روشنی دیکھی ایسا لگتا تھا نیلے کانچ کے سمندر میں کشتی کا بادیاں پھر پھر اڑ رہا ہوا اس نے اس کی لرزتی پلوں کو دیکھتے ہوئے سوچا.....

”ویسے تم نے میرے چچا کی خدمت بہت کی..... تمہارا بہت بہت شکریہ“ وہ اس کا ہاتھ کرا سے اپنے ساتھ لے جا رہا تھا کلی نے نہیں پوچھا وہ اسے کہاں لے جا رہا ہے۔

”میں نے اپنے باپ کی خدمت کی ہے تمہارے چچا کی نہیں اور اگر مجھے خبر ہوتی کہ یہ تمہارے چچا ہیں تو..... اس نے لبوں کو یکدم ہی بریک لگا لیا تھا“ آفاق نے اسے بولنے پر اکسایا۔

”ہاں ہاں بولو..... بولو خاموش کیوں ہو گئی ہو..... تو کیا تم پھر سرسرو ہونے کی حیثیت سے دہری خدمت کرتی چچا جان کی..... ہے ناں“ وہ شرارت سے اسے چھیڑ رہا تھا۔ کلی کا سر شرم سے جھک گیا۔

”اچھا اب جلدی سے بتاؤ..... کب بھیجوں اپنے چچا جان کو..... تمہاری ماما سے تمہارا ہاتھ مانگنے کو.....“ وہ جان بوجھ کر چھیڑ رہا تھا۔

”اس کا فیصلہ تو ڈیڈی ہی کریں گے..... ویسے وہ کل ابامیاں سے ملنے گئے تھے بلکہ وہ اب بھی جاتے ہیں اب تو.....“ آفاق نے جیسے سمجھ کر سر ہلایا۔

”ہاں انہیں جانا بھی چاہیے..... آخر کو ام کلثوم چچی کا حق بنتا ہے کہ انہیں منایا جائے ویسے میں نے سوچ رکھا ہے کہ میں تمہیں روٹھنے ہی نہیں دیا کروں گا وہ پھر پٹری سے اتر تھا۔“

”تم اس مار سے ڈرتے ہونا..... جو تمہیں ڈیڈی سے پڑے گی، مجھ سے لڑائی کی صورت میں“ وہ مزے سے

بولی تھی۔

”جی نہیں..... میں ان آنسوؤں سے ڈرتا ہوں جو مجھ سے ناراضی کے بعد تمہاری آنکھوں میں جمع ہوں گے.....“ وہ اظہارِ محبت کر رہا تھا کلی چلتے چلتے رک گئی۔

”آفاق..... مجھ سے وعدہ کرو..... محبت کو میرے لیے پچھتاوا نہیں بناؤ گے..... مجھے بہت ڈر لگتا ہے مجھے ام کلثوم نہیں بننا.....“ آفاق مسکرا دیا تھا اس نے جواب نہیں دیا تھا بلکہ اس کے اور اپنے پسندیدہ گانے کے چند مصرعے گنگنائے تھے۔

When Snow will fall on winter nights
I will keep you warm inside yeah baby I will
All though your life I will be by ur side
Till death do us part
My love will never end
Till death do us part

اس کے بعد اس نے واکمن بجانا شروع کیا تھا وہی واکمن جو کلی سانس روکے سنتی تھی وہ کلی تھی وہ کھلی ہوئی خوشبودار کلی تھی محبت جس کے انگ انگ سے مترنم تھی..... انہوں نے عہد لیا تھا ایک دوسرے سے..... اب کی بار انہیں محبت کو سرخرو کرنا تھا انہیں بڑوں کی غلطی نہیں دہرائی تھی محبت کو انا، ضد اور ہٹ دھرمی کی بھینٹ نہیں چڑھنے دینا تھا..... بھلے عمر کی ریاضت کے بعد یہ سہی مگر سب کچھ ٹھیک رہا تھا اور جو نہیں ہوا تھا کلی کو امید تھی وہ بھی ہو جائے گا..... ہاں اسے دکھ تھا اس کے والدین نے اپنی اپنی انا کے خول میں مقید ہو کے اپنی عمر رائیگاں گزار دی تھی..... اسے اپنی ماں کی تہائی ڈپریشن دکھ دیتا تھا اور اب سب جاننے کے بعد حشمت زیدی کے پچھتاوے خسارے اور روڈنی اذیت تکلیف دیتی تھی..... یہ ان دونوں کی بد قسمتی کہ ایک دوسرے سے جدا ہونے کے بعد وہ ایک مگر پور صحت مند زندگی گزار نہیں پائے تھے..... دونوں ہی محبت کے حصار سے نکلنے میں ناکام رہے تھے۔ ایک عالم کو محبت کا درس دینے والے حشمت زیدی کا دامن ہمیشہ محبت سے خالی رہا نہ انہیں محبت کرنی آئی نہ ہی محبت کو سنبھالنا..... قدر کرنا تو دور کی بات..... ٹھہری۔

اس کی ماں نے اپنے جذبات کے ہاتھوں ہمیشہ خسارے کا سودا اکیلا مگر محبت کا خسارہ ان کے لیے جان بلب ثابت ہوا کم از کم انہیں اس بات پر سمجھوتہ ساری زندگی کرنا نہ آ سکا کہ محبت ان کے نصیب میں نہیں تھی..... کلی اپنے والدین کے دکھ میں اپنی محرومیاں بھول گئی انہیں ان پر ترس آتا وہ محبت کے مارے نہیں انا کے مارے لوگ تھے۔

اور انا، رشتوں کو کھوکھلا کر دیتی ہے مندر رشتوں کو بھر برا کرتی ہے اور ہٹ دھرمی انسانوں کو مار دیتی ہے..... حشمت زیدی اور ام کلثوم اب عمر کے اس حصے میں نہیں تھے کہ اپنی اپنی غلطی کا کفارہ ادا کر سکتے ہاں مگر کلی کو پھر بھی امید تھی کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا اور یہ گمان کچھ غلط بھی نہیں تھا۔